شکستِ آرزو

جب پاکستان دولخت ہوا

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین

سابق وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی اور راج شاہی یونیورسٹی

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

THE WASTES OF TIME

Reflections on the Decline and Fall of East Pakistan

شکستِ آرزو

جب پاکستان دولخت ہوا

پروفیسر ڈاکٹر سیّد سجاد حسین

سابق وائس چانسلر

ڈھاکا یونیورسٹی و راج شاہی یونیورسٹی

ترجمہ: محمد ابراہیم خان

نظرثانی: احمد جمال اعجازی

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ!

کتاب: شکستِ آرزو (جب پاکستان دولخت ہوا)
(THE WASTES OF TIME)

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر سیّد سجاد حسین

ترجمہ و تہذیب: محمد ابراہیم خان ۔ احمد جمال اعجازی

ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی
(ادارہ معارف اسلامی۔کراچی)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com
ویب گاہ: www.irak.pk

اسٹاکسٹ: اکیڈمی بک سینٹر
ڈی۔۳۵ بلاک۔۵ فیڈرل بی ایریا
کراچی۔۷۵۹۵۰ پاکستان
فون:۳۶۳۴۹۸۴۰۔۳۶۸۰۹۲۰۱(۰۲۱)

اشاعتِ اوّل: ذوالحج ۱۴۳۳ھ ۔ اکتوبر ۲۰۱۲ء
اشاعتِ ثانی: محرم/صفر ۱۴۳۴ھ ۔ دسمبر ۲۰۱۲ء
اشاعتِ ثالث: جمادی الاوّل ۱۴۳۴ھ ۔ مارچ ۲۰۱۳ء

قیمت: ۵۰۰ روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

اُن لاکھوں شہیدوں کے نام،
جن کا اَنمول خون
تحریکِ پاکستان کے مختلف مراحل میں
گنگا جل کی طرح بہایا گیا..!

اور

اُن لاکھوں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بچوں،
جوانوں اور بزرگوں کے نام بھی،
جو پاکستان سے وفائے عہد کے جُرم میں پیوندِ خاک کر دیے گئے
اور جن کا خون، باقی ماندہ پاکستان میں بھی اجنبی، بلکہ لاوارث ٹھیرا......!!

نہ مدعی، نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ ''پاک نشیناں'' تھا، رزقِ خاک ہوا

ناشر

فہرست

گزارشات	از: سیّد شاہد ہاشمی	۹
پیش لفظ	از: مصنف	۱۳
پسِ پیش لفظ	ایضاً	۱۷
پہلا باب:	میں ۲۰ دسمبر کو موت کے منہ سے کیسے نکلا؟	۲۳
دوسرا باب:	جب میں تباہ حال گھر واپس آیا....	۳۳
تیسرا باب:	چاروں طرف بغاوت اور انتشار	۴۵
چوتھا باب:	جہنم کے قلب میں!	۵۷
پانچواں باب:	محض بھیڑ کو مجلس قرار نہیں دیا جاسکتا!	۷۳
چھٹا باب:	مشرقی پاکستان کے آخری گورنر کے ساتھ کچھ ایامِ اَسیری	۸۵
ساتواں باب:	خواجہ خیرالدین اور احسن منزل	۹۵
آٹھواں باب:	حالات کی خرابی نے سب کو اللہ سے قریب کردیا!	۱۰۵
نواں باب:	سازش کا بیج	۱۲۱
دسواں باب:	علیحدہ وطن کا مطالبہ	۱۴۵
گیارہواں باب:	میرے آغاز میں میرا انجام پوشیدہ ہے!	۱۵۹
بارہواں باب:	تقسیم ہند کا نظریہ	۱۶۷
تیرہواں باب:	کلکتہ کے ساتھی اور شب وروز	۱۸۱
چودہواں باب:	پاکستان ایک نظریاتی تصور	۱۸۹
پندرہواں باب:	قیامِ پاکستان کے اسباب	۲۰۵

سولہواں باب: وہ صبح ایک نعمت تھی جس میں ہم زندہ تھے! ۲۱۱
سترہواں باب: بدبودار پھول، جھاڑ جھنکار سے بھی زیادہ خراب ہوتا ہے! ۲۲۱
اٹھارہواں باب: بنگلہ زبان تحریک۔۔۔بگاڑ کا نقطۂ آغاز ۲۳۵
انیسواں باب: لسانی تحریک۔ یادگار کی تعمیر ۲۴۳
بیسواں باب: سیاست اور ثقافت پر حملہ ۲۵۳
Epilogue- A Prayer ۲۶۷

ضمیمہ جات

ضمیمہ اول: قرارداد لاہور ۲۷۰
ضمیمہ دوم: کرپس مشن کی پیشکش ۲۷۱
ضمیمہ سوم: قراردادِ دہلی ۱۹۴۶ء ۲۷۵
ضمیمہ چہارم: کیبنٹ مشن پلان ۲۷۸
ضمیمہ پنجم: تاجِ برطانیہ کا فرمان ۲۷۹
ضمیمہ ششم: ۳ جون ۱۹۴۷ء کا منصوبۂ تقسیم ہند ۲۸۱
ضمیمہ ہفتم: قانون آزادئ ہند ۱۹۴۷ء ۲۸۸
ضمیمہ ہشتم: ڈھاکا میں قائداعظم کی تقریر ۲۹۱
ضمیمہ نہم: صدر ایوب خان کے نام حسین شہید سہروردی کا جیل سے مکتوب ۲۹۵
ضمیمہ دہم: بھارت بنگلہ دیش معاہدہ برائے تعاون، دوستی اور امن ۳۰۷
ضمیمہ یازدہم: مسلم قوم پرستی بمقابلہ بنگالی قوم پرستی۔ بنگلہ دیش کی تاریخ کی تعبیر ۳۱۱
ضمیمہ دوازدہم: بنگلہ دیش اور پاکستان....حال اور مستقبل ۳۲۵
کچھ مصنف کے بارے میں ۳۴۷

یہ چمن مجھ کو آدھا گوارا نہیں!

مشیر کاظمی (مرحوم)

پھول لے کر گیا، آیا روتا ہوا، بات ایسی ہے کہنے کا یارا نہیں
قبرِ اقبالؔ سے آ رہی تھی صدا، یہ چمن مجھ کو آدھا گوارا نہیں!

شہرِ ماتم تھا اقبال کا مقبرہ، تھے عدم کے مسافر بھی آئے ہوئے
خوں میں لت پت کھڑے تھے لیاقتؔ علی، روحِ قائدؔ بھی سر کو جھکائے ہوئے
کہہ رہے تھے سبھی، کیا غضب ہوگیا، یہ تصور تو ہرگز ہمارا نہیں!

قبر پہ سرنگوں تھا منارِ وطن، کہہ رہا تھا کہ اے تاج دارِ وطن
آج کے نوجواں کو بھلا کیا خبر، کیسے قائم ہوا یہ حصارِ وطن
جس کی خاطر کٹے قوم کے مرد و زن، اُن کی تصویر ہے یہ منارہ نہیں!

کچھ اسیرانِ گلشن تھے حاضر وہاں، کچھ سیاسی مہاشے بھی موجود تھے
چاندتارے کے پرچم میں لپٹے ہوئے، چاندتاروں کے لاشے بھی موجود تھے
میرا ہنسنا تو پہلے ہی اک جرم تھا، میرا رونا بھی ان کو گوارا نہیں!

کیا فسانہ کہوں ماضی و حال کا، شیر تھا میں بھی اک ارضِ بنگال کا
شرق سے غرب تک میری پرواز تھی، ایک شاہیں تھا میں، ذہنِ اقبالؔ کا
ایک بازو پہ اُڑتا ہوں میں آج کل، دوسرا دشمنوں کو گوارا نہیں!

یوں تو ہونے کو گھر ہے، سلامت رہے، کھینچ دی گھر میں دیوار اغیار نے
ایک تھے جو کبھی، آج دو ہوگئے، ٹکڑے کر ڈالے دشمن کی تلوار نے
دھڑ بھی دو ہوگئے در بھی دو ہوگئے، جیسے کوئی بھی رشتہ ہمارا نہیں
قبرِ اقبالؔ سے آ رہی تھی صدا، یہ چمن مجھ کو آدھا گوارا نہیں!

گزارشات

سابق مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کی، اور موجودہ بنگلہ دیش کے قیام اور اس کے فوراً بعد کی تاریخ کبھی اِس طرح نہیں لکھی جاسکے گی کہ تمام متعلق فریقوں کو اُس سے اتفاق ہو۔ یوں تو اجتماعی زندگی کے ہر اہم اور حساس معاملہ میں ایسا ہی ہوتا ہے، مگر مشرقی پاکستان کو پاکستان سے کاٹ ڈالنے کے عمل جیسا خونیں باب، اِس طرح بیان کرنا کہ پاکستان سے وفاداری نبھانے والوں اور اس سے بے وفائی کرنے والوں کا موٓقف یکساں طور پر سمولیا جائے، تقریباً ناممکن ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ معاملات کو اپنے اپنے انداز میں دیکھنے والے تمام مکاتبِ فکر کی بات (متوازن نہ سہی) متوازی طور پر ہی تحریر میں آجاتی، ریکارڈ کا حصہ بن جاتی۔ جہاں عوامی لیگ اور مکتی باہنی والوں اور اُن کے ہمدردوں کا موقف ریکارڈ پر آتا تو وہیں قائداعظم کے پاکستان اور اس کے جانثاروں پر بیتی داستان اور ان کا نقطۂ نظر بھی کتابِ تاریخ، کالموں، نصابیات اور حوالوں کا حصہ بنتا۔

لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مشرقی پاکستان پر بھارتی حملہ وقبضہ کی مزاحمت کرنے والوں کی تاریخ کا آج کوئی والی و وارث اور کوئی وکیل و مدعی موجود نہیں۔ لہٰذا پاکستان سے عہدِ وفا نبھانے والے، ایک طرف بنگلہ دیش میں 'غدّار و باغی، تخریب کار و قاتل اور جنگی مجرم' وغیرہ قرار دیے جارہے ہیں تو دوسری طرف موجودہ پاکستان (پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین ذوالفقارعلی بھٹو مرحوم کی اصطلاح میں ''نئے پاکستان'') میں غیر واجنبی اور نکو بن کر رہ گئے ہیں۔ خود پاکستانی اخباری کالموں اور نصابی کتابوں میں وہ ''فوجی گٹھ جوڑ میں شامل، مشرقی بازو کی رائے عامہ کا احترام نہ کرنے والے اور بنگالیوں کے قاتل'' جیسی گالیاں کھا رہے ہیں۔ اُدھر بنگلہ دیش کا تعلیمی نصاب، پاکستان سے نفرت انگیزی اور قیامِ بنگلہ دیش کے سانحات کی مبالغہ آمیز تصویر کشی کا مرکب ہے۔ تو اِدھر بھٹو کے ''نئے پاکستان'' میں ساری ملی تاریخ اور تعلیمی نصاب کو (مغربی استعمار کی فراہم کردہ مالی اور دانشورانہ امداد کے زور پر) ''نفرت انگیز'' مواد سے ''پاک'' کیا جارہا ہے۔

بنگلہ دیش میں عوامی لیگ اور بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' (RAW) کی سرپرستی میں قائم این جی اوز، باہم مل کر برادر بنگلہ دیشی عوام اور خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کا ذہن پاکستان کے حوالے سے زہر آلود کر رہے ہیں۔ (پاکستانی این جی اوز کا اُن سے ''مقصدی تعلق'' اور ''فدویانہ تعاون'' قرب واپنائیت کا جو رنگ لیے ہوئے ہے، وہ خود غور وفکر اور گفتگو کا الگ عنوان ہے۔)

مشرقی پاکستان، (بھارتی قبضہ تک، بلکہ اس کے مہینوں بعد بھی) اقوام متحدہ کے ایک باقاعدہ ممبر اور آزاد و خود مختار ملک، پاکستان کا عالمی طور پر تسلیم شدہ حصہ تھا۔ اس کو چھین لینے اور پاکستان سے کاٹ ڈالنے کی غیر ملکی کوششوں کی مزاحمت، دنیا کے کسی قانون میں جرم نہیں کہلاسکتی۔ بلکہ پاکستان کے تحفظ وبقا کی اُس ہاری ہوئی جنگ میں اپنی اور خاندان کی زندگی اور مستقبل سے بے پرواہو کر کود پڑنے والے لوگ بلاشبہ لائقِ داد تھے، لائقِ داد ہیں۔ ایسا کرنے والے لاکھوں غیر بنگالی تو خیر تھے ہی، کئی ملین بنگلہ بولنے والے محبانِ ملک وملت بھی اُن میں شامل تھے۔ انھوں نے ابتدا ہی میں، بھارت کی چھپی امداد و سازش اور کھلی مداخلت و جارحیت کے نتیجہ میں بننے والے ''محصور'' ملک کا مستقبل، غیر محفوظ اور برہمن سامراج کے ہاتھوں یرغمال ہوتا ہوا دیکھ لیا تھا اور اس برے دن سے بچنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ یقیناً وہ لوگ برسرِ زمین ناکام رہے۔ مگر ان کے خدشات اور مخدوش مستقبل کے امکانات، بھیانک حقیقت بن کر سامنے آتے جارہے ہیں۔

بھارت کے محاصرے میں جکڑے بنگلہ دیش کی مثال بتیسی میں گھری زبان کی طرح ہے۔ وہ تین اطراف سے خشکی کے ذریعہ اور ایک طرف سے خلیج بنگال کے راستے بھارت کے حصار میں ہے۔ بھارت کی نو دریافت ''بالائی خوشحالی'' نے فراوانیٔ وسائل اور خاص قسم کا اعتماد و حوصلہ بھارتی ریاستی اداروں کو بخشا ہے، اور علاقے میں عالمی کھلاڑیوں (بلکہ غاصبوں) سے گٹھ جوڑ کے بعد اُبھرتے ہوئے بھارتی سامراج کو شہ بھی ملی ہے۔ نتیجتاً بنگلہ دیش و پاکستان سمیت تمام ہمسایہ ممالک میں بھارتی لابیز (Lobies) اور اثرات میں تیز رفتار اضافہ ہوا ہے۔ بنگلہ دیش اِس بھارتی ''سرمایہ کاری'' اور ''سرمایہ باری'' کے نتیجے میں کم از کم فی الحال پوری طرح بھارتی اثر ورسوخ اور ترجیحات کے تابع ہو چکا ہے۔ معلوم نہیں یہ تابعداری کتنے برسوں پر محیط ہو۔

مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے مقام تک پہنچانے میں مددگار، مغربی پاکستان کے بعض وہ عناصر بھی تھے جنہیں ''اسلامی پاکستان'' سے کل بھی بغض تھا، آج بھی بیر ہے اور جو اِس خیال ہی سے چڑتے اور منہ اور قلم سے جھاگ بکھیرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ شکستِ آرزو کی یہ داستان اُسی زبان وانداز، نقطۂ نظر اور رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، جو بھارتی سامراجی موقف رہا ہے اور جو عوامی لیگی باغیوں کو مطلوب اور ان کے لیے مفیدِ مطلب ہے۔ اس طرح گویا پاکستان کے پہلے عام انتخابات (۱۹۷۰ء) میں شیخ مجیب الرحمٰن کی اکثریت تسلیم نہ کرکے ''ایک ہی ملک میں دو وزرائے اعظم'' تجویز کرنے اور ''اُدھر تم اِدھر ہم'' کا نعرۂ ''فرزانہ'' لگانے والا یہ مکتبِ فکر اپنی کم ظرفی، بدباطنی اور ملک دشمنی کا داغ اپنے تئیں چھپا لینے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن اصل المیہ یہ ہے کہ کچھ بااختیار ''محبانِ پاکستان'' تھے، جو صرف مغربی پاکستان کے بھی نصف حصے میں الیکشن جیتنے والی پارٹی کے دباؤ میں، اکثریتی پارٹی کو کچلنے کے لیے اس قدر آگے بڑھے کہ ملک ہی لہولہان اور نیم جاں ہوگیا۔ ان ''محبانِ وطن'' نے مشرقی پاکستان کی سرزمین پر وفائے عہد کی راہ میں بہنے والے لہو کو فراموش کر دیا اور جو لوگ زندہ بچے، ان سے قطع تعلق کرلیا۔ چلیے! آئندہ آپ کی یہی پالیسی رہے گی، مگر تاریخِ پاکستان کا وہ باب کہ جب ارضِ مشرق میں رُخسارِ وطن پر تھپڑ پڑ رہے تھے اور بہت سے لوگوں نے تھپڑ مارنے والے ہاتھوں کو روکنے کا سنگین خطرہ جان بوجھ کر مول لے لیا تھا، اسے کیوں بھلا دیا؟ آپ اُس باب کو تو اپنی ملّی تاریخ اور قومی شعور کی کتاب کا حصہ بنالیتے اور وفائے عہد کرنے والوں کو تو گم نامی کے صحرا میں دفن نہ ہونے دیتے۔ آپ کم از کم (مغربی) پاکستان میں تو انہیں اپنے ''قومی ہیروز'' کے ''عجائب خانہ'' کا حصہ بنالیتے۔ ایسا کرنے سے آپ کا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ مگر اس کا یہ مثبت پیغام اگلی نسلوں کو ضرور پہنچتا کہ جو لوگ پاکستان سے عہدِ وفا نبھاتے ہیں، وہ لاوارث اور بے سہارا نہیں ٹھہرتے، اور یہ کہ اِس ملک سے محبت جاں لیوا تو ہوسکتی ہے، ذلت و گم نامی کا متبادل نہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین (۱۹۲۰ـ۱۹۹۵ء)، اِس کتاب (The Wastes of Time) کے مصنف، اعلیٰ پائے کے دانشور، انگریزی ادب کے استاد اور ڈھاکا یونیورسٹی کے آخری پاکستانی وائس چانسلر خود جدّی پشتی ''بنگالی'' تھے۔ اپنی نوجوانی کے زمانے میں، پاکستان کی محبت میں

گرفتار ہوئے۔ عمر بھر حبِ پاکستان کی تپش میں جلتے اور پکتے رہے۔ شکستِ پاکستان دراصل اُن کی آرزوؤں اور خوابوں کی شکست وریخت اور اُن کے شعورِ تاریخ اور نظریات کی تکذیب تھی، جسے وہ زندگی بھر قبول نہ کرسکے اور یہ صدمہ سینے سے لگائے اپنے رب کے ہاں چلے گئے۔

ذاتی تجربات ومشاہدات اور تاثرات وخیالات پر مبنی یہ سرگزشت ہم اردو کے قالب میں ڈھال کر ''شکستِ آرزو'' کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ ہم تک انگریزی میں یہ کتاب جناب سید فیاض الدین احمد اور جناب محمد اشرف حسین کے تعاون سے پہنچی ہے۔ ہم ان دونوں کے ممنون ہیں۔ انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ جناب محمد ابراہیم خاں سے کروایا گیا۔ اِس پر نظرِ ثانی جناب احمد جمال اعجازی نے کی۔ اِن کا بھی شکریہ!

شکستِ آرزو کی یہ داستان آپ کے دل کو لگے تو اس کی کچھ کاپیاں دوسروں کو دیجیے۔ یہ سابق مشرقی پاکستان کو بھی اور پاکستان کے تاحیات عاشقِ زار ڈاکٹر سید سجاد حسین مرحوم کو بھی ہمارا حقیر سا نذرانۂ تحسین ہوگا۔ شاید ہماری، آپ کی ایسی چھوٹی چھوٹی کاوشوں ہی کے نتیجے میں پاکستان سے عہدِ وفا نبھانے اور اس کے صلے میں شہادت و بے وطنی کے عذاب جھیلنے والوں کا مقدمہ ضمیر وتاریخ کی عدالت میں تازہ رہے، لاوارث لہو کا حساب کسی کتابِ جہاں میں بھی درج ہو جائے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان پر برہمنی سامراج کی یلغار کا سامنا اور (مسلسل جاری) اس کی سازشوں کا مقابلہ کرنا اور بات ہے۔ ہم اپنے ایسے تمام محسنوں کے مقروض ہیں اور اس داستان کا تذکرہ ان شاء اللہ زندہ رکھیں گے۔ مگر اب ''بنگلہ دیش'' نامی ملک ایک حقیقت ہے۔ ہم اس کو ملتِ اسلامیہ کا ایک بازو، عالمگیر اسلامی برادری کا ایک باوقار حصہ اور پاکستان کا بھائی اور دوست سمجھتے ہیں۔ ہم بنگلہ دیش کی آزادی وخودمختاری، تعمیر و ترقی اور عزت وسرفرازی کے لیے دعاگو ہیں۔ بنگلہ دیشی عوام ہمیں اُسی طرح عزیز ہیں جس طرح کسی بھی مسلم ملک کے باشندے۔ اللہ ان سب کو شاد وآباد اور آزاد رکھے۔

ایگزیکٹو ڈائریکٹر، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی
irak.pk@gmail.com, guzarishaat@gmail.com

یکم اکتوبر ۲۰۱۲ء

سیّد سجاد حسین

پیش لفظ

میں نے یہ یادداشتیں ۱۹۷۳ء میں ڈھاکا جیل میں قلم بند کی تھیں، جہاں مجھے پاکستان کے خلاف چلائی جانے والی تحریک میں شیخ مجیب الرحمان کا ساتھ نہ دینے کے جرم میں قید رکھا گیا تھا۔ میں نہ کوئی سیاست دان تھا اور نہ ہی کسی سیاسی جماعت کا کارکن۔ البتہ میں یحییٰ حکومت کی درخواست پر ۱۹۷۱ء میں برطانیہ اور امریکا گیا تھا تاکہ یہ واضح کرسکوں کہ مشرقی پاکستان میں جاری جدوجہد دراصل کن دو قوتوں کے درمیان تھی۔ ایک طرف تو وہ لوگ تھے جو پاکستان کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے اور دوسری طرف وہ جو اِس کے نظریے سے محبت کرتے تھے۔

جیل میں میرا موڈ شدید غصے، بدحواسی اور مایوسی کے امتزاج پر مبنی تھا۔ قتل کی ایک ناکام کوشش نے مجھے جسمانی معذوری سے بھی دوچار کردیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جو کچھ میرے عقائد اور نظریات پر مبنی تھا، وہ میری آنکھوں کے سامنے مٹی میں مل چکا تھا۔ مجھ پر اس کا خاص نفسیاتی اثر مرتب ہوا تھا۔ دل میں یہ احساس بھی جاگزیں تھا کہ ہم ایک ایسی شکست سے دوچار ہوئے ہیں جس کے اثرات سے جان چھڑانا ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ ۱۹۷۱ء میں جو تبدیلی رونما ہوئی تھی وہ میرے لوگوں کے لیے سود مند نہیں تھی۔ اس خیال نے مجھے خاصے دباؤ میں رکھا، اس لیے کہ کہیں امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس خاص ذہنی کیفیت اور فضا میں، میں نے ان واقعات سے متعلق یادداشتیں قلم بند کیں جو ۱۹۷۱ء کے سانحے پر منتج ہوئے۔

میری خواہش تھی کہ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر دل کی بات لکھوں۔ مگر اس بات کا کم ہی یقین تھا کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ کبھی منظرِ عام پر آسکے گا۔ بہر حال اس بات کو میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اُسے ریکارڈ پر ضرور لے آؤں۔

میں نے سچ بیان کیا ہے اور اس معاملے میں کسی دوست یا دشمن کی پروا نہیں کی ہے۔ یہ سب کچھ لکھنے کا بنیادی مقصد صرف یہ تھا کہ میں بیان کرسکوں کہ ہم اُس ریاست کی حفاظت کیوں نہ کرسکے جو کروڑوں انسانوں کے خوابوں کی تعبیر تھی اور جس کے حصول کے لیے ہم نے

بے حساب خون، پسینہ اور آنسو بہائے تھے۔ منافقوں کی موقع پرستی سے بھی میں بہت رنجیدہ تھا۔ میں نے ایسے بھی بہت سے لوگ دیکھے تھے جو آخری لمحات تک متحدہ پاکستان کے حامی تھے، مگر بنگلہ دیش کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ''فاتحین'' کو یقین دلانے میں مصروف ہو گئے کہ انہوں نے بھی اسی دن کا خواب دیکھا تھا۔

سلاخوں کے پیچھے تنہائی میں ان یادداشتوں کو قلم بند ہوئے اکیس سال بیت چکے ہیں۔ مجھے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ مجھے جو کچھ ہوتا دکھائی دے رہا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ شدید غربت، سیاسی عدم استحکام اور پسماندگی اُن کے لیے ایک تازیانہ ہے جنہوں نے ''پاکستان کے استبداد'' سے نجات کے لیے ہتھیار اٹھائے اور جواب یہ کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش کا قیام کوئی بہت مسرت انگیز حقیقت نہیں۔ کچھ لوگ نجی طور پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں، مگر میں ان کا ذکر کرتے ہوئے پریشانی سی محسوس کرتا ہوں۔ میں نے ۱۹۷۳ء میں اپنے اندر جو مایوسی محسوس کی تھی، یہ لوگ اُس سے کہیں زیادہ مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

میں نے ۷۱-۱۹۷۰ء میں بنگلہ دیش کے قیام کی تحریک کی مخالفت کی تھی۔ تاہم میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ شناخت دے کر بنگالی قوم پرستی ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے ضروری استحکام فراہم کر سکتی ہے۔ کسی بھی مسئلے کا حل مایوسی نہیں۔ ہمیں ہر حالت میں اپنے وجود پر یقین رکھنا ہے۔

جن پر میں نے تنقید کی ہے، انہیں اگر میری زبان اور لہجے میں سختی محسوس ہو تو خیال رہے کہ میں نے یہ کتاب شدید (ذہنی و نفسیاتی) دباؤ میں لکھی تھی۔ انہیں محسوس کرنا چاہیے کہ جب خواب بکھرتے ہیں تو دل پر کیا گزرتی ہے۔ کتاب میں جا بجا بیان کا خلا سا محسوس ہوگا، جس کی توضیح سے زیادہ، معذرت مناسب ہے۔ کتاب کا اختتام بھی آپ کو خاصا بے ربط سا محسوس ہوگا، اس کے لیے بھی میں معذرت خواہ ہوں۔

کتاب میں رہ جانے والا خلا میں ۵ دسمبر ۱۹۷۳ء کو جیل سے رہائی پانے کے بعد دُور کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جیل میں رہائی کی امید کے نہ ہونے کی کیفیت میں، جو کچھ میں نے لکھا وہ گھر کی آزاد فضا میں لکھی جانے والی باتوں سے بہت مختلف ہوگا۔ میں اس کتاب

میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے کریک ڈاؤن میں ذوالفقار علی بھٹو کے کردار پر بھی پوری تفصیل سے بحث نہیں کرسکا۔ میں یہ بھی بیان نہیں کر پایا کہ اس کریک ڈاؤن کی نوعیت کیا تھی؟ پاکستانی فوج نے دسمبر ۱۹۷۰ء سے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء تک علیحدگی کی تحریک کو کچلنے کے لیے کوئی بھی قدم کیوں نہیں اٹھایا؟ اور پھر اچانک حرکت میں کیوں آ گئی، جبکہ اس کریک ڈاؤن کے مؤثر ہونے کا خود اسے بھی کم ہی یقین تھا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات پر بھی میں کھل کر روشنی نہیں ڈال سکا جو مشرقی پاکستان کے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے منعقد کیے گئے تھے۔ جو شخص ۱۹۷۰ء میں زندہ و موجود رہا ہو اور اب بھی ان واقعات کو یاد کرسکتا ہو اُسے اندازہ ہوگا کہ عوامی لیگ نے انتخابات میں بھاری اکثریت پانے کے لیے کس طرح مخالفین کے خلاف بھرپور عسکری طاقت کا استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد فتح سے بڑھ کر، واک اوور حاصل کرنا تھا۔ لوگوں کو یہ بھی اچھی طرح یاد ہوگا کہ کُھلنا اور دیگر ساحلی علاقوں میں ۱۹۷۰ء کے خوفناک سمندری طوفان کے نتیجہ میں ایک لاکھ سے زائد ہلاکتوں کے باوجود، شیخ مجیب الرحمٰن نے انتخابات کے انعقاد پر اصرار کیا تھا اور یحییٰ خان کو دھمکی دی تھی کہ انتخابات شیڈول کے مطابق نہ ہوئے تو ملک گیر احتجاج کیا جائے گا۔

یہ اور بہت سے دوسرے واقعات مَیں اس لیے بیان نہیں کرسکا کہ ہمیں یہ عندیہ مل چکا تھا کہ ہم دسمبر ۱۹۷۳ء میں عام معافی کے تحت رہا کردیے جائیں گے۔ پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ جیل سے باہر نکلنے پر مسودے میں اضافہ نہیں کروں گا، مگر پھر یہ سوچا کہ مشرقی پاکستان کے سقوط کا سبب بننے والے واقعات کے بارے میں رائے دینا ضروری ہے، خواہ بیان بے ربط ہی لگے۔

۱۹۷۵ء میں، میں سعودی عرب جانے کے لیے، پہلے لندن روانہ ہوا، اس وقت میں نے کتاب کا مسودہ عجلت میں ٹائپ کروا کے ایک دوست کے حوالے کردیا۔ تاکہ یہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ میں اپنے اس دوست کا شکرگزار ہوں کہ اس نے ۲۰ سال تک مسودے کو سنبھال کر رکھا۔ کہیں ۱۹۹۲ء میں جا کر مجھے اس کی اشاعت کا خیال آیا۔

اس کتاب میں شائع ہونے والا مواد وہی ہے جو ۱۹۷۳ء میں ڈھاکا جیل سے میری

رہائی کے وقت تھا۔ جن دوستوں کی محبت اور عنایت سے یہ کتاب شائع ہو رہی ہے، میرے پاس ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ تاہم میں تجمل حسین، محمد اشرف حسین (ایڈیٹر بنگالی ماہنامہ ''نتون سفر'')، مصباح الدین احمد اور محمد عبدالمطلب کے تعاون کا خاص طور پر شکرگزار ہوں۔

اَب میں ۷۵ سال کا ہو چکا ہوں۔ اور اس کتاب کی اشاعت میرے لیے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر کی طرح ہوگی۔

اگر تاریخ نے ۱۰۰ سال بعد بھی مادرِ وطن سے متعلق میرے خدشات کو غلط ثابت کر دیا تو قبر میں سہی، مجھ سے زیادہ خوش کوئی نہ ہوگا۔

دسمبر ۱۹۹۴ء　　　　سیّد سجاد حسین

(سابق وائس چانسلر، ڈھاکا یونیورسٹی اور راج شاہی یونیورسٹی)

قراردادِ لاہور (قراردادِ پاکستان) تیار کرنے والی مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی

سیّد سجاد حسین

پسِ پیش لفظ

مجھے کتاب کی تمہید مکمل کیے ہوئے چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بارے میں ایک اور تازہ ترین کاوش سامنے آگئی۔ میرا فوری ردِعمل یہ تھا کہ اسے توجہ کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کا نام "The Separation of East Pakistan" (مشرقی پاکستان کی علیحدگی) ہے اور اس کے مصنف حسن ظہیر ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی اس کتاب میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور ان پس پردہ محرکات کو بیان کیا گیا ہے جو جنرل یحییٰ خان کی جانب سے فوجی کارروائی کے فیصلے کی پشت پر تھے، بالخصوص عوامی لیگ کو طاقت کے ذریعے کچلنے کے حوالے سے۔

مجھے قدرے دکھ ہوا اور حیرت بھی ہوئی کہ حسن ظہیر صاحب نے جو پاکستان کی سینٹرل سپیریئر سروس سے وابستہ رہے ہیں اور مشرقی پاکستان میں گزارے حسین لمحات کو یاد بھی کرتے ہیں، تمہید میں لکھا ہے "یہ (مشرقی پاکستان کی علیحدگی) ۲۴ سال تک عوام کی مرضی کو کچلنے، اس کا احترام نہ کرنے اور قومی مسائل طاقت سے حل کرنے کی روش کا منطقی نتیجہ تھا۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک المناک باب ختم ہوا جو ایک نئے باب کا آغاز ثابت ہوا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے منٹو پارک میں قراردادِ پاکستان منظور کی گئی۔ اگلے ہی سال مدراس میں آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلم فری نیشنل ہوم لینڈ قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ آج جنوبی ایشیا کے دوسرے مسلم فری نیشنل ہوم لینڈ نے جنم لیا۔ ایک نئی قوم کی پیدائش ہوئی"۔

ان الفاظ سے بظاہر معذرت جھلکتی ہے، مگر غور کیجیے تو ان میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ ان الفاظ سے دو مقاصد حاصل کیے گئے ہیں۔ ایک طرف تو دو قومی نظریے کی نفی کی گئی ہے اور دوسری طرف مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سبب بننے والے حالات کی غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔

ان الفاظ سے دانش ورانہ سادہ لوحی اور بھارتی تاریخ سے عدم واقفیت بھی جھلکتی ہے۔

میں نے زیرِ نظر کتاب میں علیحدگی پسندانہ رجحانات اور فوجی ایکشن پر منتج ہونے والے حالات پر خاصی بحث کی ہے، تاہم یہ پوچھنا غیر متعلق نہ ہوگا کہ جس افسر کو مشرقی پاکستان میں پہلی بار خدمات انجام دینے کے دوران کوئی ظلم یا زیادتی دکھائی نہیں دی، وہ بعد میں کس طور پر کہہ سکتا ہے کہ متحدہ پاکستان کے ۲۴ سال مشرقی پاکستان کے لیے جبر اور مداخلت سے عبارت تھے؟

دوسرے یہ کہ حسن ظہیر صاحب کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے شیخ مجیب الرحمان کی قیادت میں چلائی جانے والی بنگالی قوم پرستی کی تحریک میں حصہ نہیں لیا، کیوں؟

حسن ظہیر صاحب کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی کہ اگر مشرقی پاکستان کے بنگالی بولنے والوں نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا تو پھر پاکستان ہی نہیں، بھارت کو بھی متحدہ ریاست کی حیثیت سے باقی رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیا حسن ظہیر صاحب سندھیوں اور پختونوں کو بھی انہی خطوط پر علیحدہ ہونے کی تحریک دیں گے؟ کیا وہ تیلگو، تامل اور مراٹھی بولنے والے افراد کی علیحدہ ریاست کی بھی حمایت اور وکالت کریں گے؟ اگر بنگالی ہندو مغربی بنگال میں پنجابی سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ رہ سکتے ہیں تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں کی متحدہ ریاست پر اعتراض کیوں؟ میں نے اپنی یادداشتوں میں بیان کیا ہے کہ بہت سی لسانی اکائیوں کو ایک سیاسی وحدت میں پرونے کا تصور مجھے کبھی پرکشش محسوس نہیں ہوا اور خاص طور پر ایسی حالت میں کہ جب یہ سب کچھ، انڈین قوم پرستی کے نام پر کیا گیا ہو۔

بہت سے دوسرے تجزیہ نگاروں کی طرح حسن ظہیر صاحب نے بھی ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے قیام کو قراردادِ پاکستان کی روح کے مطابق قرار دیا ہے۔ کیا وہ یورپ، امریکا اور ایشیا سے ایک بھی مثال پیش کر سکتے ہیں کہ بنگلہ دیش جیسی کوئی چھوٹی سی ریاست اردگرد واقع بڑی ریاستوں کی مرضی کے بغیر قائم اور سلامت رہی ہو؟ مغربی یورپ میں ہالینڈ، ڈنمارک

اور بلجیم، جبکہ مشرقی یورپ میں لٹویا (Latvia)، لتھوانیا اور ایسٹونیا کا وجود فرانس، جرمنی اور روس جیسی قوتوں کے باہمی تفاعل کا مرہونِ منت رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی نے مغربی یورپ کی اِن تینوں ریاستوں کو دیکھتے ہی دیکھتے فتح کر لیا تھا اور دوسری جانب روس نے لٹویا، لتھوانیا اور ایسٹونیا پر قبضہ کیا تھا۔ ہالینڈ، بلجیم اور ڈنمارک کو تو اتحادیوں نے جرمنوں کے قبضے سے چھڑا لیا تھا، تاہم لٹویا، لتھوانیا اور ایسٹونیا کو آزادی کے لیے سوویت یونین کی تحلیل کا انتظار کرنا پڑا۔

وسطی امریکا اور کیریبین کے خطے میں بہت سی چھوٹی ریاستیں ہیں جن کا وجود خطے کی بڑی قوتوں کے باہمی تفاعل کا مرہونِ منت ہے۔ اب تو بلیز (Belize) کو بھی آزاد ریاست کا درجہ مل گیا ہے اور اسے برطانیہ اور امریکا کی جانب سے تحفظ کی ضمانت بھی میسر ہے۔

افریقا میں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے۔ ایک طرف نائیجیریا جیسے بڑے ممالک ہیں اور دوسری طرف گنی بساؤ اور سیرالیون جیسی چھوٹی ریاستیں۔ یہ سب یورپی قوتوں سے آزاد ہوئی ہیں۔ ان کی سرحدیں مصنوعی اور قبائلی حد بندیوں کی بنیاد پر قائم کی گئی ہیں۔ ان ریاستوں کے مابین اختلافات ہیں اور جنگیں بھی ہوتی رہی ہیں، اس کے باوجود نقشوں میں تبدیلی کے بارے میں نہیں سوچا گیا۔ سب جانتے ہیں کہ ایسا ہوا تو پنڈورا بکس کھل جائے گا۔

اب ذرا اپنی توجہ برصغیر پر مرکوز کیجیے۔ ۱۹۴۷ء میں حق خود ارادیت کی بنیاد پر جوناگڑھ نے پاکستان سے الحاق کیا جبکہ جنوب میں ٹراونکور (Travancore) نے یہی حق استعمال کرتے ہوئے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ کشمیر کے بارے میں سوچیے، جہاں ۱۹۴۷ء سے اب تک خون بہہ رہا ہے اور مسئلے کا کوئی حل دکھائی نہیں دیتا۔ دوسری طرف مسز اندرا گاندھی نے بے بنیاد باتوں کو جواز بنا کر (آزاد ریاست) سکم کو بھارت کا حصہ بنا دیا۔

کوئی سوچ سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی بنگال اس طرح آزاد ہو کر زندہ رہ سکتا تھا جبکہ اس کے پاس کوئی سول سروس یا پولیس فورس نہیں تھی اور جو اپنے سے کئی گنا بڑے ملک کی بغل میں واقع تھا۔ کیا وہ اس حالت میں ایک ہفتہ بھی چل سکتا تھا؟

بعض سادہ لوح دانشور جو ۱۹۷۱ء کے سانحے کا کوئی نہ کوئی منطقی یا عقلی جواز پیش کرنے کے

لیے بے تاب ہیں، وہ آخر میں یہ کہہ کر تجزیے کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرارداد پاکستان پر مکمل عمل ہوا ہوتا تو مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔

حسن ظہیر صاحب نے مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے استحصال کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے، مجھے تو اس کے شواہد مشرقی بنگال میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے پس منظر میں نہیں ملتے۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء کے بھیانک قحط کا ذکر بھی نہیں کیا جس نے پورے خطے کو شدید المیے سے دوچار کر دیا تھا۔ انہوں نے بنگالی مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کا بھی ذکر نہیں کیا اور اس سے بھی پیچھے جا کر انہوں نے ۱۷۹۳ء کے مستقل سکونت کے قانون سے بنگال کے مسلمانوں پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ بھی نہیں لیا۔ میں نے اِن یادداشتوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہی وہ حالات تھے جن کے باعث ہمیں قیام پاکستان کی تحریک اللہ کی نعمت دکھائی دیتی تھی اور ہم نے اس سے اپنی امیدیں اور توقعات وابستہ کر دی تھیں۔ ایک طرف برطانوی راج کا سیاسی جبر تھا اور دوسری طرف بنگالی ہندو زمیندار طبقے کا معاشی استبداد۔ ان سے نجات کے لیے پاکستان کا قیام ناگزیر تھا۔

علیحدگی کی جو تحریک پاکستان کے قیام پر منتج ہوئی اس میں بنگالی زبان کے تحفظ کا کوئی ایشو ہی نہیں تھا۔ ذرا سے غور وفکر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں بنگالی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بسنت چیٹر جی (Basant Chatterjee) نے اپنی کتاب "Inside Bangladesh Today" میں بیان کیا ہے کہ متحدہ پاکستان پر ضرب لگانے کے لیے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف بنگالی زبان کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ پاکستان کے نئے قائدین کی کوتاہیوں نے معاملے کو مزید بگاڑا۔ اس طرح (جو کچھ بنگالی قوم پرستوں نے کیا، اس کی بنیاد پر) کوئی بھی یہ استدلال کرسکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں برطانیہ سے امریکی نوآبادیوں کے الگ ہونے کا بنیادی سبب یہ احساس تھا کہ انگریزی زبان کی حیثیت کو محفوظ رکھا جائے۔

مجھے یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوئی کہ حسن ظہیر صاحب نے پاکستان کے ابتدائی دنوں میں پیش کی جانے والی ایک تجویز کا بھی حوالہ دیا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے رشتوں کو

مستحکم کرنے کے لیے بنگالی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا جائے۔ سب سے پہلے تو میں یہ عرض کر دوں کہ اس تجویز کو کسی نے کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا اور اس پر عمل کا مرحلہ ہی نہیں آیا۔ حسن ظہیر صاحب اس معاملے میں کس حد تک سطحی معلومات رکھتے ہیں، اس کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے لکھا ہے کہ دیوناگری کی جگہ عربی رسم الخط اپنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ بنگالی جس رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اسے دیوناگری کسی نے قرار نہیں دیا۔ یہ ایک ایسا رسم الخط ہے جو برصغیر میں عربی یا فارسی رسم الخط اختیار نہ کرنے والی زبانیں استعمال کرتی ہیں۔ دیوناگری رسم الخط فی زمانہ ہندی، مراٹھی اور کسی حد تک گجراتی سے وابستہ ہے۔ جس شخص کو دیوناگری اور بنگالی رسم الخط کے فرق کا علم نہ ہو، اسے پاکستان کی بنیاد ہلانے کے لیے نہایت چالاکی اور ہنرمندی سے استعمال کیے جانے والے لسانی مسئلے پر کوئی رائے دینے کا حق نہیں۔

حسن ظہیر صاحب نے ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بارے میں خاطر خواہ تحقیق نہیں کی۔ اگر انہوں نے بسنت چیٹر جی (Basant Chatterjee) اور جیوتی سین گپتا (Jyote Sen Gupta) کی تحقیق پر نظر ڈالی ہوتی تو مشرقی پاکستان میں باغیانہ ذہنیت پروان چڑھانے کے لیے اختیار کیے جانے والے طریقوں کا انہیں کچھ نہ کچھ علم ضرور ہو جاتا۔

اسوکا رائنا (Asoka Raina) نے اگرتلہ سازش کیس کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور حسن ظہیر کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اسوکا رائنا کو پڑھا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حسن ظہیر اس کیس میں شیخ مجیب الرحمان کو بے قصور قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے بنگلہ دیش کے قیام کے بعد شیخ مجیب الرحمان کی تقاریر کا بھی جائزہ نہیں لیا جن میں انہوں نے اس امر پر مسرت اور افتخار کا اظہار کیا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے آنکھوں میں بسے ہوئے خواب کو تعبیر مل گئی ہے۔ میں نے کتاب کے ایک ضمیمے میں لیفٹیننٹ جنرل متین الدین کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جنرل متین الدین اور حسن ظہیر نے مشرقی پاکستان کے سقوط کے بارے میں دلچسپ معلومات جمع کی ہیں۔ میجر جنرل راؤ فرمان علی کی کتاب "How Pakistan Got Divided" بھی اہم ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی ایسا مواد پیش نہیں کیا جن سے میری یہ

رائے غلط ثابت ہو کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی بین الاقوامی سازش کا نتیجہ تھی۔ سفارتی محاذ پر علیحدگی پسند عناصر کی بڑی کامیابی یہ تھی کہ وہ جذباتی مگر عقلی اعتبار سے ناپختہ نوجوانوں کی توجہ کا مرکز بننے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پاکستان سے علیحدگی کے لیے پرتشدد واقعات کو یقینی بنانے میں انہی جذبات سے مغلوب نوجوانوں کو آلۂ کار بنایا گیا جو آج یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں دھوکا دیا گیا۔

سید سجاد حسین

ڈھاکا سے واپسی پر

فیض احمد فیض

ہم کہ ٹھہرے اجنبی، اتنی مُداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا، کتنی ملاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی، بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے، کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے، ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں، مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا، پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گِلے شکوے بھی کر لیتے، مُناجاتوں کے بعد

اُن سے جو کہنے گئے تھے، فیضؔ جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات، سب باتوں کے بعد

پہلا باب

میں ۲۰ دسمبر کو موت کے منہ سے کیسے نکلا؟

مجھے اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اس کتاب کو لکھنا میرے لیے ایک ایسے سفر پر روانہ ہونے کے مترادف تھا جس کی سمت یا منزل متعین نہ ہو۔ میں آپ بیتی پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری ۴۷ سالہ زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک منتقل کیے جانے کے قابل ہو۔ بے شک میں قومی زندگی کے چند اہم واقعات کا شاہد ہوں اور بس! ان واقعات میں میرا کردار اس قدر غیر اہم ہے کہ اس کی بنیاد پر کچھ لکھنا میرے لیے مشکل ہے۔ میرے دل میں شہرت حاصل کرنے کی تمنا بھی نہیں ہے، بلکہ میں تو اس بات سے بھی خوفزدہ رہتا ہوں کہ کہیں ضرورت سے زیادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ بن جاؤں۔ مجھے تسلیم ہے کہ جس ڈرامے کے پیچ وخم میں اپنے آپ کو الجھا ہوا پاتا ہوں، اس میں کوئی کردار پانے کی میں نے کبھی کوئی شعوری کوشش نہیں کی۔ اور پھر میرے پاس ہے ہی کیا جو قارئین کی توجہ کا مرکز بنے۔

اس کتاب کو لکھتے وقت میرے ذہن میں کوئی قاری نہیں۔ میں جیل میں ہوں اور غیر یقینی حالات نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ پورے یقین سے کہا نہیں جاسکتا کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ جیل سے باہر جا بھی سکے گا یا نہیں۔ اور اگر گیا تو کوئی ناشر اسے شائع کرنے کی ہمت بھی کر پائے گا یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مسودہ (مغربی) پاکستان تک پہنچنے میں کامیاب ہو مگر سوال یہ ہے کہ وہاں کوئی بھی ناشر اس کتاب کو شائع کرنے میں کیوں دلچسپی لے گا؟ میں کوئی ممتاز سیاسی شخصیت تو ہوں نہیں جس کے نظریات میں کسی کو دلچسپی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ قارئین تاریخی واقعات میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ مگر میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ جو کچھ ملک اور قوم پر گزر گئی ہے اس کا تجزیہ کرسکوں۔ تاریخی واقعات

کے تجزیے کے لیے جو کچھ درکار ہوتا ہے وہ میرے پاس نہیں ہے۔ اور کچھ تو جانے دیجیے میری رسائی تو اپنی ڈائریوں تک بھی نہیں۔ جیل میں ایک کتب خانہ تو ہے مگر اس میں رکھی ہوئی کتابیں زیادہ کارآمد نہیں۔ ملک اور قوم کے لیے غیر معمولی اہمیت کے حامل واقعات کو محض حافظے کی بنیاد پر ریکارڈ کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسے میں قدم قدم پر لغزش سرزد ہو سکتی ہے۔ تاریخی اہمیت کی حامل شخصیات اور مقامات کے ناموں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ بہت کچھ گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مصنف جہاں روشنی پھیلانے کی کوشش کرنا چاہتا ہے وہاں اندھیرا پھیلنے لگتا ہے۔ رہنمائی کی کوشش لوگوں کو گمراہ کر دیتی ہے۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ لوگوں کی الجھن میں اضافہ کروں یا بدگمانی کے جال میں پھنسا دوں۔

پھر میں کیوں لکھنے بیٹھ گیا ہوں؟ سچ تو یہ ہے کہ جیل کی چار دیواری میں جو گھٹن اور بیزاری شدت سے محسوس ہوتی ہے، اس سے باہر نکلنے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ یادوں کا سہارا لے کر چند واقعات قلم بند کرنے بیٹھا ہوں۔ خاصے تذبذب کے بعد میں نے خود کو کچھ لکھنے کے لیے تیار کیا ہے۔ انسان ہر وقت صرف مطالعہ ہی نہیں کر سکتا۔ ذہن میں جو کچھ ابھرتا ہے اسے قلم بند کرنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ جیل کے کتب خانے میں موجود کتابیں مطالعے کے ذوق کو زیادہ پروان نہیں چڑھاتیں۔ یہاں چند سوانح ہیں، کچھ مذہبی کتابیں اور بعض سنسنی خیز ناول اور بس۔ اگر کوئی کتاب اچھی لگے اور آپ پڑھنے میں بھرپور دلچسپی لینے لگیں تو سارا جوش و خروش اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب اس کی دیگر جلدیں ہاتھ نہیں آتیں! جیل میں سطحی قسم کا مطالعہ جلد یا بہ دیر عدم دلچسپی پر ہی منتج ہوتا ہے اور قیدی ایک بار پھر اپنے آپ کو اسی شکنجے میں پاتا ہے جس سے بھاگنے کے لیے مطالعے کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔

میں یہ سوچ کر لکھنے بیٹھ گیا ہوں کہ شاید کوئی ایسا مسودہ دنیا کے سامنے آئے جس میں بیسویں صدی کے آخری حصے کے پاکستان کے حالات کے حوالے سے ذرا مختلف کوئی بات ہو۔ ہو سکتا ہے کہ میں دوسروں سے ہٹ کر، کوئی منفرد چیز پیش کر سکوں۔ گو کہ امید موہوم ہے مگر ہے تو امید۔

جب میں ڈھاکا سینٹرل جیل کے اس حصے میں جسے نیو ٹوئنٹی کہا جاتا ہے، اپنے سیل نمبر ۲ میں بیٹھا جیل کے مجموعی ماحول کے بارے میں سوچتا ہوں تو حیرت سی ہوتی ہے۔ جو کچھ ہم پر

واقعی گزر گئی ہے وہ سب کچھ بھی غیر حقیقی سا محسوس ہوتا ہے۔ یہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی بات ہے جب مسلح نوجوانوں کا ایک گروہ میرے گھر میں گھس آیا اور مجھے گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ مسلح تھے جبکہ میں مزاحمت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ گروہ کے سرغنہ نے حکم دیا کہ ہتھیار ان کے حوالے کر دیے جائیں۔ میں نے بتایا کہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔

یہ ۱۹ / دسمبر کی بات ہے۔ میں اپنے گھر کی بالائی منزل پر کمرے میں بیٹھا اپنی بڑی بیٹی سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک نیچے کچھ شور سا سنائی دیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا چند مسلح نوجوان میری بیوی اور کزن سے کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ وہ اوپر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ مجھے لینے آئے ہیں، اس لیے میں نے نیچے جانے کا سوچا۔ مگر پھر جان بچانے کے فطری جذبے سے مغلوب ہو کر میں دوبارہ کمرے میں گھس گیا۔ میری بیٹی نے باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس نے کہا کہ کسی بھی حالت میں باہر مت نکلیے گا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مزاحمت سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ جو گروہ مجھے لینے آیا تھا وہ مجھے لیے بغیر کیسے جاتا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر بیٹی نے کنڈی نہ کھولی۔ اتنے میں اُن لوگوں نے لکڑی کا دروازہ توڑ ڈالا۔ ایک نے مجھے کالر سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا نیچے لے گیا۔ گلی میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ مجھے اُس میں ڈال دیا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب میں گھر والوں سے شاید دوبارہ نہ مل پاؤں۔ محلے اور علاقے کے لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جیپ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر مڑی۔ اور ناظم الدین روڈ پر ڈھاکا جیل کے شمال مشرقی کونے سے آگے بڑھ کر بخشی بازار سے ہوتی ہوئی یونیورسٹی کیمپس کی طرف جانے لگی۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ کیا میں وہی ہوں جسے وہ لے جانے آئے تھے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ان کا اندازہ درست ہے۔ میں انہیں اپنی شناخت کے حوالے سے خواہ مخواہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ میں خاصا خوفزدہ ہو گیا تھا مگر پھر یہ سوچ کر دل کو بہلاتا رہا کہ ہو سکتا ہے کہ مجھے صرف پوچھ گچھ کے لیے لے جایا جا رہا ہو۔ کچھ ہی دیر میں ہم سائنس اینیکسی بلڈنگ تک پہنچ گئے۔ جیپ میں ۶ / افراد سوار تھے۔ یہ لوگ مجھے جیپ سے اتار کر اندر لے گئے اور ایک کمرے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ جس نوجوان نے مجھے کالر سے پکڑ کر گھسیٹا تھا، اس نے

بتایا کہ وہ چار پانچ سال قبل ڈھاکا یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک مرتبہ اس نے مجھے پٹائی سے بچایا تھا مگر ساتھ ہی افسوس بھی ظاہر کیا کہ میں ان چار پانچ برسوں میں سدھر نہیں سکا تھا۔۔۔ اور اب پاکستانی فوج اور حکومت کا ساتھ دینے کی پاداش میں مجھے موت کو گلے لگانا تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ مجھے اس طرح پکڑ کر کیوں لایا گیا ہے تو الزامات کی بوچھاڑ کردی گئی۔ سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ میں فوج کے ہاتھوں اساتذہ اور طلبا کی موت کا ذمہ دار تھا۔ انہوں نے مجھ پر فوج کو لڑکیاں سپلائی کرنے کا الزام بھی عائد کیا۔ یہ تمام الزامات میرے لیے سوہانِ روح تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ مارنا ہے تو مار ڈالو، مگر یہ تمام الزامات بے بنیاد ہیں اور یہ کہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی خاطر میں مقدمات کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔

کچھ ہی دیر میں انہیں یقین ہوگیا کہ مجھ سے بحث کرنا لاحاصل ثابت ہوگا۔ انہوں نے میری شرٹ، بنیان اور پینٹ اتاری، میرے ہی رومال سے میرے ہاتھ پشت پر باندھے اور پھر چمڑے کے ایک پٹے سے مجھے مارنا شروع کیا۔ انہوں نے میرے گھٹنوں پر بھی مارا جس سے جوڑ دکھنے لگے۔ جب وہ مجھے مارتے مارتے تھک گئے تو ایک نوجوان کو میری نگرانی پر مامور کر کے چلے گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے باہر سے کنڈی بھی لگادی۔

شدید زدوکوب کے نتیجے میں میری حالت غیر ہوچکی تھی۔ میں نے اُس نوجوان سے پانی مانگا۔ اس نے ایک کپ میں پانی دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ آنکھ سے پٹی ہٹادے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پٹی سرکائی۔ وہ بیس بائیس سال کا تھا اور ضلع میمن سنگھ کے کسی دیہی علاقے میں کالج میں پڑھتا تھا۔ اس نے میری حالت پر افسوس کا اظہار کیا۔ میری گرفتاری کا سبب تو اسے بھی معلوم نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ مجھے گروپ کمانڈر کے حکم پر گرفتار کیا گیا تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ پاکستانی فوج کی جانب سے اچانک ہتھیار ڈالنا حیرت انگیز معاملہ تھا کیونکہ مکتی باہنی کے لیڈر اور بیشتر کارکن تو لڑتے لڑتے ہمت ہار چکے تھے اور فتح کا خیال بھی دل سے نکال چکے تھے۔

نوجوان یقین دلاتا رہا کہ مجھے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بقول مجھے الزامات کا جواب دینا ہوگا۔ وہ یقین دلا رہا تھا کہ کم از کم وہ میرے قتل کے احکام پر عمل نہیں کرے گا۔ یہ تمام باتیں محض دل کے بہلانے کے لیے تھیں۔ اگر وہ لوگ مجھے مارنے کا فیصلہ کرہی چکے تھے تو پھر کوئی

ایک باضمیر معترض ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ میں بہ ہر حال اس بات سے مطمئن اور خوش تھا کہ شدید نفرت اور تعصب کے اس ماحول میں کم از کم ایک نوجوان تو ایسا ہے جس کے سینے میں دل اب تک دھڑک رہا ہے اور احساسات نے دَم نہیں توڑا۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میں نے راج شاہی یونیورسٹی میں بہت سے نوجوانوں کو فوجی کارروائی سے بچایا۔ اس نے دو تین مرتبہ واضح الفاظ میں مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے کسی حال میں قتل نہیں کرے گا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی اندر آیا پھر اس کے بعد کئی اور افراد بھی کمرے میں آ گئے۔ میری آنکھوں پر دوبارہ پٹی باندھ دی گئی۔ جب میں نے آنکھ سے پٹی ہٹانے کے لیے کہا تو ایک نوجوان نے مغلظات سے نوازنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جس خدا کی تم عبادت کرتے ہو وہ بھی تمھیں بچانے نہیں آئے گا۔ میں خاموش رہا، کیا کہہ سکتا تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی گھنٹے گزر گئے۔ پھر کمرے کی بتیاں جلا دی گئیں۔ شاید رات ہو چکی تھی۔ کیا مجھے قتل کرنے کے لیے رات کا انتظار کیا جا رہا تھا؟ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے جب گاڑیوں کا شور برائے نام رہ گیا، ایک شخص آیا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے لے چلا۔ میں نے پوچھا کہ کہاں لے جا رہے ہو؟ تو وہ بولا ''مسٹر وائس چانسلر! آپ بہت جی چکے۔'' اس کا خیال تھا کہ ۱۴ ارجون کو ڈھا کا یونیورسٹی میں منیر الزماں اور دیگر اساتذہ اور طلبا کے قتل عام میں میرا ہاتھ تھا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ نومبر میں خواتین کے ہال پر چھاپے کی سازش کا جال بھی میرا بچھایا ہوا تھا۔ میری تردید کو جھوٹ قرار دے کر مسترد کر دیا گیا۔ کئی راہداریوں سے گزار کر مجھے ایک اور کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ رسّی کے جس ٹکڑے سے میرے ہاتھ باندھے گئے تھے، اس کا دوسرا سرا ایک کھمبے سے باندھ دیا گیا۔ پہلے مجھے فرش پر بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ پھر بینچ پر بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ دو افراد میری نگرانی پر مامور تھے۔ وہ کچھ دیر تو آپس میں کچھ کھسر پھسر کرتے رہے، پھر اُن میں سے ایک نے بستر، کمبل اور تکیہ نکالا اور چند ہی لمحوں کے بعد خراٹے لینے لگا۔

اب مجھے اس بات کا مکمل یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔ میرا خیال تھا کہ میری سزائے موت پر عمل کے لیے صبح کا وقت چُنا گیا ہے جیسا کہ دنیا بھر میں بالخصوص جبر پسند معاشروں

میں ہوتا ہے۔ جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا تو مجھے پکڑ کر لانے والوں نے مجھ سے وہی سلوک روا رکھنا شروع کر دیا جو بلی چوہے سے روا رکھتی ہے! وہ چاہتے تھے کہ مجھے موت کا یقین ہو جائے۔ یہ بھی اذیت دینے ہی کا ایک طریقہ ہے۔

میں خاموشی سے تقدیر کے لکھے کا انتظار کرتا رہا۔ میرے جوڑوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ کلائی میں رسّی اس زور سے باندھی گئی تھی کہ گوشت میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں تکلیف محسوس کیے بغیر پہلو بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ جو چپل میں نے پہن رکھی تھی وہ پیروں سے نکل چکی تھی۔ مگر خیر مجھے پیر پسارنے کا موقع ملا اور خاصی راحت محسوس ہوئی۔ میں نے کئی بار پہلو بدلا تاکہ سکون ملے مگر احتیاط کے ساتھ کہ کہیں کسی پہرے دار کی آنکھ نہ کھل جائے۔

اب میں حالات کی تبدیلی پر غور کر رہا تھا۔ جو کچھ رونما ہو رہا تھا، اس پر مجھے خاصی حیرت ہو رہی تھی۔ چوبیس سال قبل کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ ملک ایسی صورت حال سے دوچار ہوگا۔ تاریخ حیرت انگیز واقعات سے بھری پڑی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوتا ہے تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ ۱۵ر دسمبر کو فضائی کارروائی کے بعد مجھے وائس چانسلر کی سرکاری رہائش گاہ سے 109۔ ناظم الدین روڈ پر اپنے گھر منتقل ہونا پڑا۔ حالات ابتر تھے مگر پھر بھی امید تھی کہ سب کچھ درست ہو جائے گا۔ دنیا بھر میں تشدد کے ذریعے ریاستی نظام کو پلٹنے کی مثالیں موجود تھیں مگر ہمارا ایسا کوئی تجربہ نہ تھا۔ ہمیں نہ جانے کیوں یقین تھا کہ جو کچھ جنوبی امریکا اور مشرقِ وسطیٰ میں ہوتا رہا ہے، وہ ہمارے ہاں کبھی رونما نہیں ہوگا۔ پتا نہیں کیوں ہم سمجھتے تھے کہ ہماری سرزمین ایسی تمام تبدیلیوں سے محفوظ رہے گی۔

رات گئے کہیں دور اِکّا دُکّا فائر اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کبھی کوئی موٹر رکشہ گزرتا تھا تو اس کی آواز بھی نمایاں سنائی دیتی تھی۔ میں گھر والوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں جس حالت میں انہیں چھوڑ آیا تھا، اس میں اگر وہ ہمت نہ ہارتے تو بڑی بات تھی۔ ہمارا کوئی ذاتی مکان تھا نہ بینک بیلنس۔ میں اس بات پر سخت افسردہ تھا کہ میرے گھر والے بے یار و مددگار رہ گئے۔ مجھے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ میں نے ان کے لیے کسی اضافی آمدنی کا اہتمام کیوں نہ کیا۔ یہ درست ہے کہ میں نے ایمانداری سے کام کیا تھا اور کبھی ناجائز ذرائع

سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی مگر اس سے اہل خانہ کو کیا فائدہ پہنچا تھا؟ میرے پاس اہل خانہ کو اللہ کے حوالے کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اللہ پر مکمل بھروسا تھا مگر پھر بھی میں رات بھر اپنے گھر والوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔

پاکستان میرا آئیڈیل تھا۔ اس کا ٹوٹنا میرے لیے سخت صدمے کا سبب تھا۔ میں سوچتا رہا کہ اگر میں اس صورت حال سے نکل کر زندہ بھی رہا تو اپنے خوابوں کے ملبے پر کس طور زندگی بسر کرسکوں گا۔ جن خوابوں پر میری زندگی کا مدار تھا ان کا مضحکہ اڑانے والے معاشرے میں زندہ رہنا کسی صورت آسان نہ تھا۔ زندہ رہنے اور کچھ کر گزرنے کے لیے انسان کے پاس کوئی نہ کوئی آدرش تو ہونا ہی چاہیے۔ نظریۂ پاکستان ہمارے لیے سب کچھ تھا۔ یہ ہمارے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ اس سے ہٹ کر زندہ رہنا ہمارے لیے ناقابلِ تصور تھا۔

ای ایم فورسٹر (E.M. Forster) نے لکھا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچانیں اور قریب آئیں تو ان کے درمیان پائی جانے والی اجنبیت اور نفرت دم توڑنے لگتی ہے۔ اس کے لیے اس نے صرف رابطے ''اونلی کنٹیکٹ'' (Only Contact) کا لفظ استعمال کیا۔ مگر میرا مشاہدہ ہے کہ بحرانی کیفیت میں لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں، جنہیں اچھی طرح جانتے ہیں، انہی کے خلاف صف آرا بھی ہو جاتے ہیں۔ میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں کہ جن لوگوں نے مجھے یرغمال بنایا وہ ڈھاکا یونیورسٹی کے سابق طلبا تھے اور مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میں نے ہمیشہ تشدد اور ایذا رسانی کی مخالفت کی تھی مگر ان باتوں سے مجھے دی جانے والی اذیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

رات بھر میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات ابھرتے، ڈوبتے رہے۔ میری نگرانی پر مامور دونوں نوجوان خراٹے لے کر سوتے رہے۔ ساری رات میرے کمرے کے باہر جیپیں اور کاریں آتی جاتی رہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھ جیسے دوسرے اور بہت سے لوگوں کو بھی یرغمال بنا کر لایا گیا ہوگا۔ میری نگرانی پر مامور ضلع میمن سنگھ کے نوجوان نے بتایا تھا کہ یونیورسٹی کیمپس کو مکتی باہنی کے کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کبھی کبھی ہمارے کمرے کے باہر سے کچھ لوگ ٹولیوں کی شکل میں مارچ کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ ان کے قہقہوں سے راہداریاں گونجتی رہتی تھیں۔ وہ فتح کا جشن منا رہے تھے۔

حالات بہت خراب تھے۔ موت کا خوف بھی ذہن پر سوار تھا۔ سب کچھ غیر یقینی تھا مگر اس کے باوجود دل کانپ نہیں رہا تھا۔ جب مجھے یونیورسٹی کیمپس میں لایا گیا تھا تب گلا خشک تھا مگر اب وہ کیفیت نہیں رہی تھی۔ اب صرف یہ خواہش باقی بچی تھی کہ موت آئے تو باوقار انداز سے اس کا استقبال کروں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی جواز کے بغیر ہیرو بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھاگنے کا موقع نہ تھا مگر بدحواسی ذہن پر سوار نہ تھی۔ ایسے میں قرآن کی آیات کی تلاوت نے دل کو بڑا سہارا دیا۔ میں زیرِ لب تلاوت کرتے ہوئے اللہ سے دعا گو تھا کہ موت پرسکون طریقے سے آئے۔ میں جانتا تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد میں اُس دنیا میں چلا جاؤں گا جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔

کہیں دور مرغ کی بانگ صبح ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ ایسے میں کوئی چیختا ہوا آیا، کمرے کے دروازے کو بری طرح پیٹنے لگا۔ مجھ سے چلنے کے لیے کہا گیا۔ میرے پیر میں چپل نہیں تھی۔ جرابیں البتہ میں نے پہنی ہوئی تھیں۔ باہر جیپ تیار تھی۔ پہلے مجھے آگے بٹھایا گیا مگر پھر اتار کر پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ جیپ میں مجھے گارڈز کے ساتھ فرش پر بٹھا دیا گیا۔ جیپ چل پڑی اور میں اندازے ہی قائم کرتا رہا کہ ہم کن کن علاقوں سے گزر رہے ہیں۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے جیپ سے اتار کر کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا۔ پھر انہوں نے سرگوشیوں کی شکل میں کچھ کہنا شروع کیا۔ وہ شاید یہ طے کر رہے تھے کہ میری چیخیں روکنے کا اہتمام کس طور کیا جائے گا! اب میں موت کے لیے مکمل طور پر تیار تھا۔ میں نے ایک بار پھر اہل خانہ کو اللہ کے حوالے کیا، زیرِ لب کلمہ شہادت پڑھا اور اللہ سے دعا کی کہ موت کو مجھ پر آسان کر دے۔

کسی نے چاقو سے میرے سینے پر دو تین ہلکے کٹ لگائے۔ درد کی ایک لہر سی اٹھی مگر میں حیران تھا کہ تکلیف زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ میری پیٹھ پر بھی خنجر کے دو تین وار کیے گئے اور پشت سے نیچے کا دھڑ رفتہ رفتہ سُن ہوتا چلا گیا۔ اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور میں ایک سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ میرے زخمی ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں سسکیاں لے رہا تھا۔ میرے پیروں میں تو جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب میں رفتہ رفتہ موت کے گھاٹ اتر جاؤں گا۔ ہر لمحہ یہ

خوف دامن گیر تھا کہ دل کہیں دھڑکنا نہ بھول جائے! میں نے طے کرلیا تھا کہ جب تک سانسوں کا ربط برقرار ہے اور میں ہوش میں ہوں، کلمہ طیبہ کا ورد جاری رکھوں گا۔

مجھے حیرت تھی کہ میں مرنے میں کافی وقت لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی جھک کر دیکھ رہا ہے۔ کیا وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ مجھے مارنے کے لیے مزید کوئی وار ضروری ہے؟ کیا آسان اور باعزت موت دینے کے لیے وہ مجھے ایک چرکا اور لگائے گا؟ مجھے اچانک یہ بات سوجھی کہ اگر کراہنا چھوڑ دیا تو شاید یہ شخص مردہ سمجھ کر مجھے چھوڑ دے گا۔ میں نے آواز نکالنا بند کر دیا اور بے حس وحرکت پڑا رہا۔ چند لمحات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جو شخص جھک کر مجھے دیکھ رہا تھا وہ جا چکا تھا۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میرے لیے خطرات ختم ہوگئے ہیں اور مجھ پر حملہ کرنے والے علاقے سے چلے گئے ہیں یا نہیں۔ چند ایک ٹھیلے اور رکشے قریب سے گزرے، میں نے اندازہ لگایا کہ شاید مجھے شہر کے نواح میں کسی دیہی علاقے میں پھینک دیا گیا ہے۔ اگر یونہی پڑا رہتا تو کسی گاڑی یا جانوروں کے پیروں تلے کچلا جاتا۔ اس لیے میں نے قریب سے گزرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی جسے میں نے زبان سے کچھ سرکایا اور پوری قوت سے چلا کر لوگوں کو متوجہ کیا۔ کچھ لوگ میری طرف آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ اب تک مرا نہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اب تک زندہ ہوں اور یہ استدعا بھی کی کہ میرے منہ سے کپڑا اور آنکھوں سے پٹی ہٹا دیں۔ چند لمحات تک تو وہ لوگ تذبذب میں مبتلا رہے، پھر ایک نے آگے بڑھ کر پٹیاں کھول دیں۔

آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ مَیں جناح ایونیو پر گلستان سینما ہال کے سامنے چوراہے پر پڑا تھا۔ اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ دن میں یہ علاقہ خاصا مصروف اور پُرہجوم رہتا ہے مگر علی الصبح وہاں سے بہت کم گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے نے میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی تھیں۔ وہاں پانچ چھ افراد موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے ہاتھ کھول دیں۔ انہوں نے پوچھا کہ حملہ آور کون تھے؟ مجھ سے انجانے میں ایک بھیانک غلطی ہوگئی اور یہ کہہ بیٹھا کہ مکتی باہنی والوں نے حملہ کیا تھا۔ جیسے ہی میں نے مکتی باہنی کا حوالہ دیا، وہ لوگ سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر انہوں نے ہاتھ کھولے تو مکتی باہنی والے انہیں

گولی ماردیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسے آدمی کی مدد کرنے سے نہ کترائیں جو تقریباً مرچکا ہے۔ آنکھوں سے پٹی ہٹانے والا نوجوان آگے بڑھا اور دوسروں کے اعتراض کے باوجود ہاتھ کھولنے لگا۔ قریب ہی ایک اور شخص بھی پڑا تھا جسے شدید زخمی حالت میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس نے آواز دی ''میں حسن زمان ہوں''۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہمیں ایک ہی جیپ میں لاکر یہاں پھینکا گیا تھا۔ میں اس جگہ سے بہت نزدیک پڑا ہوا تھا جہاں ڈھاکا کی مشہور توپ نصب تھی۔ انکلوژر کا سہارا لیتے ہوئے میں بیٹھ گیا۔

تماشائیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ کوئی رکشہ روک لیں تا کہ ہم کسی اسپتال یا پھر مسجد بیت المکرّم تک پہنچ جائیں۔ ان میں سے ایک شخص کچھ زیادہ ہی جارحانہ موڈ میں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں چونکہ مکتی باہنی نے مارا تھا، اس لیے ہم اسی سلوک کے مستحق رہے ہوں گے! جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس کا لہجہ مزید جارحانہ ہوگیا۔ اس نے ان الزامات کا اعادہ کیا جو اسے پروپیگنڈے کی صورت میں ریڈیو جے بنگلہ[1] سے سننے کو ملا تھا۔ اس نے کہا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کو قتل کرانے والوں اور پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ دینے والوں کو یہی سزا دی جانی چاہیے تھی۔ میں بے بنیاد الزامات کے خلاف صرف احتجاج کرسکتا تھا مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔

میں نے ایک رکشہ روکنا چاہا مگر بھیڑ نے اسے رُکنے نہیں دیا۔ میرے لیے صورت حال ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہاں سے بھارتی فوجیوں کا ایک ٹرک بھی گزرا مگر میں ان فوجیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہا۔ میں نے وہاں کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا کہ وہ میرے گھر والوں ہی کو مطلع کردیں۔ میں نے اپنا ٹیلی فون نمبر بھی دہرایا۔ مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میری خوش نصیبی تھی کہ ان میں سے ایک شخص میرے علاقے کا نکل آیا۔ وہ مدد کے لیے آگے آیا۔ اس نے ایک رکشہ روکا اور مجھے رکشہ میں ڈال دیا۔ مجمع نے مداخلت نہیں کی۔ میں نے رکشہ ہی میں سے دیکھا کہ ڈاکٹر حسن زمان کسی نہ کسی طرح کھڑے ہوکر مسجد بیت المکرّم کی طرف جا رہے تھے۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ میری طرح مفلوج نہیں ہوئے تھے۔

---

[1] مکتی باہنی کا ریڈیو جے بنگلہ۔

دوسرا باب

جب میں تباہ حال گھر واپس آیا

گھر والے مجھے مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ جب انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ جب مجھے رکشہ سے اتار کر گھر میں لے جایا جا رہا تھا اس وقت میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میں مکمل تباہ ہو چکا تھا۔ میرے سینے اور پیٹھ پر چھریوں کے چھ زخم لگے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ ٹانگوں کی حالت ایسی نہ تھی کہ میں ٹھیک سے کھڑا ہو پاتا۔ مجھے چٹائی پر لٹا کر کوئی گرم مشروب دیا گیا اور پھر مجھے کمبل میں لپیٹ دیا گیا۔ پاس پڑوس کے لوگ مجھے دیکھنے کے لیے اُمڈے چلے آئے۔ جو اجنبی کبھی ہمارے گھر میں داخل ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے، وہ بھی اندر آ گئے اور مجھے دیکھتے رہے۔

بھارتی فوجی افسران کو گزشتہ شام میرے اغوا کی خبر دی گئی تھی اور انہوں نے میری تلاش میں چند اہلکاروں کو روانہ بھی کیا تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں گھر واپس آ گیا ہوں تو وہ مجھے دیکھنے آئے۔ مقامی اسپتال کے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ پہلے تو وہ آنے میں آنا کانی کرتا رہا مگر جب اسے بتایا گیا کہ بھارتی فوجی افسر بھی آئے ہوئے ہیں تو وہ آ گیا۔ تاہم اس نے ایکسرے کے بغیر میرے زخموں کی مرہم پٹی کرنے سے انکار کر دیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ پہلے ایکسرے کرایا جائے۔ وہ اس لیے بھی انکار کر رہا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی یہ کہے کہ اس نے کسی ایسے شخص کی مرہم پٹی کی ہے جسے مکتی باہنی والوں نے زخمی کیا تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ سے کوئی بڑا مسئلہ کھڑا نہیں ہوا کیونکہ انڈین آرمی کی میڈیکل کور سے تعلق رکھنے والا ایک ڈاکٹر بھی آ چکا تھا۔ اس نے میرے زخم دھو کر مرہم پٹی کر دی اور پھر نصف گھنٹے کے اندر میرے لیے ایک ایمبولینس کا اہتمام بھی ہو گیا تاکہ مجھے ڈھاکا میڈیکل کالج ہاسپٹل لے جایا جا سکے۔ وہاں پر مجھے کیبن نمبر دس اور گیارہ میں رکھا گیا۔ چار بھارتی فوجیوں کو میری حفاظت پر مامور کیا گیا۔ یہ فوجی

میرے ساتھ ایک ہفتہ رہے۔ اس کے بعد بابو پورہ پولیس آؤٹ پوسٹ کے ایک دستے نے ان کی جگہ میری نگرانی کے فرائض سنبھال لیے۔ مجھے ۲۰ دسمبر سے ۳۰ جنوری تک اسپتال ہی میں رکھا گیا اور اس کے بعد ڈھاکا سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔

میں نے اسپتال میں جو زمانہ گزارا اس میں سوائے چند ایک چھوٹی موٹی باتوں کے کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا۔ ان میں ایک معاملہ تو کیبن نمبر دس سے کیبن نمبر انیس میں میرے تبادلے سے متعلق تھا۔ یہ تبدیلی اس لیے رونما ہوئی کہ بنگلہ دیش کے ایک وزیر خوندکر مشتاق نے بعض وجوہ کی بنیاد پر سرگرم سیاست سے عارضی ریٹائرمنٹ لینے کا فیصلہ کیا اور وہ کیبن ان کے لیے درکار تھا۔ مختصر نوٹس پر مجھے رات آٹھ بجے کیبن نمبر انیس میں منتقل کر دیا گیا۔ میں ابھی تک چلنے کے قابل نہیں ہو پایا تھا اس لیے وہ مجھے ٹرالی میں ڈال کر لے گئے تھے۔

ایک دو دن بعد چند عسکریت پسند طلبا کو کسی کے لیے کیبن کی ضرورت پڑی تو انہوں نے میرے گارڈز سے کہا کہ کمرہ خالی کر دیں۔ اس کے بعد سے پولیس پارٹی کے سپاہی میرے کیبن کے باہر کھلی جگہ پر بیٹھ کر حفاظت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

بھارتی گارڈز کے رخصت ہونے کے بعد اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میری حفاظت پر کون مامور ہے۔ ان کی نگرانی سخت نہیں تھی۔ کوئی بھی روک ٹوک کے بغیر میرے کیبن میں آ سکتا تھا۔ جن پولیس اہلکاروں کو میری حفاظت پر مامور کیا گیا تھا وہ بیشتر اوقات غائب رہتے تھے۔ میں نے دو ایک مرتبہ احتجاج بھی کیا مگر پھر اندازہ ہوا کہ ''دشمنوں کا ساتھ دینے والے'' کی جانب سے احتجاج، خود اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا! ۲۱ دسمبر کو ایک اخبار میں شائع ہونے والے اعلان سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے ''دشمنوں کے ساتھی'' کی حیثیت میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس اخباری اطلاع میں یہ بات شامل نہیں تھی کہ مجھ پر حملہ کیا گیا تھا اور یہ کہ میں علاج کے سلسلے میں اسپتال میں ہوں۔ اخباری اعلان پڑھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے میں جیل میں ہوں۔

اسپتال میں پہلے ہفتے کے دوران، میں شدید درد کی کیفیت میں رہا۔ میرے کاندھوں، سینے اور کمر کے آس پاس شدید درد تھا۔ میرے تلووں سے رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور یہ

حالت آج بھی برقرار ہے۔ جسم کے زیریں حصے کی حالت زیادہ خراب تھی۔ میں بائیں ٹانگ ہلا نہیں سکتا تھا اور ٹخنے سے نیچے تو جس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ رات کے وقت درد کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ پیٹھ کے بل سونے کے لیے مجھے خاصی محنت کرنی پڑتی تھی۔ ٹانگیں اتنی بھاری ہوگئی تھیں کہ میں انہیں ہلانے سے بھی قاصر تھا اور اگر کوئی اس سلسلے میں میری مدد بھی کرتا تھا تو جسم کے نچلے حصے میں درد نا قابل برداشت ہو جاتا تھا۔

میرے سینے پر چار اور پیٹھ پر دو زخم تھے۔ خوش قسمتی سے یہ زخم گہرے نہیں تھے اور ایک ہفتے میں مندمل ہوگئے۔ حملے کے دوران بچنے کی کوشش میں بایاں گھٹنا کچھ اس طرح مُڑا تھا کہ فریکچر نہ ہونے کے باوجود میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ زیادہ اذیت کا سامنا اندرونی چوٹوں کے باعث تھا۔ ایسے میں پیشاب کرنا ایک اذیت ناک مرحلے سے گزرنے کے مترادف تھا۔ کبھی کبھی تکلیف اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ میں اللہ سے موت کا طلبگار ہونے لگتا تھا۔

تین ہفتوں کے بعد میں اس قابل ہو سکا کہ کچھ دیر کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں۔ جس طرح بچے چلنا سیکھتے ہیں، بالکل اسی طرح میں نے خود کو چلنا سکھایا۔ ابتدا میں اپنے طور پر اور بعد میں دوسروں کی مدد سے۔ صحیح طریقے سے کھڑا ہو کر چلنا میرے لیے ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ کمزوری آج بھی پائی جاتی ہے۔ باقاعدہ مشق کرنے سے اپنے چھوٹے سے کیبن کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانے کے قابل ہو پایا۔ تین ہفتوں کے بعد میں کسی کی مدد کے بغیر باتھ روم تک جانے کے قابل ہو گیا۔

مکتی باہنی سے تعلق رکھنے والے بہت سے نوجوان وقتاً فوقتاً میرے کیبن میں آدھمکتے تھے۔ یہ بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ وہ گارڈز کو دھکیل کر میری طرف آتے، مجھ پر ایک نظر ڈالتے اور چلے جاتے۔ یہ بات تو واضح تھی کہ وہ اپنے ان ساتھیوں سے کچھ خوش نہیں تھے جو مجھے ختم کرنے میں ناکام رہے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی ادھورے کام کو مکمل کرنے پر نہ تُل جائے! میرے لیے لازم تھا کہ کیبن کا دروازہ بیشتر اوقات بند ہی رکھوں۔

میری اہلیہ اور بچے روزانہ سہ پہر کے وقت مجھ سے ملنے آتے تھے۔ چند رشتہ دار، یونیورسٹی کے ایک ساتھی ڈاکٹر عزیز الحق اور اسلامیہ کالج، کلکتہ کے زمانے کے ایک شناسا سعید الرحمٰن بھی

مجھ سے ملنے آجایا کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے بیشتر رشتہ دار میری عیادت کے لیے آتے ہوئے خوفزدہ رہتے تھے۔

میں کیبن نمبر وس ہی میں تھا کہ ایک دن گھنے بالوں والا ایک نوجوان آیا اور میرے پیر چھو لیے۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ میرا شاگرد تھا۔ میں اب اس کا نام بھول گیا ہوں۔ اس نے بتایا کہ خانہ جنگی کے دوران اسے حکم دیا گیا تھا کہ مجھے ختم کر دے۔ اس نے میرے گھر کے آس پاس کے ماحول کا جائزہ بھی لیا تھا مگر بعد میں ارادہ بدل دیا۔ وہ خاصا شائستہ مگر مضبوط ارادے کا مالک دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ان تمام لوگوں کو ختم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا جنہوں نے ۲۳ سال کے دوران مغربی پاکستان سے کسی بھی سطح پر تعاون کیا تھا۔ میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا تاہم اتنا ضرور کہا کہ اپنے پروگرام پر عمل کرنا ان کے لیے آسان نہیں۔ اس پر وہ بولا ''خانہ جنگی میں ۲۰ ہزار سے زائد افراد مارے گئے ہیں۔ یہ سب مکتی باہنی کے ارکان تھے۔ ہم 'غداروں' کے ساتھ نہیں جی سکتے۔''

مجھ سے ملنے آنے والوں میں ایک نوجوان ایسا بھی تھا جس کے آنے پر مجھے اپنے جسم میں خوف کی لہر محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا محسوس ہوتا تھا، جیسا کہ جنونی قاتلوں کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے! ایک بار وہ چند خواتین کے ساتھ آیا اور جب میں نے پوچھا کہ خواتین کون ہیں تو اس نے کہا ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس ملک کو آزادی دلائی ہے۔''

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو جو کچھ ہوا اس کے بارے میں اس وقت بھی تمام نوجوانوں کے خیالات یکساں نہیں تھے۔ دسمبر کے آخر میں ایک شرمیلا سا نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ اس کی عمر ۱۷ سال ہوگی۔ وہ انگریزی ادب پڑھنے کا خواہش مند تھا تاہم اب اس کا خیال یہ تھا کہ اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ وہ کہہ رہا تھا ''ہم اپنی آزادی سے محروم ہو گئے ہیں۔'' جب میں نے آزمانے کے لیے اسے دوسرے بہت سے نوجوانوں کے خیالات کے بارے میں بتایا تو وہ بولا ''چاروں طرف بھارتی فوجیوں کی موجودگی میں، پاکستانی فوج کی جانب سے ہتھیار ڈالنے سے بھی بنگلہ دیش کو آزادی نہیں ملی۔ ہم نے اپنے قومی وجود کو غلامی کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔''

یہ نوجوان اس دور کے نوجوانوں کی عمومی سوچ سے متصادم خیالات رکھتا تھا۔ بھارتی پروپیگنڈا

اس قدر مستحکم تھا کہ میرے بعض رشتہ داروں کے ذہن بھی آلودہ ہو گئے تھے حالانکہ ان کے لیے میری زندگی کھلی کتاب کی مانند تھی۔ میں رات دن اُن سے رابطے میں تھا مگر اس کے باوجود انھوں نے میرے بارے میں بیان کی جانے والی تمام باتیں بڑی سادگی سے قبول کر لی تھیں۔

ایک دن میرے ایک کزن کا بیٹا میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ کس طرح میری رضامندی سے آرمی کو لڑکیاں فراہم کی جاتی تھیں! اس نے کہا کہ وہ اس کہانی پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں، تاہم اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس بات کو مکمل طور پر بے بنیاد قرار دینے کے لیے بھی ذہنی طور پر آمادہ نہیں! میں اس کی سادہ لوحی پر صرف حیرت کا اظہار ہی کر سکتا تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں معاشیات پڑھی تھی اور وہ اعداد وشمار کی مدد سے بتاتا تھا کہ کس طرح مغربی پاکستان کے سرمایہ دار مشرقی پاکستان کا شدید استحصال کرتے رہے تھے۔ اس کا کہنا تھا ''جو مظالم ڈھائے جاتے رہے ہیں، ان کا آپ اور میرے والد جیسے لوگوں کو یقین دلانے کے لیے خانہ جنگی تک کرنی پڑی ہے۔ اب جبکہ مغربی پاکستان کا طوق گلے سے اتار پھینکا گیا ہے، آپ لوگ دیکھیں گے کہ بنگلہ دیش کس تیزی سے ترقی اور استحکام کی منازل طے کرتا ہے۔'' میں نے اسے بتایا کہ ملک اس وقت جس بحران سے گزر رہا ہے، اس کا جلد از جلد خاتمہ ہی قوم کے حق میں بہتر ہے تاہم میں اس کی کھوکھلی رجائیت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اُسے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ جس اذیت سے میں دوچار ہوں، اس نے بھی میرے خیالات اور عقائد کو متزلزل نہیں کیا!

متحدہ پاکستان پر یقین رکھنے والوں پر مظالم اور ان کے قتل سے متعلق خبریں مجھ تک پہنچتی رہیں۔ مہنگائی غیر معمولی حد تک بڑھ گئی تھی۔ اندھا دھند گرفتاریاں جاری تھیں اور قانون نام کی چیز ناپید سی ہو کر رہ گئی۔ ہم جیسے چند لوگوں کے سوا حالات کی خرابی سے کوئی بھی بدگمان اور مایوس نہ تھا۔ سب کا خیال یہ تھا کہ بنگلہ دیش جن حالات سے دوچار ہے اور جو طویل خانہ جنگی ہوئی ہے، اس کے باعث کچھ مدت کے لیے تو نراجیت پھیلے گی مگر رفتہ رفتہ سب کچھ خود بخود درست ہو جائے گا۔ خانہ جنگی کی اصطلاح کم کم ہی استعمال ہوتی تھی۔ ۱۹۷۱ء کے مارچ سے دسمبر تک جو کچھ ہوا، اسے آزادی کی جنگ قرار دیا جاتا رہا۔ پاکستانی فوج کو قابض فوج قرار دیا گیا اور جو سیدھے سادے نوجوان اس کے خلاف لڑے، انہیں آزادی کے سپاہی کہا گیا۔

عوامی لیگ کے جو حمایتی خانہ جنگی کے دوران کم کم منظرِ عام پر آئے تھے، اب بڑی تعداد میں گھروں سے نکلنے لگے تھے۔ پاکستانی فوج سے لڑنے والوں کا استقبال کیا جارہا تھا اور مرنے والوں کو شہید قرار دے کر ان کی یادگاریں تعمیر کی جارہی تھیں۔ مارچ سے دسمبر تک جو نوجوان بھی مارا گیا وہ خواہ کسی بھی پس منظر کا حامل رہا ہو، خواہ اس کا مجرمانہ ریکارڈ بھی موجود ہو، ذاتی کردار چاہے کچھ بھی ہو، اگر اس کا تعلق کسی بھی مرحلے پر پاکستانی فوج کے خلاف جاری لڑائی سے رہا ہو، تو یہی بات اُسے شہید قرار دینے کے لیے کافی تھی اور اہلِ وطن کا فرض تھا کہ اسے ہمیشہ یاد رکھیں۔ یہ سب بہت عجیب تھا۔ مگر جس سرزمین پر جنون کی حکومت قائم ہو چکی تھی، وہاں ہوش اور عقلِ سلیم کی بات کون کرتا؟

قوم کی جانب سے مرنے والوں سے تشکر کے اظہار کا ایک سستا، آسان اور مقبول طریقہ یہ بھی تھا کہ سڑکوں، پارکوں، اسکولوں، کالجوں اور دیگر اداروں کو ان سے موسوم کردیا جائے۔ اس معاملے میں عقلِ سلیم سے کام لینے یا روایت کا احترام کرنے کی ذرا بھی زحمت نہیں کی گئی۔ جناح، اقبال اور ایوب خان جیسے نام نئی نسل کے لیے قابلِ نفرت ٹھہرے اور ان ناموں سے چھٹکارا پانے میں تاخیر نہیں کی گئی۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبا اس معاملے میں سب پر بازی لے گئے۔ جناح ہال اور اقبال ہال کو سارجنٹ ظہور الحق اور سوریہ سین سے موسوم کردیا گیا۔ سارجنٹ ظہور الحق وہ نوجوان تھا جو اگرتلہ سازش کیس میں گرفتار ہونے کے بعد سماعت کے دوران ہی ہلاک کردیا گیا تھا۔ سوریہ سین وہ دہشت گرد تھا جس نے ۱۹۳۰ء کے عشرے میں چاٹگام کی آرمری پر حملے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس کا نام نوجوانوں میں جوش پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ لفظ اسلام اور اس سے مشتق دیگر الفاظ سے بھی گلوخلاصی کی کوشش کی گئی۔ اسلامک انٹرمیڈیٹ کالج کو (جس سے وہ مدرسہ بھی ملحق تھا جہاں مجھے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تھا) راتوں رات ''کوی نذرل کالج'' میں تبدیل کردیا گیا۔ ایک عظیم ادبی شخصیت (قاضی نذرالاسلام) کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک ایسے تعلیمی ادارے کا انتخاب کیا گیا جس کے نام میں اسلام بھی تھا اور مدرسہ بھی۔ ایمانی سوچ رکھنے والوں کے لیے یہ سب کس قدر سوہانِ روح رہا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا مشکل

نہیں۔ یہ نئی اشرافیہ کی ثقافت کی پستی کا آئینہ دار تھا۔

اداروں کے نام تبدیل کرنے سے متعلق اعلانات روزانہ کیے جاتے تھے۔ میں جب اس قسم کی خبریں پڑھتا تو بہت دکھ ہوتا تھا۔ ایک تو اس بات پر کہ روایات کا احترام نہیں کیا جا رہا تھا اور دوسرے یہ کہ بلاوجہ غیر معمولی عجلت کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ یہ سوچ کس قدر احمقانہ تھی کہ چند نام تبدیل کرنے سے لوگوں کے جذبے اور روح کو تبدیل کیا جا سکے گا!

یہ بات قابل غور تھی کہ کہیں بھی ہندو اور عیسائی نام تبدیل نہیں کیے جا رہے تھے۔ ناٹرے ڈیم کالج، سینٹ گریگوریز اسکول اور رام کرشنا کے نام سے قائم تعلیمی اداروں کو فرقہ واریت کی ہوا بھی نہیں لگنے دی گئی۔ اسلام کے خلاف امتیاز اس حد تک برتا گیا کہ بعد میں اس پر خود عوامی لیگ کے حلقوں نے احتجاج کیا!

مشکل وقت میں میرے خاندان کے علاوہ چند لوگ ہی تھے جو میرا ساتھ دیتے رہے اور ان کے خیالات میں میرے لیے کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہوئی۔ جن چند لوگوں نے غیر معمولی حد تک میرا ساتھ دیا، ان میں ایک ہماری سابق گھریلو ملازمہ کا بیٹا مختار بھی تھا۔ مختار کو میں بچپن ہی سے جانتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ بن جائے، کچھ کر دکھائے۔ جب وہ بیس اکیس سال کا ہوا تو میں نے اسے راج شاہی یونیورسٹی میں نوکری دلا دی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ مجھ پر حملہ ہوا ہے تو وہ دوڑا چلا آیا اور نوکری کی پروا کیے بغیر ایک ماہ تک میرے پاس ٹھہرا رہا اور میری خبر گیری کرتا رہا۔ یہ سب کچھ میری توقع سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مختار مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے مضبوط کاندھوں کا سہارا لے کر ہی میں نے دوبارہ چلنے کی مشق کی۔

میری اہلیہ اور بچے مجھ سے روزانہ ملنے آتے۔ یقیناً یہ میرے لیے بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو نئے سرے سے دریافت کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ بچے صرف رسمی طور پر اپنا فرض جان کر ملنے آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری عیادت کو آنا ان کی جانب سے بھرپور محبت کا مظہر تھا۔ اس حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے میرے پاس موزوں الفاظ نہیں۔ تاہم میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ ان کا آنا میرے اعصاب، روح اور قلب کو سکون کی دولت فراہم کرتا تھا۔ ان کی آمد سے بعض ایسے جذبات بیدار ہو

جاتے تھے جو میرے لیے سوہانِ روح بھی بن جایا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس قدر محبت کے قابل ہونے کے لیے مجھے جو کچھ کرنا چاہیے تھا، وہ میں نے نہیں کیا تھا۔ ماضی میں، میں نے بارہا خودغرضی کا مظاہرہ کیا تھا اور ان کے مقابلے میں اپنی ذات پر زیادہ خرچ کیا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دکھاوا کرتے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ دکھاوا کرنے والے بھی مجھ سے کہیں زیادہ اپنے اہلِ خانہ پر خرچ کرتے ہوں گے۔ میرے گھر والے اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ وہ دوسروں سے زیادہ ملتے جلتے نہیں تھے اور اس کا سبب تکبر نہیں تھا۔ ہم میں ایسا تھا ہی کیا کہ تکبر کرتے؟ بات یہ ہے کہ ہمارے اردگرد کی دنیا جس تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی، اس سے ہم آہنگ ہونا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ میری اہلیہ اور ہماری بیٹیاں ایسے پودوں کی طرح تھیں جن کی نگہداشت عمدگی سے کی گئی ہو اور اب گملوں سے باہر کا ناموافق ماحول ان کے لیے پریشان کن ثابت ہو رہا ہو۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو اٹھتا تھا کہ وہ ایسے ماحول میں کس طرح اپنی بقا کا اہتمام کر پائیں گی؟ زندگی کے نئے سانچے میں اپنے آپ کو کیسے ڈھالیں گی۔ معاشرے کا تصنع ان کے لیے حیران کن تھا۔ اس دور میں ڈھنگ سے جینے کے لیے انسان کو جو چالاکی اور بازی گری درکار تھی، اس سے یہ ناواقف تھیں۔ ان تمام امور کے بارے میں سوچ سوچ کر میں پریشان ہو جاتا تھا۔

میرے ایک بزرگ رشتہ دار نے مجھے بتایا کہ پاکستان سے شیخ مجیب الرحمٰن کی واپسی پر شاید مجھے معافی دے دی جائے۔ شیخ مجیب اس وقت تک پاکستان کی قید میں تھے۔ یہ جنوری ۱۹۷۲ء کے پہلے ہفتے کی بات ہے۔ میرے بزرگ رشتے دار کمزور دل کے مالک تھے۔ میری حالت دیکھ کر وہ رو پڑے اور اپنے آنسو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں بہت متاثر ہوا۔ مگر یہ بزرگ میری گرفتاری یا حراست کے خلاف ہائی کورٹ میں دائر کی جانے والی درخواست پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کرنے سے کئی ماہ تک انکار کرتے رہے! ہے نا حیرت کی بات! کیا جنوری کے شروع میں انہوں نے جو ٹسوے بہائے وہ یونہی تھے؟ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بزرگ اتنے اچھے اداکار ہوں گے! مگر خیر زندگی تو نام ہی ان حیرت انگیز باتوں اور تضادات کا ہے۔

نئے جنم لینے والے بنگلہ دیش کے لیے شیخ مجیب الرحمٰن بابائے قوم تھے۔ انہیں راولپنڈی جیل سے ۹ جنوری ۱۹۷۲ء کو رہا کیا گیا اور اگلے ہی دن وہ لندن سے ہوتے ہوئے ڈھاکا پہنچ گئے۔ رائل ایئرفورس کا طیارہ جب انہیں لے کر ڈھاکا کے تیج گاؤں ایئرپورٹ پر اُترا، تو ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ پریس کا اندازہ تھا کہ ان کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ پر پانچ لاکھ سے زائد افراد جمع ہوئے ہوں گے۔ ایئرپورٹ سے وہ رمنا ریس کورس گراؤنڈ گئے جہاں ہزاروں افراد انہیں سننے کے لیے بے تاب تھے۔ میں نے اپنے کیبن میں ایک چھوٹے سے ریڈیو پر ان کی تقریر اور جلسے کا احوال سنا۔ لوگ نئی نئی آزادی کے نشے میں چُور تھے۔ ریڈیو پر ان کی آوازیں اُن کے جذبات کا پتا دے رہی تھیں۔ مشکل حالات کو شکست دے کر فتح پانے کی خوشی ہر شے سے جھلک رہی تھی۔

میں ریڈیو سے کان لگائے شیخ مجیب الرحمٰن کی تقریر کا ایک ایک لفظ سننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس تقریر کو سُن کر ہی مجھے اندازہ ہوا کہ آنے والے دنوں میں حالات کیا رُخ اختیار کرنے والے ہیں۔ یہ تقریر ایک ایسے لیڈر کی تھی جس نے اپنے دھڑے کو کامیابی سے ہمکنار کرایا تھا اور اب مخالفین کو سبق سکھانے کے لیے بے تاب تھا۔ مخالفین کو عام معافی دیے جانے کے بارے میں اس تقریر میں ایک لفظ بھی نہ تھا۔ اس کے بجائے انہوں نے پاکستان میں اپنے مقدمے کی سماعت کے دوران گواہ کی حیثیت سے سامنے آنے والوں کا ذکر کیا۔ وہ عام معافی کے موڈ میں ہرگز نہ تھے۔ جو ہوا، اسے بھلا کر ملک کی تعمیرِ نو کے بارے میں سوچنے کے رجحان کو پروان چڑھانے پر دھیان نہیں دیا جا رہا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے پاکستانی فوج کے بارے میں دل کے پھپھولے پھوڑے اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ میں نے خود سے پوچھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے وفاق پسندوں اور علیحدگی پسندوں کے درمیان خانہ جنگی میں فتح تو حاصل کر لی مگر ان کی شخصیت کے اندر وہ لیڈر کہاں ہے جو ماضی میں ان کے کردار کے علی الرغم نئے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے درکار ہے؟ ملک اور قوم نے انہیں ایک دھڑے کے سربراہ سے بلند کر کے قوم کا لیڈر بنا دیا تھا مگر وہ موقع کی مناسبت سے اپنا قد بلند کرنے میں ناکام رہے۔ انہوں نے مکتی باہنی کے چھاپہ ماروں سے ہتھیار پھینکنے کی اپیل تو کی مگر اس یقین دہانی کے ساتھ کہ دشمنوں

کا صفایا کرنے کی ذمہ داری اب باضابطہ فورسز کے حوالے کر دی جائے گی۔ صاف ظاہر تھا کہ جنہیں وہ ملک وقوم کا دشمن سمجھتے تھے، اُنہیں عام معافی نہیں دی جائے گی اور نہ قومی سطح پر مصالحت اور مفاہمت کے ایجنڈے کو آگے بڑھایا جائے گا۔ تقریر میں شیخ مجیب الرحمٰن نے پاکستان میں اپنے خلاف مقدمے کا حوالہ دے کر یہ اشارہ دے دیا تھا کہ عوامی لیگ اور خود ان کے خلاف جانے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا، کم لوگ ہی بچ پائیں گے اور بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ کم ہی لوگ بچ پائے۔ ہزاروں افراد کو گرفتار کر کے ان پر جنگِ آزادی کی راہ میں روڑے اٹکانے کے بے بنیاد الزامات عائد کیے گئے۔ جنوری میں نافذ کیے جانے والے کولیبوریٹر آرڈر کے تحت پولیس کو کسی بھی شخص کو بغیر کسی الزام کے گرفتار کرنے کا اختیار مل گیا۔ کسی بھی شخص کو گرفتار کرنے کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ اس کے بارے میں افواہ ہی کے طور پر یہ مشہور کر دیا جائے کہ وہ جنگِ آزادی کا مخالف اور پاکستانی فوج کا حامی تھا۔ سزائیں فوری طور پر دی جارہی تھیں۔ وہ خوش قسمت تھے جنہیں ڈھاکا جیل میں ڈال دیا گیا۔ جبکہ بہت سوں کو گرفتاری کے فوراً بعد کوئی مقدمہ چلائے بغیر ہی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ کئی ایسے بھی تھے جنہیں مشتعل ہجوم نے مار ڈالا۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ ''سونار بنگلہ'' کی تعمیر وترقی کے کام میں مصروف ہو جانے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ گویا انتباہ تھا کہ مزید خون خرابہ ملک کے لیے تباہی لائے گا۔ مگر یہ بات کرتے وقت شیخ مجیب الرحمٰن نے بظاہر ان لوگوں کو اپنے ذہن سے نکال دیا جو ان کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہوں یا معاملات کی ذہنی تصویر پیش کر رہا ہوں؟ جب انہوں نے اپنے خلاف مقدمے کا ذکر کیا تو واضح اور دوٹوک انداز سے جتا دیا کہ جن لوگوں نے عوامی لیگ کی مخالفت کی، وہ ایک الگ طبقہ تصور کیے جائیں گے۔ بعد کی قانون سازی، گرفتاریوں اور مخالفین کو موت کے گھاٹ اتارنے کے واقعات نے ثابت کیا کہ میرے ذہن میں ابھرنے والے خدشات کسی طور پر بے بنیاد نہ تھے۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں جو کچھ ہوا، اس کی روشنی میں جب میں مستقبل کے بارے میں سوچتا تھا تو لرز کر رہ جاتا تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ (مکتی باہنی کے) چھاپہ ماروں کی پیاس ابھی پوری طرح

بجھی نہیں تھی۔ ملک کے ساتھ ساتھ میں اپنے لیے بھی بہت پریشان تھا۔ میرے اغوا کے دو ایک دن بعد رات کے دو بجے میرے گھر پر چھاپہ ماروں کے ایک گروہ نے پھر حملہ کیا تھا۔ مجھے اس کی تفصیلات نہیں بتائی گئیں مگر جو کچھ بتایا گیا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چھاپہ ماروں نے میری بیوی کو فون کر کے کہا کہ انہیں یہ معلوم ہے کہ ہم لوگوں نے کچھ اور مخالفین کو چھپا رکھا ہے۔ بچے بہت خوفزدہ تھے۔ گینگ کے آنے سے قبل ہی بچوں کو پڑوسیوں کے ہاں بھیج دیا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ میری بیوی نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے انہیں رشوت دی۔ کتنی رقم دی گئی، یہ مجھے اب تک نہیں بتایا گیا۔

ایک پولیس پارٹی نے میرے کزن، سیاست دان اور مصنف قمرالاحسن کو گرفتار کرنے کے لیے ہمارے گھر پر چھاپہ مارا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ انہوں نے پولیس کی آمد پر خود کو ایک چھوٹے سے اسٹور میں بند کرلیا جس میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ پولیس نے پورا گھر چھان مارا، سب الٹ پلٹ دیا، بہر حال پکڑے گئے۔

میرے ایک اور کزن منظور الاحسن کی گرفتاری کے لیے بھی پولیس نے چھاپہ مارا۔ وہ نظامِ اسلام پارٹی کے رکن تھے۔ منظور الاحسن روپوش ہو گئے تھے، اس لیے پولیس نے ان کے بڑے بھائی ایس فخرالاحسن کو گرفتار کرلیا، جن کی عمر ساٹھ سال تھی۔ وہ وکیل تھے اور انہوں نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا۔ میری گرفتاری کے بعد وہ اور ان کے اہل خانہ نئے قانون کے ساتھ تھے، میرے گھر والوں کے بارے میں انہوں نے مخاصمانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ خانہ جنگی کے دوران لوگ کس طرح رشتوں کو بھول گئے، یہ اس کی ایک اور نمایاں مثال تھی۔ میرے یہ تمام کزن میری اہلیہ کے بھائی بھی تھے۔

فخرالاحسن کو میری کار میں پولیس اسٹیشن لے جایا گیا تھا۔ یہ کار میرے استعمال میں رہتی تھی، بس پولیس کے لیے اسے ضبط کرنے کے سلسلے میں اتنا ہی جواز کافی تھا۔ میری اہلیہ نے نصف درجن درخواستیں دیں تب کہیں جا کر ڈیڑھ دو مہینے بعد یہ کار واپس ملی۔ یہ بھی مقدر کی بات تھی کہ یہ کار میری اہلیہ کے نام پر خریدی اور رجسٹر کی گئی تھی۔

قمرالاحسن کی گرفتاری کے بعد گھر میں کوئی بھی ایسا شخص نہ رہا جو مشکل گھڑی میں میرے

گھر والوں کے کام آسکتا یا میری اہلیہ مدد یا مشاورت کے لیے جس کے پاس جاسکتیں۔ ہم کس قدر خطرناک اور غیر دوستانہ ماحول میں جی رہے تھے، اس کا اندازہ پریس میں شائع ہونے والی خبروں سے بھی لگایا جاسکتا تھا۔ ۱۰ ارجنوری کو شیخ مجیب الرحمٰن بنگلہ دیش آئے اور اسی دن ایک مشہور اور بااثر بنگالی اخبار ''دینک بنگلہ'' نے یہ خبر شائع کی کہ میں نے ۱۹۷۱ء میں یورپ کے دورے کے لیے پیسے وصول کیے تھے۔ ثابت صرف یہ کرنا تھا کہ میرا تعلق 'غداروں' سے ہے۔ اخبار نے اس سلسلے میں ایک دستاویز کو بھی غلط انداز سے پیش کیا تھا۔ میڈیکل کے چند طلبا نے اس خبر کی بنیاد پر میرا مذاق اڑایا۔ اس نوعیت کی خبروں سے اسپتال میں میرے لیے ماحول مزید خراب ہوگیا۔ کبھی کبھی نوجوان ٹولیوں کی شکل میں میرے کیبن کے آس پاس منڈلاتے اور مجھے دھمکیاں دیتے۔ ایک دن میری حفاظت پر مامور پولیس افسر نے بتایا ''ایک دن ایک شخص نے، جو نشے میں مدہوش دکھائی دے رہا تھا، میری رائفل چھیننے کی کوشش کی۔ وہ کیبن میں آپ کو اور آپ کے بچوں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔''

۱۹۷۴ء ۔ واقعی دو وزرائے اعظم ۔ اِدھر ذوالفقار علی بھٹو اور اُدھر شیخ مجیب الرحمٰن

تیسرا باب

چاروں طرف بغاوت اور انتشار

خانہ جنگی کے دوران بھارت چلے جانے والے دانشوروں، اساتذہ، طلبا، صحافیوں، ڈاکٹروں اور انجینئروں نے جنوری کے وسط تک وطن واپسی شروع کر دی۔ ان میں چاٹگام یونیورسٹی میں شعبہ بنگالی کے سربراہ ڈاکٹر علی احسن اور ڈاکٹر اے آر ملک بھی شامل تھے۔ یہ دونوں میرے دوست تھے اور علی احسن تو میرے کزن بھی تھے اور ان کی پرورش میرے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی میرے بارے میں پوچھنے یا مجھ سے ملنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ آخر ہم خانہ جنگی کے دوران دو مختلف کناروں پر جو رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ پروفیسر علی احسن نے کلکتہ میں ریڈیو کی نشریات کے دوران میری ذات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ مجھے جس بات سے زیادہ تکلیف پہنچی وہ ڈھاکا واپسی پر ان کا رویہ تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ انہوں نے بلاوجہ (جبکہ کسی نے ان سے مدد مانگی ہی نہیں تھی) یہ بھی کہا کہ وہ کسی بھی 'غدار' کی مدد نہیں کریں گے۔ علی احسن سے ملنے کے بعد مجھ سے ملاقات کرنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ میرے موجودہ برے حالات کے لیے چند احباب بھی ذمہ دار تھے جنہوں نے مجھے غلط مشورے دیے تھے۔ انہوں نے جن دوستوں کے نام بتائے، ان سے میرے قریبی تعلقات تھے، بالکل ویسے ہی جیسے پروفیسر علی احسن سے تھے۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ ان صاحب نے جو کہانی سنائی تھی وہ سراسر جھوٹ تھی۔ اگر میں یقین کر لیتا تو میرے وہ تمام دوست آج جیل میں ہوتے۔

دِگرگوں سیاسی صورت حال میں خود کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے والی صف میں رکھنے کے لیے پروفیسر علی احسن نے جو کچھ کیا، وہ قابل فہم تو تھا مگر ہاں حیرت ضرور ہوئی۔ علی احسن سے میری آخری ملاقات مارچ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں نارائن گنج میں ان کے برادر نسبتی عبدالعلی کے گھر پر ہوئی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی ان کا یہ

بھی خیال تھا کہ یہ سب پاکستان کے لیے کسی طور سودمند نہیں ہوگا۔ وہ بہت شاطر، بات بات پر بپھر جانے والے اور اصولوں کو خاطر میں نہ لانے والے انسان تھے۔ وہ کانگریس فار کلچرل فریڈم اِن پاکستان کے چیف آرگنائزر رہ چکے تھے۔ اس امر کی تصدیق کے بعد کہ کانگریس کی اِس پاکستانی شاخ کو سی آئی اے سے فنڈ ملتے تھے، اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تاہم علی احسن نے بائیں بازو کی جماعتوں کی مخالفت کے باوجود اپنے ''کاز'' کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ یہ علی احسن ہی تھے جنہوں نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد رابندر ناتھ ٹیگور پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ بعد میں جب صورتِ حال بدلی تو انہوں نے بھی پلٹا کھایا اور اس بات پر زور دیا کہ مشرقی پاکستان کی تمام جامعات میں بنگالی کو تدریس کا ذریعہ بنایا جائے۔ سب کو پتا تھا کہ وہ کس قماش کے انسان تھے اور میں بھی جانتا تھا۔ ان کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی تمنا کی جاسکتی تھی وہ مستقل مزاجی تھی۔ انہیں کسی بھی معاملے میں موقف اور پینترے بدلنے کا ہنر آتا تھا اور ہوا کے رخ میں کسی بھی تبدیلی کا وہ پہلے سے ہی اندازہ لگا لیتے تھے۔ مگر اپنے ماضی کو مکمل طور پر مسترد کر دینا اور یہ کہنا کہ (متحدہ) پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ سب کچھ غلط تھا، انتہائی حیرت کی بات تھی۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ انہیں کسی بھی اصول کی کبھی پروا نہیں رہی۔ پھر بھی ان کے اس طرح پلٹا کھانے سے مجھے بہت حیرت ہوئی۔

میری تاریخ اور نفسیات پر اچھی نظر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بحرانی کیفیت میں لوگ پریشانی اور مصیبت سے بچنے کے لیے اپنی بات سے پھر جاتے ہیں اور دروغ گوئی سے بھی کام لیتے ہیں۔ کبھی وہ ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا لیتے ہیں۔ مگر بات بات پر چولا صرف موقع پرست اور خود غرض لوگ ہی بدلتے ہیں۔ وہ جس کشتی میں سوار ہوتے ہیں، اسی میں سوراخ کرتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کن حالات میں فرار ہو کر بھارت میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ میرے خیال میں ان کے ریکارڈ میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو انہیں (پاکستانی) فوج کے غیظ و غضب کا نشانہ بناتی۔ تو کیا انہوں نے اپنے وائس چانسلر ڈاکٹر اے آر ملک کی ایما پر بھارت میں پناہ لی تھی اور یہ محسوس کر لیا تھا کہ فوج خانہ جنگی ختم کرنے اور ملک کو متحد رکھنے میں کامیاب ہو جائے گی؟

لوگوں کو اگرتلہ میں ہجرت کر جانے کی تحریک اور ترغیب دینے والے ڈاکٹر اے آر ملک

ابتدا ہی سے ذہنی طور پر عوامی لیگ کے ساتھ تھے۔ بنگلہ قوم پرستی کے نشے میں چُور ڈاکٹر ملک کا خیال تھا کہ بنگال باقی پاکستان سے یکسر مختلف تھا اور یہ فرق ثقافتی سطح پر بھی نمایاں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۰ء میں کراچی میں ایک موقع پر بحث و مباحثہ کے دوران جب میں نے انہیں پاکستانی حکمرانوں پر تابڑ توڑ حملے کرتے دیکھا تو ان سے براہ راست پوچھ بیٹھا کہ کیا وہ بھی ملک کی تقسیم چاہتے ہیں؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ پتا نہیں کہ انہوں نے یہ جواب اخلاص سے دیا تھا یا پھر محض مجھے چکر دینے کی کوشش کی تھی۔ گلے شکوے ایک طرف، سچ تو یہ ہے اور اس حقیقت سے وہ خود بھی انکار نہیں کر سکتے کہ دوسرے ہزاروں بنگالیوں کی طرح ان کا موجودہ مقام بھی پاکستان کا ہی مرہون منت تھا۔ پاکستان کے بغیر وہ ایک عام سے سول سرونٹ کی حیثیت سے یا پھر کالج لیکچرر کے منصب سے ریٹائر ہو جاتے۔ مگر اب وہ وائس چانسلر تھے۔ اب ان کے پاس گہرا اثر و رسوخ اور ایک بلند سماجی حیثیت تھی۔ متحدہ ہندوستان میں تو وہ یہ سب کچھ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ظاہر ہے ہندوؤں سے براہ راست مسابقت کی صورت میں وہ کسی قابل ذکر مقام تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

عوامی لیگ میں اپنے دوستوں کو پاکستان کے مفادات کے خلاف کچھ کرنے سے باز رہنے کی تحریک دینے کے بجائے انہوں نے غیر ملکی سرزمین میں رہ کر پاکستانی فورسز اور حکومت کے خلاف قوت جمع کرنے کا کام جاری رکھا۔ کیا زوال تھا! کیا المیہ تھا! اور کیا بے بصیرتی تھی! یہ کیسے ممکن تھا کہ تاریخ کا ایک طالب علم، جس نے انیسویں صدی میں ہندوؤں کے تسلط میں بنگالی مسلمانوں کے حال زار کے بارے میں کتابیں لکھی ہوں، وہ اس بات پر ایمان لے آئے کہ پاکستان سے کٹ کر بنگالی مسلمان بھارتی اثر کے تحت بہتر معیارِ زندگی پا سکیں گے۔ ڈاکٹر ملک ایسے انسان نہیں تھے جو معاشیات یا تاریخ کا علم نہ رکھتے ہوں یا جن کا موقف اخباری بیانات اور نعروں کا نتیجہ ہو۔ پھر انہوں نے سب کچھ کیسے بھلا دیا اور اپنی تعلیم اور پس منظر کے منافی مؤقف کیسے اختیار کر لیا۔ میں یہ سب کچھ سمجھ نہیں پایا۔

علی احسن نے جس نوعیت کا غیر دوستانہ رویہ اپنایا تھا، ویسا ہی ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری نے بھی اختیار کیا۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد انہیں ڈھاکا یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ یہ تقرر تمام

قواعد وضوابط کو بالائے طاق رکھ کر کیا گیا تھا۔ مجھے برطرف کرنے کے رسمی اعلان کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی۔ مجھے درمیان سے ایسے ہٹایا گیا کہ جیسے میرا وجود ہی نہیں تھا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ جارج آرویل نے اپنے ناول "1984" میں جو کچھ لکھا تھا وہ آج عملی شکل بھی اختیار کر گیا تھا۔ سرکاری سطح پر اعلان کیا گیا کہ ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری نے ابوسعید چوہدری سے چارج لے لیا ہے، جبکہ انہوں نے مارچ ۱۹۷۱ء میں آرمی کریک ڈاؤن سے قبل ہی استعفیٰ دے دیا تھا۔ میں نے اپنے سابق ساتھی ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری کو خط لکھ کر وائس چانسلر کا منصب سنبھالنے پر مبارک باد دی اور لکھا کہ میرے اہل خانہ کو وائس چانسلر کی سرکاری رہائش گاہ سے تمام سامان لے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ مجھے اپنے خط کا کوئی جواب نہیں ملا۔ میرے اہل خانہ سے عجلت میں رہائش خالی کرالی گئی۔ فرنیچر، برتن اور کچن کا دوسرا سامان وہیں رہ گیا اور میں نے جو کتابیں ۳۵ برس میں جمع کی تھیں وہ بھی وہیں رہ گئیں۔ میرے لیے اس سے بڑا نقصان کیا ہوسکتا تھا؟ حد تو یہ ہے کہ میرے اہل خانہ نے ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے بات ہی نہیں کی۔ جب میری بیٹیاں ان سے ملنے گئیں تو ان کے سیکرٹری نے (جو ظاہر ہے میرا ماتحت بھی رہ چکا تھا) انہیں ملنے نہیں دیا اور اس معاملے میں اپنی بے بسی ظاہر کی۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں سرکاری رہائش گاہوں کی دیکھ بھال اور مرمت پر مامور انجینئر نے میرے اہل خانہ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سامان کی فہرست بنائے بغیر کچھ بھی نہیں لے جایا جاسکتا۔ یہ معاملہ طول پکڑتا گیا اور اسی میں تین ماہ گزر گئے۔ جب ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری تین ماہ بعد نوکری چھوڑنے پر مجبور ہوئے تب کہیں جا کر سامان واپس مل سکا تاہم بہت سی چیزیں (جن میں کتابیں نمایاں ہیں) اب بھی واپس نہیں ملیں۔

ایک دن ایک پولیس انسپکٹر آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا میں وائس چانسلر کے پرسنل سیکرٹری کے کسی پستول کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ سیکریٹری ہندوستان بھاگ گیا تھا۔ میں انسپکٹر کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وائس چانسلر کے پرسنل سیکرٹری نے ایک بستر باندھ کر وائس چانسلر آفس کے نگراں کے حوالے کیا تھا۔ اس وقت تو کسی نے بستر کھول کر دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ بعد میں کسی نگران نے پستول ہی غائب کر دیا ہو۔ ۱۶ ردسمبر کے بعد

جب سیکرٹری بھارت میں روپوشی ختم کر کے ڈھاکا آیا تو اس نے بستر طلب کیا اور اس میں سے پستول غائب پایا۔ شک کی سوئی ان کی طرف گئی جو 'غدار' سمجھے جاتے تھے۔ تاہم پولیس انسپکٹر سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے محض رسمی خانہ پُری کے لیے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ وہ معذرت کر کے چلا گیا۔ میں نے اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اب بھی کچھ لوگ ہیں جو کسی کو غداری کے جھوٹے الزام کے تحت مزید مشکلات سے دوچار کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے بعض دوسرے ملازمین نے بھی مجھے بہت پریشان کیا بلکہ وہ میری مشکلات میں جان بوجھ کر اضافہ کرتے رہے۔ رجسٹرار نورالدین بھی ان میں سے ایک تھا۔ ۱۷ یا ۱۸ دسمبر کو اس نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ اس نے میری سرکاری رہائش گاہ کو (جسے میں نے اپنے اغوا سے قبل ۱۵ ردسمبر ۱۹۷۱ء کو عجلت میں چھوڑا تھا) مجھ سے پوچھے بغیر ہی بھارتی افسران کے لیے مختص کر دیا ہے۔ حالانکہ رجسٹرار کو معلوم تھا کہ ہم اپنا سامان ویسے ہی چھوڑ کر نکلے تھے، اس نے سامان کی نگرانی کا اہتمام کیا اور نہ کوئی فہرست بنوائی۔ جیسے ہی اُسے معلوم ہوا کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اب میری پوزیشن ایسی نہیں رہی کہ بحیثیت وائس چانسلر واپس آسکوں۔ اُس نے بھارتی فوجی حکام کی جانب سے درخواست موصول ہوتے ہی وائس چانسلر کی سرکاری رہائش گاہ کو اُن کے لیے مختص کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارتی فوجی افسران کو کئی دوسری عمارات میں ٹھہرایا جاسکتا تھا اور پھر یہ کہ فون کر کے میری مرضی معلوم کرنے سے اُسے کس نے روکا تھا؟ مگر خیر، مجھے ٹیلی فون کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ مجھے وائس چانسلر تسلیم کر رہا ہے! جبکہ اس کے ذہن میں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ میں اب وائس چانسلر نہیں رہا ہوں۔

نورالدین اگرچہ اردو بولنے والوں میں سے تھا، تاہم حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے یونیورسٹی کے پاکستان مخالف عناصر کا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک معمولی گریجویٹ تھا اور پولیس سروس سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ اِس شخص نے یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار کے منصب تک صرف یہ کہنے پر رسائی حاصل کر لی تھی کہ اسے پاکستان مخالف نظریات رکھنے کی سزا دی جا رہی ہے۔ یونیورسٹی کے بائیں بازو کے عناصر کی ہمدردی حاصل کر کے اس نے ایسی فضا تیار کی کہ زیادتی کے ازالے کے لیے اسے رجسٹرار بنا دیا گیا۔ اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر

ایم۔او۔غنی ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے جو نورالدین کو رجسٹرار بنانا چاہتے تھے۔انہوں نے اپنا امیدوار پیش کیا مگر وہ اس منصب کے لیے منتخب نہیں ہو سکا۔اب کوئی اور راستہ نہیں بچا تھا، اس لیے نورالدین کو قائم مقام رجسٹرار بنا دیا گیا۔اس معاملے کو اخبار میں اشتہار دے کر نئے امیدواروں سے درخواستیں طلب کرنے پر موقوف رکھا گیا۔اس کے بعد میں وائس چانسلر بن کر آیا۔مجھے اس سے وفاداری کی توقع نہیں تھی۔ پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے ساتھ ہی نورالدین نے محسوس کر لیا کہ اب میں بھی نہیں رہوں گا۔ چنانچہ اس نے مجھے اذیت دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

جنوری ۱۹۷۲ء میں جب میں نے اپنی تنخواہ کے لیے ڈھاکا یونیورسٹی سے رابطہ کیا تو رجسٹرار نورالدین نے مجھے صرف ۱۹ر دسمبر ۱۹۷۱ء تک کی تنخواہ دی۔عدم وفاداری اور دشمنی کا جو بھی مظاہرہ کیا جا رہا تھا، اسے برداشت کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ نورالدین جیسے لوگوں کے نزدیک میں ایک ایسا انسان تھا جس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مجھے مسترد کرنے کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ ۱۹ر دسمبر کے حملے میں میرا بچ نکلنا ہی ایک ایسا معجزہ تھا جس سے انہیں بڑی تکلیف پہنچی تھی۔ ایسے لوگوں سے کسی بھی بہتری کی توقع رکھنا میرے نزدیک شیکسپیئر اور دانتے سے سیکھے ہوئے سبق سے انحراف ہوتا۔وفاداری، مستقل مزاجی اور وسیع النظری جیسے اعلیٰ اوصاف کی ہر شخص سے توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ یہ اوصاف ہر ایک میں نہیں ہوتے اور غیر معمولی انسانوں میں ہی پائے جاتے ہیں۔ جب ہم کسی کی بے وفائی پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں تو دراصل انسانی فطرت کے بارے میں اپنے ہی تصور سے بغاوت کرتے ہوئے اُس شخص کو خواہ مخواہ احترام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی کی بے وفائی پر حیرت اس بات کا اظہار ہے کہ اس سے ہمیں کسی نہ کسی سطح پر وفا کی امید تھی جبکہ اس کے مزاج میں ایسا کوئی بھی وصف نہ تھا۔ جس کی سرشت میں وفا نہ ہو اس سے وفا کی امید وابستہ رکھنا، اسے بلا جواز اہمیت اور احترام دینے کے مترادف ہے۔

جنوری ۱۹۷۲ء کے دوران ڈھاکا یونیورسٹی کے ان اساتذہ کی واپسی شروع ہوئی جنہوں نے خانہ جنگی کے دوران جلاوطنی اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری کا ذکر تو میں کر ہی چکا

ہوں۔ دوسرے آنے والوں میں شعبہ سیاسیات کے عبدالرزاق اور نور محمد میاں، شعبہ انگریزی کے ڈاکٹر سرور مرشد اور شعبہ بنگالی کے ڈاکٹر احمد شریف اور ڈاکٹر منیر الزماں شامل تھے۔

کسی زمانے میں عبدالرزاق سے میرے قریبی تعلقات تھے۔ وہ مجھ سے کافی سینئر تھے۔ جب میں نے ۱۹۳۸ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے بحیثیت طالب علم وابستگی اختیار کی تب عبدالرزاق لیکچرر تھے۔ وہ مسلم لیگ کے حامی تھے اور قائداعظم کے زبردست مداح۔ ''مسٹر ایم اے جناح'' ہمارے درمیان ہم آہنگی کی بنیاد بن گئے۔ ہم نے عبدالرزاق کو مسلم علیحدگی پسندی کے نظریے کا ستون بنا لیا۔ استاد اور شاگرد کے رشتے سے کہیں بڑھ کر ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ پروان چڑھا۔ وہ ایک اچھے دوست تھے جنہیں قدرت نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ کارڈز اور شطرنج کھیلنے میں خاصی مہارت رکھتے تھے، اس لیے انہیں دوست بھی آسانی سے مل جاتے تھے۔ لباس کے معاملے میں ان کا انداز غیر روایتی تھا اور انہیں مزید نمایاں کرتا تھا۔ ان کی وضع قطع اور بات کرنے کا انداز سبھی کچھ ان کے لیے مداح پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا رہتا تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور وہ مختلف موضوعات پر بلا تکان بولتے تھے اور اسی خوبی نے ہمیں ان کا گرویدہ کر رکھا تھا۔

یہ ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء کی بات ہے جب مسلم لیگ کے حامی طلبا اپنا ترجمان شائع کرنا چاہتے تھے تو اس کے ایڈوائزری بورڈ میں عبدالرزاق بھی شامل تھے۔ ہمارے اس جریدے کا نام ''پاکستان'' تھا۔ عبدالرزاق کبھی کبھی ہمارے لیے لکھتے بھی تھے۔ ویسے ان کے مشورے اور اخلاقی ونفسیاتی حمایت ہمارے لیے ان کی تحریروں سے زیادہ اہم تھی۔ ۱۹۴۳ء میں ایک جنونی ہندو نے اس پندرہ روزہ کے منیجر نذیر احمد کو شہید کر دیا تھا، تب عبدالرزاق نے خصوصی شمارے کے لیے ایک دل گداز تحریر قلم بند کی تھی۔

۱۹۵۰ء میں جب وہ انگلینڈ سے واپس آئے تب میں نے ان کے رویے میں تبدیلی محسوس کی۔ پھر میں خود بھی ۱۹۵۲ء میں پی ایچ ڈی کے سلسلے میں یورپ چلا گیا اور دو سال بعد واپس آیا۔ اس دوران مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ عبدالرزاق کی سوچ اور رویے میں کس حد تک تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے سیاسی نظریات میں تبدیلی آتی

گئی، البتہ ہماری دوستی برقرار رہی۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ایک دن عبدالرزاق میرے پاس آئے اور مجھے بنگالی قوم پرستی اور علیحدگی کی جانب مائل کرنے کی کوشش کی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ پاکستان اپنے قیام کے مقاصد میں ناکام ہو چکا ہے۔ مغربی پاکستان کے قائدین، بالخصوص ایوب خان اور ان کے رفقا نے بنگالیوں کا پاکستانیوں کے ساتھ مل کر رہنا ناممکن بنا دیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم بنگالی مسلمانوں کے پاس یہی راستہ بچا تھا کہ وہ بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان سے علیحدگی کے لیے کام کریں اور اپنی ریاست تشکیل دیں۔ میں نے جواباً کہا کہ محض ۱۷ سال کی کارکردگی کی بنیاد پر پاکستان کو سزائے موت سنانا کسی بھی اعتبار سے قرینِ انصاف نہیں۔ انہیں یاد دلایا کہ برطانوی راج کے دوران ۲۰۰ برسوں میں متحدہ بھارت کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اور تلخی کے علاج کے لیے ہی پاکستان بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ پھر ہم یہ بھی بھول گئے تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کے ۷۰۰ سالہ عہدِ اقتدار میں بھی دونوں اقوام (مسلمانوں اور ہندوؤں) کے درمیان واضح اختلافات رونما ہوتے رہے تھے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جاتا کہ پنجابیوں کے بارے میں ان کے تمام دلائل درست تھے اور یہ بھی کہ مشرقی پاکستان کے عوام سے روا رکھی جانے والی ناانصافیوں سے متعلق ان کے تمام اعداد و شمار بھی درست تھے تب بھی کوئی شخص دو سو سال کی تاریخ کو ۱۷ سال کے تجربے پر کیونکر نچھاور کر سکتا تھا؟ میں نے اس نکتے پر زور دیا کہ پاکستان کو ناکام قرار دینے سے قبل اسے کام کرنے کے لیے کچھ وقت تو دیا جائے۔

یہ آخری موقع تھا جب عبدالرزاق اور میں نے کھل کر تبادلۂ خیال کیا تھا۔ ڈیڑھ سال بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اب وہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے طرزِ عمل سے مجھے شدید دکھ پہنچا۔ میرے تو خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ سیاسی اختلاف کو عبدالرزاق ہمارے ذاتی تعلقات پر اثر انداز ہونے دیں گے۔ اس صورت حال کو میں جس حد تک برداشت کر سکتا تھا، میں نے کیا۔ ہم دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں کام کرتے تھے۔ ایسا ممکن ہی نہ تھا کہ ہمارا آمنا سامنا نہ ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ جب بھی ہم ساتھ ہوتے تو وہ مجھے غلط ثابت کرنے پر پوری قوت صَرف کر دیتے تھے۔

آرمی کریک ڈاؤن کے بعد میں نے سنا کہ عبدالرزاق روپوش ہوگئے ہیں۔۱۹۷۱ء میں جب میری خدمات راج شاہی یونیورسٹی سے ڈھاکا یونیورسٹی منتقل کی جا رہی تھیں تب بھی عبدالرزاق روپوش ہی تھے۔

میں آج بھی یہ سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ عبدالرزاق اپنی ہی تحقیق کیوں کر بھول گئے! اس تحقیق ہی کی بنیاد پر تو کچھ عرصہ پہلے انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں رہنے پر مسلم ملائیت کے ہاتھوں سر قلم کردیے جانے کو ترجیح دیں گے۔

شیکسپیئر نے کہا تھا کہ سڑے ہوئے پھول، کانٹوں سے زیادہ بدبودار ہوتے ہیں۔ یہ بات مجھے اس وقت درست معلوم ہوئی جب ۱۹۷۳ء میں دہلی یونیورسٹی نے عبدالرزاق کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا! یہ ڈگری پاکستان توڑنے کے سلسلے میں ان کی کوششوں کے اعتراف کے طور پر دی گئی تھی۔ کس قدر حیرت انگیز ''کلائمیکس'' تھا یہ! عبدالرزاق کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کے لیے جو تقریب منعقد کی گئی، اسی میں مشہور آرٹسٹ زین العابدین کو بھی ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔

عبدالرزاق نے جب روپوشی ترک کی، اس کے کچھ ہی دن بعد میں نے سنا کہ میرے کزن قمرالاحسن کو بھی ضمانت پر رہا کردیا گیا ہے۔ ان کی رہائی سے مجھے ایک گونہ راحت محسوس ہوئی۔ اب کم از کم کوئی پڑھا لکھا اور پختہ عمر کا انسان تو تھا جو میرے گھر والوں کے لیے سہارا ثابت ہوسکتا تھا۔ جب مکتی باہنی کی جانب سے حملوں کا خطرہ گھٹ گیا تو میرے دوسرے کزن منظورالاحسن نے خود کو قانون کے حوالے کردیا۔

عیدالاضحیٰ نزدیک آرہی تھی۔ مجھے اسپتال میں داخل کیے جانے کے بعد یہ پہلا بڑا تہوار تھا۔ ہم اُس وقت جن حالات سے دوچار تھے، ان میں تہوار منانے، نئے کپڑے خریدنے اور اچھا کھانا بنانے کے بارے میں سوچنا بھی دشوار تھا۔ تاہم میں نے فیصلہ کیا کہ عیدالاضحیٰ کی خوشی کسی نہ کسی حد تک منائی جائے تاکہ بچوں کو حالات کی نزاکت کی تپش نہ پہنچے۔ میری بیٹیوں کی عمریں آٹھ اور دس سال تھیں۔ انہیں کیا اندازہ ہوتا کہ ہم کس المیے سے دوچار ہوئے ہیں۔ میری سوچ یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو، انہیں صدمے سے بچانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

عیدالاضحیٰ میرے لیے خاصا افسردہ دن ثابت ہوا۔ کچھ بھی کھانے یا پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اپنے اور اُن ہزاروں افراد کے مقدر کے بارے میں سوچتا رہا جنہیں مکتی باہنی نے ہلاک کر دیا تھا یا جو جیلوں میں سڑ رہے تھے۔ میں جس قدر سوچتا، میرا ملال بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

یونیورسٹی اور کالجوں کو فروری کے اوائل میں دوبارہ کھولنے کا اعلان ہو گیا تھا۔ جب ہوسٹلوں میں رہنے والے طلبا ڈھاکا واپس آنا شروع ہوئے تو شہر کا ماحول بھی گرم ہوتا چلا گیا۔ میں اسپتال میں اپنے کیبن میں بڑھتی ہوئی گرمی محسوس کر سکتا تھا۔ لمبے بالوں اور گھنی داڑھی والے طلبا کے گروپ، جن میں بہت سے مکتی باہنی میں بھی رہے ہوں گے، اب میڈیکل کالج کی راہداریوں میں دکھائی دینے لگے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا، میرے بارے میں ان کا رویہ خاصا غیر دوستانہ، مخاصمانہ بلکہ جارحانہ تھا۔ جس ڈاکٹر نے روزانہ نصف گھنٹے کے لیے نیچے کی منزل پر جا کر ایکسرے ٹریٹمنٹ لینے کا مشورہ دیا تھا، اس کا اب مجھے یہ مشورہ تھا کہ میں کیبن ہی میں رہوں کیونکہ میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ غالباً ۲۹ جنوری کی بات تھی کہ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ اب جبکہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہوں تو وہ مجھے ڈسچارج کرنا چاہتا ہے۔ اعلیٰ حکام کی جانب سے اس پر خاصا دباؤ تھا کہ مجھے جلد از جلد ڈسچارج کر دیا جائے مگر وہ اس معاملے کو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ٹالتا رہا تھا۔ اب دباؤ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اب میں چلنے پھرنے لگا تھا، اس لیے وہ مجھے اسپتال میں مزید رکھنے پر اصرار نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف طلبا کی واپسی پر میڈیکل کالج ہاسپٹل میں میرا رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میرے پاس ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اگلے پیر تک رہنے کی اجازت چاہی مگر یہ بھی ممکن نہ تھا۔ اسی دن میرا ڈسچارج سرٹیفکیٹ بنا دیا گیا اور میں سینٹرل جیل منتقل ہونے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

پولیس نے بتایا کہ مجھے رات کے وقت اسپتال سے جیل منتقل کیا جائے گا۔ میرے اہل خانہ مجھ سے آخری بار ملنے آئے۔ تاہم رات نو بجے پولیس اہلکاروں نے بتایا کہ ابھی تیاری مکمل نہیں ہو سکی تھی، اس لیے اب مجھے اگلے دن صبح جیل بھیجا جائے گا۔

میں ساری رات سو نہ سکا۔ گو کہ میں ایک قیدی تھا لیکن ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء سے اسپتال میں زیر

علاج تھا۔ اس دوران وہ تمام سہولتیں میسر تھیں جو ایک مریض کو ملا کرتی ہیں۔ میرے اہل خانہ روزانہ ملاقات کرسکتے تھے۔ ناشتے کے سوا، کھانا گھر سے آتا تھا۔ اب میرے لیے صحیح معنوں میں جیل کی زندگی شروع ہونے والی تھی، جس کا مجھے کچھ بھی اندازہ نہ تھا۔ میں رات بھر سونے کی کوشش کرتا رہا، مگر خیالات ذہن پر اس طرح سوار تھے جیسے شہد کی مکھیوں نے حملہ کردیا ہو۔ میں ایک پَل کے لیے بھی نہیں سو سکا۔ شدید بے چینی کا عالم تھا۔ ایک موقع پر کیبن کا ماحول اس قدر گرم محسوس ہوا کہ میں نے پنکھا چلادیا، مگر اس سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔

رمنا پولیس پوسٹ کے جس سب انسپکٹر کے ذمے مجھے جیل منتقل کرنے کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی، وہ ۳۰ جنوری کو صبح ساڑھے آٹھ بجے حاضر ہوگیا۔ میں جس حال میں تھا، اسی میں رخصت ہوگیا، شیو کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ جس وین میں مجھے سوار کیا گیا، اسے 109۔ ناظم الدین روڈ سے بھی گزرنا تھا جہاں ہمارا گھر تھا۔ میری درخواست پر وین کو وہاں چند لمحات کے لیے روک لیا گیا تا کہ اہل خانہ مجھے الوداع کہہ سکیں۔ اس موقع پر میری حالت بہت شکستہ تھی۔

علیحدگی سے قبل، مشرقی پاکستان میں عوامی لیگی رضا کار عسکری قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے

''مکتی باہنی'' کے ارکان عسکری تربیت پاتے ہوئے

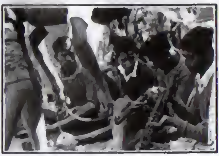

چوتھا باب

جہنم کے قلب میں

ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) نے کہا تھا ''میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ موت نے اِتنوں کو وجود سے عدم کی طرف دھکیلا ہے!''

ڈھاکا سینٹرل جیل کا اندرونی حصہ میری سوچ سے کہیں زیادہ خراب نکلا۔ بیت الخلا پرانی طرزِ تعمیر کا نمونہ تھے جن میں صفائی کا انتہائی ناقص انتظام تھا اور میرے لیے جو بات سوہانِ روح تھی وہ پرائیویسی کا نہ ہونا تھا، ہر شخص ہر وقت دوسروں کی نظروں میں تھا۔

مجھے ایک ایسے حصے میں رکھا گیا جسے سیون سیلز (Seven Cells) کہا جاتا تھا۔ جاننے والے میرے چار تھے۔ ان میں سے دو تو میرے یونیورسٹی کے ہی تھے۔ انہیں دیکھ کر ایک گونہ اطمینان ہوا۔ وہاں دوسروں کو ڈویژن ون کے قیدی کا درجہ ملا ہوا تھا۔ مجھے بھی پانچ دن بعد یہ درجہ مل سکا، وہ بھی جب میری بیوی نے وزارت داخلہ کو اس بارے میں خط لکھا۔ عام طور پر انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کو یہ طے کرنا ہوتا تھا کہ کس قیدی کو ڈویژن ون میں رکھا جائے اور کسے ڈویژن ٹو میں۔ مگر میرا معاملہ قدرے مختلف تھا اس لیے کہ مجھ پر غداری کا الزام عائد تھا۔ چنانچہ ہم جیسوں کے مقدر کا فیصلہ حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ چند ایک خوش نصیب ہی ایسے تھے جنہیں ڈویژن ون قیدی قرار دیا گیا تھا۔ معاشرتی حیثیت خواہ کچھ ہو، بیشتر قیدیوں کو چند دن سے چند ماہ تک عام قیدیوں کی حیثیت ہی سے جیل میں رہنا پڑتا تھا۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے پہلے ہی دن سے عام قیدیوں کے ساتھ ''کھاتہ'' کے بجائے ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا۔

کھاتے میں پڑے ہوئے قیدی جیل کے بدترین ماحول کے شاہد تھے۔ ان کی زندگی شاید ہی حیوانات سے مختلف ہو۔ ان کا کھانا، پینا، رفع حاجت سے فارغ ہونا، نہانا، کپڑے

بدلنا سب کچھ بر سرِ عام ہوتا تھا۔ ان کی حیثیت بڑی حد تک قدیم عہد کے غلاموں کی سی تھی۔ جیل کے نگراں کے احکام کے مطابق وہ بالٹیوں کے ذریعے ایک ایک کوٹھری تک پانی پہنچاتے تھے، سڑک صاف کرتے تھے، بیت الخلا دھوتے تھے، باغ کی صفائی اور کاٹ چھانٹ کرتے تھے، لان کی گھاس بھی وہی کاٹتے تھے اور خاردار جھاڑیوں کو الگ کرنا بھی انہی کے ذمہ تھا۔ اُنہیں ذرا آرام ملتا تھا تو بس سوتے وقت۔ اگر دن میں کسی بھی وقت انہیں تساہل برتتے ہوئے دیکھا جاتا تھا تو سخت سزا دی جاتی تھی۔ ان میں کم ہی خوش نصیب تھے جو سخت سزاؤں سے بچے ہوں گے۔ وارڈرز کو ڈنڈے برسانے میں جیسے کچھ لذت ملتی تھی۔ ان وارڈرز کا انتخاب معاشرے کے پست ترین طبقات سے کیا جاتا تھا اور ان میں سے بیشتر نیم خواندہ تھے۔ جرائم پیشہ افراد سے روابط کے باعث ان کی سماجی حیثیت بھی پست تھی، اس لیے اخلاقی اعتبار سے ان میں اور سب سے نچلے درجے کے قیدیوں میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا تھا۔

بیشتر وارڈرز عوامی لیگ کے زبردست حامی تھے۔ انہیں ذہنی طور پر تیار کر دیا گیا تھا۔ اس لیے جب خانہ جنگی ختم ہوئی اور بنگلہ دیش قائم ہوا تو سیاسی قیدی جیل پہنچے، وارڈرز نے انہیں بدترین جرائم پیشہ افراد کی حیثیت سے لیا۔ ڈویژن ون کے قیدیوں سے تو بدسلوکی ممکن نہیں تھی، مگر کھاتے کے قیدیوں میں، جن کو غداروں کا ساتھی قرار دیا گیا ان پر تو ظلم کی انتہا کر دی گئی۔ اگر وہ بے چارے بیمار بھی پڑتے تھے تو انہیں علاج کی سہولت اور ادویہ فراہم نہیں کی جاتی تھیں اور بیماری کی حالت میں بھی ان سے بیگار لی جاتی تھی جس سے ان کی حالت مزید خراب ہو جاتی تھی۔ جو قیدی بیماری اور کمزوری کے باعث ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں بھی تکلیف محسوس کرتے تھے، انہیں ایسے مشکل کام سونپے جاتے تھے جو پچیس سال کا طاقتور نوجوان بھی شاید ہی آسانی سے کر پاتا۔ ایک تو شدید محنت، اس پر لاٹھی چارج اور پھر لعن طعن اور گالم گلوچ۔ اختیارات کے نشے میں سرشار وارڈرز ذرا ذرا سی بات پر پھٹ پڑتے تھے اور ان کے منہ سے مغلظات کا طوفان سا امنڈ پڑتا تھا۔

جیل میں میرے لیے ابلاغ ایک بڑا مسئلہ تھا، یہاں کی تو زبان ہی کچھ اور تھی۔ وارڈرز کو عام طور پر ''میاں صاحب'' کہا جاتا تھا۔ ڈویژن ون کے قیدیوں سے جڑے ہوئے نچلے

درجے کے قیدی عام طور پر ''فالتو'' کہلاتے تھے۔ جیل کے کچن کو ''چوکا'' کہا جاتا تھا۔ ان اصطلاحات سے مانوس ہونے میں مجھے ہفتہ لگ گیا۔ ہر قیدی کو جیل آنے کے وقت ''کیس ٹیبل'' پر جانا پڑتا تھا۔ وہاں جیلر یا اس کا کوئی نائب، قیدی کے کوائف درج کرتا تھا۔ یہ تمام اصطلاحات مجھے ابتدا میں زیادہ خطرناک نہیں لگیں مگر جب جیل میں قیدیوں کے منہ سے انہیں مختلف انداز سے سنا اور ان سے منسلک کہانیاں سامنے آئیں تب مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔

جیل میں حفظ مراتب کا بھی عجیب ہی حال تھا۔ سب سے بلند منصب جیل خانہ جات کے انسپکٹر جنرل کا تھا۔ انہیں عام طور پر قیدی نہ دیکھ سکتے تھے نہ مل سکتے تھے۔ آئی جی جیل خانہ جات کا بنیادی کام نظم و نسق ہوتا ہے۔ ان سے نیچے ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پرزنز ہوتے ہیں جو روزانہ پوری جیل کا گشت لگاتے ہیں اور تمام امور پر براہ راست نظر رکھتے ہیں۔ جب میں جیل پہنچا تو ڈی آئی جی روزانہ صبح نو سے دس بجے کے درمیان گشت پر نکلتا تھا۔ پھر یہ گشت ہفتہ وار ہو گیا یعنی وہ جمعہ کے جمعہ آنے لگا۔ اس کے گشت کا دن فائل ڈے کہلاتا تھا۔ ڈی آئی جی بھی بنیادی طور پر نظم و نسق ہی کا ذمہ دار ہوتا ہے اور دیگر معاملات میں براہ راست مداخلت سے گریز کرتا ہے۔ اس کے بعد جیلر کا نمبر آتا ہے جو جیل میں مضبوط ترین شخصیت کہلاتا ہے۔ (۱۹۷۲ء میں) اس کی تنخواہ بمشکل تین سو روپے ہوتی تھی، اس کا تقرر گزیٹڈ افسر کی طرح نہیں کیا جاتا۔ مگر جیل کی حدود میں اس کے اختیارات لامحدود ہوتے ہیں۔ قیدی اسے عفریت سمجھ کر اس سے خوفزدہ رہتے ہیں اور اس کے ماتحت اسے دیوتا قرار دے کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ جیل کی حدود میں جو لفظ اس کے منہ سے نکل جائے وہ قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ جیل کے تمام امور کا نگراں اور ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ قیدیوں پر نظر رکھتا ہے۔ اسی کی صوابدید کے مطابق کسی بھی قیدی کو قانونی طور پر حاصل کسی بھی سہولت سے مستفید ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ وہی ترقی اور تنزلی کا اختیار رکھتا ہے۔ جن کی وفاداری سے مطمئن ہو، انہیں نوازتا ہے اور جنہیں راہ راست سے ہٹا ہوا تصور کرے، انہیں سزا دیتا ہے۔ جیلر کی معاونت کے لیے نصف درجن ڈپٹی جیلرز ہوتے ہیں، جو اگرچہ اختیارات کے معاملے میں تو غیر معمولی حیثیت نہیں رکھتے، تاہم قیدیوں کو ہراساں کرنے میں وہ بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ جیلر اور ڈی

آئی جی کے درمیان ایک اور افسر بھی ہوتا ہے جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کہلاتا ہے۔ یہ افسر دراصل جیل کے تحت چلائی جانے والی فیکٹریوں اور ملوں کا نگران ہوتا ہے۔ ڈی آئی جی کی غیر موجودگی میں بھی یہ ان کی ڈیوٹی انجام دیتا ہے۔

اس کے بعد ڈپٹی جیلر اور صوبیدار کے درمیان اختیارات کی جنگ جاری رہتی ہے۔ دونوں کا اصرار ہوتا ہے کہ اُس کی بات مانی جائے اور اسی کے حکم کے مطابق امور انجام دیے جائیں۔ صوبیدار کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ وہ پڑھ سکتا ہو۔ خواندگی ہی اس کے لیے تعلیم یا اعلیٰ تعلیم ہے۔ جیل میں دو یا تین صوبیدار ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ہیڈ وارڈرز ہوتے ہیں۔ انہیں عام طور پر جمعدار کہا جاتا ہے اور یہ جیل کی انتظامیہ کے اہم ترین ستونوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ وارڈز کی نگرانی کرتے ہیں۔ یہ جیل انتظامیہ اور قیدیوں کے درمیان رابطے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ جیل میں صفائی ستھرائی کے کام کی نگرانی بھی یہی لوگ کرتے ہیں اور چوبیس گھنٹے جیلر کی کال پر خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔

انتظامی امور میں جیلیں عام اداروں سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ سورج کے طلوع ہونے سے غروب ہونے تک اس میں کام جاری رہتا ہے۔ ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ گارڈز تبدیل ہوتے ہیں، وارڈرز کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں، قیدیوں کی گنتی کی جاتی ہے، رجسٹر میں حاضری لگائی جاتی ہے اور گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں۔ ایک گنتی صبح چھ بجے ہوتی ہے اور دوسری شام چھ بجے۔ کسی بھی وارڈر کو گنتی سے قبل ڈیوٹی ختم کرنے اور جیل کی حدود سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جیلرز اور ڈپٹی جیلرز کی جانب سے غیر علانیہ چیکنگ تمام متعلقہ افسران کو مستعد رکھتی ہے۔ فرائض کی انجام دہی میں معمولی سی غفلت بھی معطلی یا برطرفی پر منتج ہوتی ہے۔

ملک کے دوسرے بہت سے اداروں کی طرح جیلیں بھی کرپشن کا گڑھ ہیں۔ نا اہل لوگ جیلوں میں بھی تعینات ہیں۔ مگر میرے لیے یہ بات بہت اہم اور کسی حد تک اطمینان کا باعث تھی کہ ہیڈ وارڈرز، وارڈرز اور دیگر حکام اپنی ڈیوٹی پر نہ صرف بروقت حاضر ہوتے تھے بلکہ ڈیوٹی دینے میں کوئی کوتاہی نہیں دکھاتے تھے۔ یہ سب کچھ مشینی انداز سے چلتا رہتا تھا۔ بظاہر یہ طاقت کے استعمال کا نتیجہ تھا۔ جن کی رات کی ڈیوٹی لگائی جاتی تھی، بس وہی کبھی کبھی شکایت

کرتے تھے، رات کی ڈیوٹی نو سے صبح تین بجے تک ہوتی تھی۔ مگر یہ لوگ بھی اپنی ڈیوٹی پر بلاناغہ حاضر ہوتے تھے۔ انتظامیہ کی نظر میں شدید ترین غفلت شعاری اگر کوئی تھی تو وہ ان کا کبھی کبھی سو جانا تھا۔ اگر کوئی اپنی ڈیوٹی پر سوتا ہوا پایا جاتا تو اسے فوری سزا دی جاتی۔ یہ سزا کا خوف ہی تھا جس کے باعث تمام اہلکار اپنی ڈیوٹی عمدگی سے انجام دیتے ہوئے نظر آتے تھے۔ جس معاشرے میں وقت پر ڈیوٹی کے لیے حاضر ہونا ایک ناممکن سا امر لگتا ہے اور لوگ وقت پر آنے والوں کا مذاق اڑاتے ہوں، وہاں وارڈرز کا وقت پر آنا ہر اعتبار سے قابل ستائش تھا۔

جیلر نرمل رائے (Nirmal Roy) اپنی عمر کی چوتھی دہائی کے اواخر یا پانچویں دہائی کے اوائل میں تھا۔ وہ بہت ہینڈسم اور اچھی وضع قطع کا انسان تھا۔ اُس نے بتایا کہ ڈھاکا سینٹرل جیل میں وہ مختلف حیثیتوں میں چودہ سال سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جیل کی حدود میں افسران اور قیدی اپنے فرائض سے بچنے اور پکڑے جانے کی صورت میں سزا سے گلوخلاصی کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں۔ ایک بات ضرور تھی کہ ''غداروں'' کے لیے شدید نفرت نرمل رائے نے اپنے اچھے اطوار کے دبیز پردوں میں چھپا رکھی تھی۔ بس دو ایک مرتبہ اُس کی زبان لڑکھڑائی۔ ایک بار ڈی آئی جی کو جیل کا دورہ کراتے وقت نرمل رائے نے ڈاکٹر حسن زمان کو بہت سے لوگوں کا قاتل قرار دے کر تفصیل بیان کرنے کی ابتدا کی اور پھر خود ڈاکٹر حسن زمان کی سرزنش پر خاموش ہوا۔ ایسے اِکّا دُکّا واقعات ہی ہم تک پہنچتے رہتے تھے۔ نرمل رائے مجموعی طور پر اس بات کو دل ہی میں چھپا کر رکھتا تھا کہ اس کی نظر میں پاکستانی فورسز اور اسٹیبلشمنٹ سے تعاون کرنے والے تمام افراد کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

پاکستانی حکومت اور فوج سے تعاون کرنے والوں سے اپنی نفرت کے اظہار کے معاملے میں جیل کا دیگر اسٹاف خاصا لاپروا تھا۔ جیل کے اسپتال سے منسلک ڈاکٹرز نفرت کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ کیپٹن صمد خاص طور پر مخاصمانہ رویہ رکھتا تھا۔ جو قیدی علاج کے لیے ان کے پاس جاتے تھے، انہیں مغلظات سے نوازتا اور دوائیاں دیے بغیر یہ کہتے ہوئے لوٹا دیتا تھا کہ وہ تو موت کا حق دار ہے۔ کبھی کبھی تو فخر سے بیان کرنے بیٹھ جاتا کہ اب تک وہ کتنے

مریضوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ کبھی کبھی اس کے سخت اور ناقابل برداشت رویے سے بددل ہو کر مریض قیدی اُس پر حملہ بھی کر دیتے تھے۔ ایک بار کیپٹن صمد کو اس وقت چُپ ہو جانا پڑا جب ایک قیدی نے کہا کہ وہ اب تک سو افراد کو گولی مار چکا ہے مگر اسے اس بات کا رنج ہے کہ کیپٹن صمد کو گولی نہیں مار سکا۔

جیل کے کمپاؤنڈر کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے خود کو جیل میں عوامی لیگ کا مرکزی ترجمان اور شیخ مجیب الرحمٰن کا ذاتی ترجمان کہنا شروع کر دیا۔ یہ شخص بالعموم ہمارے سامنے تو محتاط رہتا اور جو کچھ ہم نے کیا تھا، اس پر صرف افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ہماری سیاسی بصیرت کی کمی پر ملول ہوتا تھا، مگر لوگ بتاتے ہیں کہ پیٹھ پیچھے وہ ہمیں خوب مغلظات بکتا تھا۔ ایک بار میرے کزن قمرالاحسن کی موجودگی میں عبدالرحمٰن نے مجھے برا بھلا کہا اور دعویٰ کیا کہ میں نے تھرڈ ڈویژن میں ایم اے انگلش کیا ہے اور یہ کہ میں اعلیٰ منصب تک چاپلوسی کے ذریعے پہنچا ہوں۔ قمرالاحسن نے اسی وقت اس کی تکذیب کی اور بتایا کہ میرا تعلیمی کیریئر تو شاندار رہا ہے۔ مگر یہ شخص باز نہ آیا۔ اپریل ۱۹۷۲ء میں جب میں جیل کے اسپتال میں تھا، تب یہ شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ اس کی بیٹی ہائر سیکنڈری کے امتحان میں حصہ لے رہی ہے اور اس کے لیے انگریزی میں چند مضامین کی ضرورت ہے۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی چند مضامین املا کرا دیے۔ ایک دن میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے بتایا کہ میرے املا کرائے ہوئے مضامین کو اس کی بیٹی نے گرامر اور کمپوزیشن کے اصولوں کی رُو سے درست قرار دیا ہے! میری تعلیمی کامیابیوں کے لیے وہ اس سے زیادہ تحسین کیا کر سکتا تھا۔

چند پابندیوں کو جیل کی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک شیونگ بلیڈ رکھنے پر پابندی بھی شامل ہے۔ میں جس دن جیل پہنچا، اسی دن چیف ہیڈ وارڈر نے میرے بیگ کی تلاشی کے دوران تمام شیونگ بلیڈز اور ریزر الگ کر دیے۔ اس کا کہنا تھا کہ ڈویژن ون میں تبادلہ کیے جانے کی صورت میں ہفتے میں ایک بلیڈ مجھے ملا کرے گا اور ایک ہیڈ وارڈر کی موجودگی ہی میں شیو کی جائے گی اور وہ بلیڈ بھی واپس لے لے گا۔ مگر سچ یہ ہے کہ وہ بلیڈ مجھے کبھی واپس نہیں ملے۔ یہی حال دوائیوں کا تھا جو ایک ڈپٹی جیلر کے پاس رکھوا دی گئی تھیں۔ بعد میں جب ملک

میں ادویہ کی شدید قلت رونما ہوئی اور جیل کے ڈاکٹرز کے نسخے کے مطابق بھی جیل انتظامیہ ادویہ فراہم کرنے میں ناکام رہی تو ہمیں گھر سے دوائیاں منگوانے کی اجازت دے دی گئی۔

مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ جیل کے قواعد وضوابط ہیں کیا اور ان کے تحت کس پر کون سی پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور کون کتنی اور کیسی مراعات کا حقدار ہے۔ ہم نے کئی بار درخواست کی مگر کبھی جیل کے قواعد کے درشن نہیں کرائے گئے۔ کس کو کون سی مراعات مل سکتی ہیں، یہ سب افسران کی مرضی کا معاملہ تھا۔ کبھی کبھی وہ تازہ ناریل منگوائے جانے پر بھی اعتراض کردیتے اور کبھی گھر کے پکے ہوئے کھانے پر بھی کوئی اعتراض نہ کرتے، جبکہ جیل میں گھر سے کھانا منگوانے پر شدید اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ تمام افسران جیل کے قواعد کی تشریح اپنے اپنے انداز سے کرتے تھے۔ تاج محمد نام کے ایک افسر نے ہمارے لیے شدید مشکلات پیدا کیں۔ جیل کی حدود میں اس کے الفاظ حکم کا درجہ رکھتے تھے۔ جو کچھ وہ کہتا تھا بس وہی حرفِ آخر ہوا کرتا تھا۔

ہم سب کو جیل میں بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ اگر موزوں شخص کو مناسب رشوت دی جائے تو جیل میں کوئی بھی چیز، کوئی بھی سہولت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ذہنی خلل میں مبتلا چند قیدیوں کا کہنا تھا کہ جیل حکام ہمیں صرف ایک عیاشی فراہم نہیں کرسکتے اور وہ ہے عورت۔ کوئی بھی پکی ہوئی چیز یا شراب متعلقہ افسران کی مٹھی گرم کرکے آسانی سے حاصل کی جاسکتی تھی۔

جیل کی حدود میں رشوت اور بدعنوانی کو ایک باقاعدہ نظام کی شکل دے دی گئی ہے۔ جیلر سے وارڈر تک ہر ایک کو اپنے منصب کے مطابق حصہ ملتا ہے۔ جیل کے باغات کی پیداوار پر متصرف ہونا جیل کے کسی بھی ملازم کی نظر میں جرم نہیں۔ جیل کے لیے چاول، تیل وغیرہ فراہم کرنے والے ٹھیکیدار رشوت دیے بغیر اپنے ٹھیکے برقرار نہیں رکھ سکتے۔ یہ سب جیل کے معمولات کا حصہ ہے مگر ۱۹۷۲ء کے پہلے نصف میں ہم نے ڈھاکا جیل میں جو کچھ دیکھا، وہ ہمارے لیے بہت حیرت انگیز تھا۔ پاکستانی حکومت اور فوج سے تعاون کے الزام میں بنگالی اور غیر بنگالی آتے چلے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے قیدیوں کی تعداد ۱۴ ہزار تک پہنچ گئی۔ جیل کے عملے کے لیے تو یہ سب ایسی بن مانگی نعمت کی طرح تھا، جسے خوب پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا ہو۔

ڈھاکا سینٹرل جیل میں ایک ہزار نو سو چھیاسٹھ قیدیوں کی گنجائش تھی۔ ۱۶ ردسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد اسی دن مکتی باہنی والوں نے جیل پر دھاوا بول دیا اور جیلر سے تمام دروازے کھلوا کر قیدیوں کو رہا کرا دیا۔ چند ایک مخبوط الحواس قیدیوں کے سوا تمام چور، لٹیرے اور قاتل جیل سے بھگا دیے گئے، اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈھاکا جیل میں قیدیوں کی تعداد صفر ہوگئی۔ اب ان لوگوں کو جیل میں ڈالنے کا سلسلہ شروع ہوا جن پر پاکستانی حکومت اور فوج سے تعاون کا الزام تھا۔ ڈھاکا کے علاقوں محمد پور اور میر پور سے غیر بنگالی مردوں، عورتوں اور بچوں کو ٹرکوں اور لاریوں میں جانوروں کی طرح لاد کر جیل لایا جاتا۔ بیشتر عورتوں کو خصوصی کنسنٹریشن کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔ مردوں اور کچھ بچوں کو ڈھاکا سینٹرل جیل میں رکھا گیا۔

ان میں سے بہتوں کے پاس خطیر رقوم ہوا کرتی تھیں۔ کسی کسی کے پاس تو پانچ پانچ چھ چھ ہزار روپے تک ہوتے تھے۔ جیل کے مرکزی دروازے پر ان سے یہ سب کچھ چھین لیا جاتا تھا۔ اگر کوئی نظر بچا کر اپنی جمع پونجی جیل میں لانے میں کامیاب بھی ہو جاتا تھا تو یہ سب کچھ ڈپٹی جیلر کی تحویل میں دینا پڑتا تھا۔ اب ایک نیا کھیل شروع ہوگیا۔ ڈپٹی جیلر رقم وصول کرتے وقت رجسٹر میں اپنی مرضی کے مطابق کچھ بھی درج کر دیا کرتے تھے۔ پانچ ہزار کو پانچ میں تبدیل کر دیا جاتا اور بے چارے قیدی کچھ بھی کرنے سے لاچار تھے۔ اصل اور رجسٹر میں درج رقم کا فرق جیل کے عملے کی جیب میں چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ سننے میں آتا تھا کہ کسی افسر نے پوری رقم جیب میں ڈال لی، وگرنہ لوٹ کا مال عملے کے تمام ارکان میں، ایک نظام کے تحت، متناسب طور پر تقسیم کیا جاتا تھا۔

جب غیر بنگالیوں کو معلوم ہوا کہ ان کی جمع پونجی اس طرح لوٹی جا رہی ہے تو انہوں نے اسے پھاڑنا یا جلانا شروع کر دیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس طرح کتنی بڑی رقم کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا ہوگا۔ اگر جیل حکام کو شبہ ہو جاتا کہ کسی قیدی کے پاس کچھ رقم ہے تو اسے مارتے پیٹتے۔ قیدی مار پیٹ گوارا کر لیتے تھے مگر رقم نہیں دیتے تھے۔ بعد میں وہ اپنی رقم کو خود ہی تلف کر دیتے۔ اس دوران جیل کے حکام اور اہلکاروں نے کتنا مال کمایا ہوگا، اس کا اندازہ تو کوئی بھی نہیں لگا سکتا۔ ہمیں خود وارڈرز نے بتایا کہ اس لوٹ مار میں بہتوں نے ۷۰ ہزار روپے سے

بھی زیادہ حاصل کیے۔ جن وارڈرز اور دیگر اہلکاروں کو ڈیوٹی کی نوعیت کے باعث لوٹ مار میں شرکت کا موقع نہیں ملا وہ دیگر حکام اور اہلکاروں کے بارے میں مبالغے پر مبنی باتیں پھیلاتے رہتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ جن لوگوں کی ڈیوٹی جیل کے مرکزی دروازے پر ہوتی تھی وہی بالعموم لوٹ کے مال میں حصہ دار بنتے تھے۔

بدعنوانی کا ایک اور روپ سامنے آیا کہ مالدار قیدی چھوٹی چھوٹی سہولتوں کے لیے رشوت دینے لگے۔ جن پر غداری کا الزام عائد کیا گیا تھا ان میں کروڑ پتی بزنس ایگزیکٹیو، قانون دان، اساتذہ اور اعلیٰ سرکاری افسران سب ہی تھے۔ جیل کی اس زندگی کے بارے میں تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ معمولی معمولی خدمات کے لیے بھی انہوں نے رشوت دینی شروع کردی۔ ایک صاحب کی کئی جوٹ ملیں تھیں۔ انہوں نے جیل میں صرف اپنی کیٹیگری تبدیل کرانے کے لیے محکمہ داخلہ کے افسران کو بیس ہزار روپے کی رشوت دی تھی۔ ابتدا میں انہیں عام قیدیوں کے ساتھ کھاتہ میں رکھا گیا تھا۔ ان سے زیادہ مالدار ایک دوسرے صاحب نے جیلر سے لے کر وارڈر تک تمام لوگوں کو ماہانہ بھتہ دینا شروع کردیا جن سے ان کا کوئی بھی واسطہ پڑ سکتا تھا، تاکہ زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل کی جاسکیں۔ یہ تھے ابوالقاسم جو ۱۹۷۱ء کی عبدالمالک کابینہ میں بھی شامل تھے۔ قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ ان کی کوئی سیاسی ساکھ نہ تھی اور وہ صرف موقع پرست تھے۔ مولانا نورالزماں انہیں مذہبی منافق کہا کرتے تھے۔ ویسے تو وہ الحاد کی باتیں کھل کر کیا کرتے تھے مگر جب ضرورت پڑتی تھی تو پارسائی میں ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ اور موقع نکل جانے پر پھر الحاد کی طرف لوٹ جاتے تھے۔

۱۹۷۲ء سے پہلے کے زمانے میں ابوالقاسم، کونسل مسلم لیگ کے حامی تھے۔ ان کے چند کارخانے تھے۔ ان کا تعلق آسام سے تھا۔ اپنی غیر معمولی چالاکی اور موقع شناسی سے انہوں نے سیاسی حلقوں میں جگہ بنالی تھی اور پھر اُن پر ہُن برسنے لگا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گرفتاری تک کسی کو یقین نہ ہوا کہ نظریۂ پاکستان پر ان کا معمولی سا بھی ایمان نہ تھا۔ ستمبر ۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان کے آخری گورنر ڈاکٹر عبدالمالک نے صوبائی کابینہ تشکیل دی تو ان کی نظر ابوالقاسم پر بھی پڑی۔ وہ مشرقی پاکستان میں کونسل مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل

رہے تھے۔ ابوالقاسم کے بارے میں ڈاکٹر مالک، مولانا نورالزماں اور دیگر قائدین سے جو کچھ سنا، اس سے اندازہ ہوا کہ ان میں سیاسی بصیرت ویسی ہی تھی جیسی ہمارے دیگر رہنماؤں میں پائی جاتی تھی۔

ابوالقاسم نے رشوت کے طور پر اتنی بڑی رقوم دینا شروع کر دیں کہ دیگر قیدیوں کے لیے مسائل پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ جب وہ بیمار پڑے تو قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہیں ڈھاکا میڈیکل کالج اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ ان کے کیبن کی حفاظت پر مامور وارڈرز کو یومیہ دس روپے ملتے تھے۔ دوسرے قیدی خواہ کیسی ہی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوں، انہیں جیل سے باہر کسی بھی اسپتال منتقل کرنے سے صاف انکار کر دیا جاتا تھا۔ سابق گورنر ڈاکٹر عبدالمالک عمر کی ساتویں دہائی میں تھے مگر ہرنیے کے آپریشن کے لیے انہیں جیل سے باہر کسی دوسرے اسپتال میں بھیجنے سے صاف انکار کر دیا گیا تھا۔ دوسرے متمول قیدی بھی رشوت دے کر سہولتیں حاصل کیا کرتے تھے۔ ہمیں یہ سب کچھ بچشم سر خود دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس کے لیے ہمیں کسی اور کی شہادت کی ضرورت نہیں۔

کھانے پینے کی اشیا کے معاملے میں بھی بدعنوانی کا یہی عالم تھا۔ دودھ، گوشت، مچھلی یا چائے وغیرہ کی تقسیم میں بھی وارڈرز اور دیگر اہلکاروں کا حصہ طے ہوتا تھا۔ یہ معاملہ جیل کے ماحول میں کچھ اس قدر رچ بس گیا تھا کہ اسے غلط سمجھنا ہی ترک کر دیا گیا تھا۔ یہ روایت ایسی پختہ ہو چکی تھی کہ اگر کبھی کسی وارڈر کو حصہ نہیں ملتا تو وہ محسوس کرتا کہ شاید اسے دھوکا دیا گیا ہے اور وہ اس پر باضابطہ احتجاج بھی کرتا۔ وارڈرز کو اگر ڈویژن ون کے قیدیوں کے لیے مختص کپ کے علاوہ کسی چیز میں چائے دی جاتی تو وہ اس پر بھی شدید احتجاج کرتے تھے۔

یہ بات ماننی پڑے گی کہ نوجوان وارڈرز رویے کے اعتبار سے پختہ عمر کے وارڈرز سے بہتر تھے۔ برسوں جرائم پیشہ افراد کے ساتھ رہتے رہتے اِن بڑی عمر کے وارڈرز کی سفاکی اس قدر بڑھ چکی تھی اور تعلیم کی کمی نے انہیں کچھ ایسا بنا دیا تھا کہ اب شاید انہیں مکمل انسان بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نوجوان وارڈرز سے بات کرنا کبھی کبھی اچھا لگتا تھا۔ وہ بات سنتے بھی تھے اور سمجھتے بھی تھے۔ ان میں کچھ احساس باقی تھا۔ جن وارڈرز کی عمریں جیل میں گزری تھیں، ان

میں شرم، غیرت، عزتِ نفس اور شائستگی نام کو بھی نہیں بچی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران تھا کہ انسان پر ماحول کس حد تک اپنے رنگ چڑھا لیا کرتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وارڈرز کا انتخاب عموماً معاشرے کے نچلے طبقے سے کیا جاتا تھا۔ ان کی تنخواہ بھی کچھ ایسی خاص نہیں تھی کہ یہ بہتر زندگی بسر کر سکیں۔ مگر جیل سے باہر عام ماحول میں جو لوگ شدید غربت کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں، ان میں تو وہ ساری خرابیاں نہیں پائی جاتیں جو ان وارڈرز کے کردار میں پائی جاتی ہیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی مخصوص ماحول انسان کو کچھ بھی بنا سکتا ہے۔

طویل المیعاد سزا بھگتنے والے قیدی اگر اچھا رویہ رکھیں یعنی جیل انتظامیہ سے ہر معاملے میں تعاون کریں اور فرماں برداری کا مظاہرہ کریں تو ان پر اعتماد کرتے ہوئے وارڈرز اپنی چند ذمہ داریاں انہیں سونپ دیتے ہیں۔ وہ جیل میں آسانی سے گھوم پھر سکتے ہیں، قیدیوں کی نگرانی کر سکتے ہیں اور ضرورت محسوس ہونے پر اپنی صوابدید کے مطابق چھوٹی موٹی سزائیں بھی دے سکتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ایسے سینئر قیدیوں سے لوگ زیادہ خوفزدہ رہتے تھے اور ان کی مخبری پر کبھی کبھی وارڈرز کی بھی چھٹی ہو جاتی تھی۔ جیل کے اعلیٰ حکام سینئر قیدیوں سے جیل کے دیگر افسران اور اہلکاروں کی فرض شناسی وغیرہ سے متعلق رپورٹیں بھی لیا کرتے تھے۔ یہ عادی مجرم اختیارات پا کر مزید سفاک ہو جاتے ہیں۔ جیل سے باہر ان کا ریکارڈ خواہ کچھ رہا ہو، جیل میں یہ کچھ زیادہ ہی مجرمانہ ذہنیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ جیل میں جو بھی اچھی چیز پکی ہو اس پر ان کا پہلا حق ہوتا ہے۔ قیدیوں کے لیے تیار کیے جانے والے سالن، روٹی، مچھلی اور دودھ میں سے ان قیدیوں کو باقاعدگی سے حصہ دینا پڑتا ہے۔

ذرا سوچیے ان بدعنوان انسانوں کو اُن ۱۴ ہزار قیدیوں کی نگرانی سونپ دی گئی تھی جن پر غداری کا لیبل چسپاں کر دیا گیا تھا۔ جیل کے بدعنوان اور نا اہل حکام اور اہلکاروں کی نظر میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ وطن کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے والے انسان کسی رعایت کے مستحق نہیں، اس لیے وہ ان قیدیوں کو انسان کی حیثیت دینے کو تیار ہی نہیں تھے۔ ان کی نظر میں تو یہ جانوروں کے ریوڑ تھے جنہیں صرف ہانکا جا سکتا تھا۔

جن قیدیوں کو کوٹھریوں میں نہیں رکھا جاسکتا تھا ان کے لیے بانس اور گھاس پھوس کے عارضی کیمپ بنا دیے گئے تھے۔ ان کیمپوں میں دھوپ اور سردی سے بچاؤ کا علیحدہ سے کوئی انتظام نہیں تھا۔ اوپن ایئر بیت الخلا ان کیمپوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ جب یہ بھر جاتے تو فضلے کی بدبو سے دماغ پھٹنے لگتا تھا۔ جب تیز ہوا چلتی تھی تو بدبو پوری جیل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ ڈھاکا سینٹرل جیل صرف ۱۹۶۶ قیدیوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس میں ۱۴ ہزار قیدیوں کو کسی بھی طور اتنی آسانی سے نہیں ٹھونسا جاسکتا تھا۔ جیل کا کچن اتنے سارے قیدیوں کے لیے کھانا تیار کرنے کی گنجائش ہی نہیں رکھتا تھا۔ چولہے رات دن جلتے رہتے تھے مگر پھر بھی سب کے لیے کھانا نہیں پکایا جاسکتا تھا۔ کبھی کبھی تو تمام قیدیوں کو ایک وقت کا کھانا فراہم کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ کچھ لوگوں کو کھانے کے لیے چھتیس چھتیس گھنٹے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پانی کی بھی شدید قلت رہتی تھی۔ پینے کے صاف پانی کا تو ذکر ہی کیا، ایک ماہ میں ایک بار نہانے کے لیے بھی پانی میسر نہیں تھا۔ ایک دن میں نے دل دہلا دینے والی ایک کہانی سنی۔ ایک قیدی کو جب پینے کا صاف پانی نہ ملا تو اس نے پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر ایک نالی سے پانی پیا۔

ڈویژن نمبر ایک کے قیدیوں سے وابستہ ''فالتو'' کچھ بہتر حالت میں تھے۔ انہیں چند سہولتیں مل جاتی تھیں۔ ہم اپنے پانی میں سے ایک حصہ انہیں بھی دے دیا کرتے تھے۔ ہمیں نہانے کے لیے پانی اور باتھ روم مہیا تھا، جس سے ہم سے وابستہ ''فالتو'' بھی مستفید ہوتے تھے۔ دوسروں کی مدد ہم البتہ نہیں کر پاتے تھے۔ کبھی کبھی پانی اس قدر کم ہو جاتا تھا کہ ہم دوسروں کو اپنی سپلائی استعمال کرنے سے روک دیا کرتے تھے۔ ایسا کرنا خود ہمیں بھی بہت برا لگتا تھا مگر کیا کرتے، مجبوری تھی۔ جن حالات سے ہم دوچار تھے، ان میں دوسروں پر ترس کھا کر اپنے لیے مشکلات پیدا کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ ایسی کسی بھی صورت حال میں ہم مجبور ہو کر اپنے جذبات کچل دیا کرتے تھے۔ ہمیں یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ اگر ہم نے ترس کھا کر اپنے وسائل سے دوسروں کو مستفید ہونے دیا تو خود ہمارے لیے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا کہ شاید میں رفتہ رفتہ وحشی ہوتا جا رہا ہوں۔

ڈھاکا سینٹرل جیل کے بیشتر قیدیوں کا تعلق محمد پور اور میر پور سے تھا۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ جیل میں ڈالے جانے سے قبل انہیں تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا تھا۔ ان کے مصائب کی کوئی حد نہ تھی۔ انہیں ان کے خاندان سے الگ کر دیا گیا تھا اور کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ گھر کے دوسرے افراد کا کیا بنا۔ یہ گویا ان کے لیے مستقل ذہنی اذیت کا سامان تھا۔ انہیں خود بھی معلوم نہ تھا کہ ان کی گرفتاری کس جرم کے تحت عمل میں لائی گئی ہے۔ یہ غیر بنگالی تھے اور بنیادی طور پر ان کا تعلق ہندوستان کے اردو بولنے والے علاقوں (اتر پردیش اور بہار) سے تھا۔ ان کے بچے بنگالی روانی سے بولتے تھے اور کافی حد تک مقامی ماحول اور ثقافت کا حصہ بن چکے تھے۔ مگر اس کے باوجود انہیں مسترد کر دیا گیا تھا، ان کے اعزا قتل کر دیے گئے تھے، مکانات کو تباہ کر دیا گیا تھا، ان کی املاک صرف اس بنیاد پر ضبط کر لی گئی تھیں کہ انہوں نے پاکستان کے خلاف جدوجہد میں عوامی لیگ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

جیل میں پہلے دن مجھے چند گھنٹوں کے لیے ایک ادھیڑ عمر شخص کی خدمات فراہم کی گئیں۔ اس کا جسم خاصا مضبوط تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو ڈھائی ماہ میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو کر رہ گیا۔ یہ تبدیلی کھانے پینے کی کمی سے واقع نہیں ہوئی تھی، وہ دراصل اپنی بیوی اور بچیوں کے بارے میں ہر وقت فکر مند رہا کرتا تھا۔ اس کا نام احسان تھا۔ احسان ایک خوش حال تاجر تھا جس کا ذاتی مکان تھا۔ مگر اب اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی بیوی اور بچیاں کہاں ہیں، کس حال میں ہیں اور زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ وہ بے چارا ان کے غم میں گھلتا ہی رہتا تھا۔ ایسے میں ہم اسے صرف دلاسا ہی دے سکتے تھے۔

جو کچھ احسان پر بیتی تھی وہی کچھ دوسرے ہزاروں قیدیوں پر بھی تو بیتی تھی۔ جس ذہنی اذیت سے وہ دوچار تھے اس نے ان پر شدید جسمانی اثرات بھی مرتب کیے تھے۔ ان کے چہروں پر شدید مایوسی سایہ فگن رہتی تھی، مستقبل کے بارے میں ان کا یقین صفر ہو چلا تھا۔ میرے مشاہدے میں اس سے قبل ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ میں جب ان کے بارے میں سوچتا تو اپنی ساری پریشانی بھول جاتا تھا۔

انسان خود کو حالات کے مطابق ڈھال ہی لیتا ہے۔ میں نے جیل میں کچھ قیدیوں کو دیکھا

کہ جنھوں نے حالات کو قبول کرلیا اور نارمل انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا شروع کردیا۔ انہوں نے جیل میں رہنے کے طور طریقے سیکھ لیے۔ زیادہ خوراک کے حصول کے لیے کیا کرنا چاہیے اور کتنا جھوٹ بولنا چاہیے، یہ ہنر انہیں بھی آ گیا۔ میں اس کے لیے انہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ وہ اس کے علاوہ اور کیا کرتے؟ بیمار پڑتے، اذیت سے دوچار رہتے اور رفتہ رفتہ موت کی طرف بڑھتے رہتے۔ انہیں معلوم تھا کہ جس ماحول میں وہ جی رہے ہیں، اس میں زندہ رہنے کے لیے جھوٹ بولنا اور بے ایمانی کا مظاہرہ کرنا کرنسی کا درجہ رکھتا ہے تو آپ ان کی حرکات کو غلط کس طرح قرار دے سکتے ہیں؟

جو لوگ سگریٹ کے عادی تھے ان کے لیے جیل میں سگریٹ کا نہ ملنا قیامت سے کم نہ تھا۔ لوگ اپنے قیمتی لباس اور دیگر اشیا ایک سگریٹ کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ غیر معمولی خدمات تو اسی طرح حاصل کی جاسکتی تھیں۔ ڈویژن ون کے قیدیوں کو گھر سے سگریٹ منگوانے کی اجازت تھی۔ انہوں نے بہت جلد نچلے درجے کے قیدیوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ ایک مالدار قیدی مختلف سہولتوں کی فراہمی جاری رکھنے کے لیے روزانہ سگریٹ کے پانچ پیکٹ قیدیوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ یہ پیکٹ ان قیدیوں کو ملتے تھے جو کچن کو چلتا رکھنے اور باتھ روم وغیرہ کی صفائی پر مامور تھے۔ سگریٹ کے عوض اس مالدار قیدی کو خوراک کی اضافی سپلائی بھی مل جایا کرتی تھی۔

میرے لیے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ایک مذہبی لیڈر نے بھی، جو خود سگریٹ کا عادی نہیں تھا، اسی طرح گھر سے سگریٹ منگوا کر نچلے درجے کے قیدیوں میں بانٹنی اور اضافی خدمات حاصل کرنا شروع کردیں۔

غیر بنگالی افراد کو قید اور وقتاً فوقتاً تشدد کا نشانہ بنایا جانا ان کے لیے ایک عام سی بات بن گئی تھی۔ ان میں بہت سے تو حالات کے ہاتھوں دم توڑ گئے۔ جن غیر بنگالیوں کو جیل بھیجا گیا تھا، چھاپہ مار رہنماؤں کے سامنے ان کی شناختی پریڈ باقاعدگی سے ہوا کرتی تھی۔ اس موقع پر چھاپہ مار لیڈر جسے چاہتے منتخب کر کے ٹرکوں میں بھر کر لے جاتے اور پھر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۲ء کے موسم گرما تک چلا۔ جرمن نازیوں کو جس سفاکی کا مرتکب قرار دیا جاتا

ہے، وہ سفا کی ہماری سرزمین پر بھی دہرائی گئی۔ ان تمام سرگرمیوں کے لیے کوئی معمولی سا قانونی جواز تلاش کرنے کی بھی زحمت گوارانہیں کی گئی۔ یہ کھلا انتقام تھا، خون کی پیاس تھی جو جی بھر کے بجھائی گئی۔ ہم اپنے آپ کو ان زمانوں میں محسوس کرتے تھے جب روئے زمین پر قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی اور طاقت ہی قانون تھا۔ ان زمانوں میں زیرِ تصرف انسانوں پر جو ظلم روا رکھا جاتا تھا وہ سابق مشرقی پاکستان میں بھی روا رکھا گیا۔

سب کو معلوم تھا کہ قیدیوں میں کچھ جاسوس بھی تھے جو دوسرے قیدیوں کو بھڑ کاتے تھے تاکہ ان کے خلاف کارروائی اور مزید تشدد کا جواز تلاش کیا جا سکے۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں ایک المناک واقعہ رونما ہوا۔ چند قیدیوں کو بغاوت پر اکسایا گیا اور جواب میں جیل حکام نے ان پر فائر کھول دیا۔ آٹھ قیدی موت کے منہ میں چلے گئے۔ ان میں ڈھاکا یونیورسٹی کا ایک طالب علم بھی تھا جس سے میں ایک دن قبل ہی ملا تھا۔ سفاک مزاج رکھنے والے ایک وارڈر نے اگلے دن خاصے پُرلطف انداز میں مجھے بتایا کہ ایک قیدی کو ٹانگ میں گولی لگی تھی مگر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تاکہ کوئی عینی شاہد نہ بچے۔ جو لوگ مارے گئے ان میں سے بیشتر کا اس گڑبڑ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ قیدیوں پر اچانک حملہ کر دیا گیا۔ انہیں علم ہی نہ ہو سکا کہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔ وارڈرز نے مبینہ بغاوت کو محض بہانے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

ڈھاکا جیل کے قیدیوں کی بغاوت کو پریس میں عجیب انداز سے پیش کیا گیا۔ اب قیدی سمجھ گئے تھے کہ کسی بھی قسم کے احتجاج سے گریز کرنا چاہیے اور یہ کہ صورت حال جیسی بھی ہو اُسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ چند دنوں میں لوگوں نے اس واقعے کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب ہمارے احساسات رفتہ رفتہ مردہ ہوتے جا رہے تھے اور ہم میں سفا کی کا عنصر بڑھ رہا تھا۔

بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی
منظم کردہ، تربیت یافتہ اور
مسلح کردہ ''مکتی باہنی''
(لشکرِ آزادی) کے ارکان
پاکستان کے حامی نوجوانوں کی
تلاش میں اور ان سے نمٹتے ہوئے

پانچواں باب

محض بھیڑ کو مجلس قرار نہیں دیا جا سکتا!

معروف مصنف آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) نے اپنی کتاب De Profundis میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جیل میں گزارے ہوئے وقت کی قباحت یہ نہیں ہے کہ انسان کے جذبات مجروح ہو جاتے ہیں بلکہ جیل کی زندگی انسان کے جذبات کو ختم کر کے دل کو پتھر بنا دیتی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ میں نے بنگلہ زبان میں کیا تھا۔ اگر اصل کتاب میرے پاس ہوتی تو میں لفظ بہ لفظ حوالہ دیتا۔ میں نے جیل میں ہزاروں نوجوانوں کو دیکھا جو غداری کے الزام میں پکڑے گئے تھے۔ ان سے جو سلوک روا رکھا جا رہا تھا، اس کی روشنی میں یہ کہنا چنداں دشوار نہ تھا کہ وہ جیل سے باہر قدم رکھتے ہی جرم کی دنیا میں بھی بہت آگے جا چکے ہوں گے۔ میں نے جیل میں جن نوجوانوں سے بھی بات کی، ان میں تقریباً سب کا ہی یہ کہنا تھا کہ جیل سے باہر جا کر وہ سب سے پہلے ان لوگوں سے انتقام لیں گے جنہوں نے انہیں گرفتار کرایا تھا۔ اس ارادے کے اظہار میں وہ ذرا بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سب کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ اُن پر انتقام جیسے قبیح جذبے سے دور رکھنے کے پند و نصائح کا جیل کی چار دیواری میں کوئی اثر مرتب نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے ذہن پر انتقام سوار تھا۔ ان میں بیشتر غیر شادی شدہ تھے۔ بیوی بچے تو تھے نہیں جن کی فکر لاحق ہوتی۔ بوڑھے ماں باپ کے بارے میں انہیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ ان پر کیا بیتی۔ ایسے میں انہیں صرف انتقام لینے سے غرض تھی۔ اس ماحول میں مجھ جیسے بوڑھے شخص کی کسی بھی نصیحت کا اُن پر بھلا کیا اثر ہونا تھا۔

بہاریوں کو بچے کھچے پاکستان بھیجنے کی بات کی جانے لگی تھی۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی تقاریر میں برملا کہنا شروع کر دیا تھا کہ بہاریوں کو اب پاکستان چلے جانا چاہیے ان کے لیے بنگلہ دیش میں کوئی جگہ نہیں۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی تھی کہ بنگلہ دیش کی

جنگ آزادی میں ان بہاریوں نے بنگالیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی دلیل کو درست مان لینے کا مطلب تھا کہ کہیں بھی خانہ جنگی میں حصہ نہ لینے والوں کو ملک سے نکال دیا جائے۔ اگر انٹرنیشنل ریڈ کراس نے بروقت امداد نہ پہنچائی ہوتی تو اذیتی کیمپوں میں ہزاروں بہاری موت کے گھاٹ اتر گئے ہوتے۔ ریڈ کراس کی چاول، دودھ، گندم اور دیگر اشیا پر مشتمل معمولی سی مقدار میں یومیہ خوراک نے لوگوں کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ ایسا نہیں کہ ریڈ کراس کی جانب سے فراہم کردہ خوراک کم تھی، بلکہ اس کی ترسیل اور تقسیم میں بے قاعدگی اور بے ایمانی سے کام لیا گیا۔ کیمپوں میں خوراک کی کمی سے بہت سے بچوں کی ہلاکتوں کی خبر بھی ہم تک پہنچی۔

ملک بھر میں جس سطح کی درندگی اور سفاکی کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا، اس کی روشنی میں یہ خیال اکثر میرے ذہن میں آ کھڑا ہوتا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اپنی قوم کے لیے کس نوعیت کی نجات کے حق میں ہے؟ کیا اس کے ذہن میں وہی طریقہ سما گیا تھا جو ہٹلر کے ذہن میں یہودیوں کے لیے تھا؟ میں سوچتا تھا کہ بنگالیوں کا یہ کیسا "بابائے قوم" ہے جو صرف نفرت اور ظلم کی بنیاد پر ہی کام کرنا چاہتا ہے؟ کیا کسی قوم کی رہبری کے یہی اطوار ہوا کرتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جس قوم کا لیڈر اور صدر ہی ایسا ہو، اس کا کوئی (بہتر) مستقبل ہو ہی نہیں سکتا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے ایک خوش حال علاقے کو تباہی سے دوچار کر دیا تھا، جو اب بیرونی امداد پر منحصر رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ صنعتوں کا پہیہ جام ہو چکا تھا، زراعت غیر فعال ہو چکی تھی، تجارت تھمی ہوئی تھی، مواصلات کا نظام ختم ہو چلا تھا اور ان تمام خرابیوں کے باوجود شیخ مجیب الرحمٰن کا دعویٰ تھا کہ اس نے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ پوری قوم کی طرف سے اس کے لیے تعریف کے ڈونگرے برسانے چاہئیں۔

۱۹۷۲ء میں ہزاروں قیدی ڈھاکا سینٹرل جیل میں لائے گئے۔ ان میں کچھ سے میرے تعلقات تھے تاہم جیل کے قواعد ہمارے میل جول میں مانع تھے۔ یہ لوگ ہمارے بلاک سے متصل کوٹھریوں میں تھے۔ ہم صرف ان کی آوازیں سن سکتے تھے۔ کبھی کبھی لان پر کچھ افراد سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ جیل کے تمام قیدی صرف عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر ہی آپس میں مل پاتے تھے، جب نماز ادا کرنے کے لیے انہیں جیل کے میدان میں گھنٹہ بھر کے لیے لایا جاتا تھا۔ سیون سیلز نام کے بلاک میں بند قیدی ہی مجھ سے زیادہ قریب تھے۔ ہم سے قریب

ترین بلاک سکس سیلز اور اولڈ ٹوئنٹی تھا۔ ان دونوں بلاکس کے قیدیوں سے کبھی کبھی صبح اور سہ پہر کو لان پر وارڈرز کی نظر بچا کر چند لمحات کی ملاقات ہو جاتی تھی حالانکہ اس نوعیت کی ملاقات جیل کے قواعد کے خلاف تھی۔ تاہم چند ہیڈ وارڈرز اس کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ بعض ہیڈ وارڈرز ایسے بھی تھے جو بلاک سے باہر کسی قیدی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔

صبح شام کی چہل قدمی کے دوران فضل القادر چوہدری، خان عبدالصبور خان اور خواجہ خیرالدین جیسے سرکردہ سیاست دانوں سے بھی آشنائی ہوگئی، بیشتر کو ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ جیل میں پاکستان کے سابق ڈپٹی اسپیکر اے ٹی ایم عبدالمتین، ڈھاکا کے مشہور وکیل اور کونسل مسلم لیگ سے وابستہ شفیق الرحمٰن، پبنا کے اے متین، عوامی لیگ کے سابق رہنما ایس بی زمان، سلہٹ کے نصیرالدین چوہدری اور فرید پور کے فائق الزماں بھی شامل تھے۔ یہ تمام ایک پس منظر رکھنے والے سیاست دان تھے۔ جماعت اسلامی کے روزنامہ "سنگرام" کے سابق ایڈیٹر اختر فاروق، بنگلہ جاتیہ لیگ کے شاہ عزیز الرحمٰن، مولانا معصوم، راجشاہی کے عین الدین، مشرقی پاکستان کے آخری گورنر ڈاکٹر عبدالمالک مرحوم کی کابینہ کے ارکان مجیب الرحمٰن اور مشرف حسین اور ٹھیکیدار ابراہیم حسین بھی ان شخصیات میں شامل تھے جن سے مجھے جیل میں ملنے اور واقفیت بڑھانے کا موقع ملا۔ ان میں صرف نصیرالدین چوہدری اور عین الدین میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔

سیون سیلز بلاک میں یونیورسٹی کے دو اساتذہ ڈاکٹر قاضی دین محمد اور ڈاکٹر مہر علی کے علاوہ ایک بینکار اور ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ بھی تھے۔ ان سب کو غداری کے الزام میں لایا گیا تھا۔ ہم سب کی عمروں، تعلیمی پس منظر اور سماجی حیثیت میں بھی خاصا فرق تھا۔ گو کہ ہم سب کو غداروں کی حیثیت سے گرفتار کیا گیا تھا، مگر ہماری سیاسی سوچ یکساں نہیں تھی اور ضروری نہیں تھا کہ ہم سب پاکستان کے بنیادی تصور یا نظریے سے ایک جیسی وابستگی رکھتے ہوں۔ مثلاً حفیظ الاسلام بینکار تھے اور عوامی لیگ کی اس رائے سے متفق تھے کہ ۲۳ سال تک مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کا بری طرح استحصال کیا اور وہ اس سلسلے میں مختلف حوالوں سے اعداد و شمار بھی پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ مغربی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف ایک مقدمے میں گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے اور انہیں شیخ مجیب الرحمٰن کے حکم پر

گرفتار کیا گیا تھا اور اس گروپ میں سب سے پہلے رہائی بھی انہی کو ملی۔ انہیں ۹ مارچ ۱۹۷۲ء کو ڈھاکا جیل سے رخصت کر دیا گیا تھا۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ شمس الدین کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ ابتدا میں لوگ یہ سمجھے کہ انہیں جاسوس کی حیثیت سے لایا گیا ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بات تھی۔ البتہ مذہب اور دیگر امور کے بارے میں ان کی رائے خاصی مبہم تھی اور اِس حوالے سے ذہنوں میں شبہات کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔

ایس بی زمان خاصے متمول ٹھیکیدار تھے۔ ۱۹۷۰ء کی اسمبلی میں عوامی لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ لیکن آرمی کریک ڈاؤن کے بعد انہوں نے پارٹی لائن کے مطابق جلاوطنی اختیار کرنے کے بجائے شیخ مجیب الرحمٰن کی انتہاپسندی کے خلاف بیانات دینے شروع کر دیے اور پاکستان کو متحد رکھنے پر زور دیا۔ ان کی تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ سیاست سے زیادہ دولت کمانے سے غرض تھی۔ عمر ۴۵ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ حالات نے انہیں سیاسی مخالفین کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اسی لیے وہ کبھی کبھی شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں خاصی تلخ باتیں کر جاتے تھے، تاہم ان کی تنقید دل کی گہرائیوں سے نہیں ہوتی تھی۔

ایس بی زمان کی طرح شاہ عزیز الرحمٰن کا تعلق مسلم لیگ سے نہیں تھا بلکہ ان کے کیریئر میں کئی جماعتیں آئیں اور چلی گئیں۔ پہلے وہ مسلم لیگ میں تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ عوامی لیگ کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے اور وہ انتخابات میں بھرپور کامیابی حاصل کر سکتی ہے تو عوامی لیگ میں چلے گئے۔ پھر اسے چھوڑ کر عطاء الرحمٰن خان کے ساتھ ہو گئے۔ شاہ عزیز الرحمٰن جب مسلم لیگ کے ساتھ تھے تو پاکستان کے حامی تھے۔ بعد میں انہوں نے خود مختار بنگال کی وکالت شروع کر دی۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ موقع پرست سیاست دان تھے اور ہر اُس پارٹی کا ساتھ دیتے تھے جس کی مقبولیت زیادہ ہو اور جس کے ذریعہ زیادہ فوائد بٹورے جا سکیں۔ یہ الگ بات کہ ان کے فیصلے غلط ثابت ہوتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ عوامی لیگ کو اس وقت ہرگز نہ چھوڑتے، جب اس کے عروج کا زمانہ تھا اور اس سے بے حساب فوائد بٹورے جا سکتے تھے۔ ان کا ریکارڈ اور مزاج دیکھتے ہوئے کوئی بھی عوامی لیگ کے بارے میں ان کے تنقیدی رویے کو کیسے سنجیدگی سے لے سکتا تھا؟ وہ موڈی،

جذباتی، مشتعل مزاج اور خاصے بدحواس واقع ہوئے تھے، یہی سبب ہے کہ کبھی کبھی حالات کے دباؤ کے تحت رو بھی پڑتے تھے۔ کبھی انہیں ماضی پر بے حد پچھتاوا ہوتا، کبھی شدید بے چارگی کا احساس ہوتا اور وہ انتہاہ مایوسی میں ڈوب جاتے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھنا خاصا تکلیف دہ عمل تھا۔ یہ مایوسی اور بدمزاجی کبھی کبھی انہیں قیدیوں سے الجھا دیتی تھی اور پھر تو تو میں میں کو چیخ پکار میں تبدیل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔

ایس بی زمان عموماً رات کے وقت رویا کرتے تھے۔ پہلے پہل تو میں یہ سمجھا کہ شاید گھر سے کوئی بُری خبر موصول ہوئی ہے اور وہ اس خبر پر آنسو بہا رہے ہیں۔ لیکن میں نے دھیان سے دیکھا تو پتا چلا کہ شام کو جب تمام کوٹھریاں بند کر دی جاتی تھیں، اس وقت ایس بی زمان گھنٹوں روتے رہتے تھے۔ جب وہ جیل کے معمولات کے عادی ہو گئے تو رونے کا دورانیہ بھی نمایاں طور پر گھٹ گیا۔ فرید پور کے معروف وکیل عبدالرحمٰن بکل بھی کچھ ایسا ہی مزاج رکھتے تھے۔ وہ جذباتی طور پر خاصے کمزور واقع ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بھی بہت تیزی سے آنسو آجاتے تھے۔ مگر وہ ایس بی زمان کی طرح ہچکیاں لے لے کر نہیں روتے تھے۔ ہاں، ان کی آہیں اور باآواز بلند اظہارِ افسوس ان کے ساتھیوں کو جگائے رکھتا تھا۔

راجشاہی کے عین الدین کو ہمارے بلاک میں ستمبر ۱۹۷۲ء میں منتقل کیا گیا۔ انہوں نے رونے کے دوران ہچکیاں لینے کے حوالے سے ایک باضابطہ نظریہ وضع کیا تھا۔ وہ رات کے دو اور تین بجے کے درمیان بیدار ہوتے اور کچھ دیر عبادت کرنے کے بعد روتے اور اس دوران ہچکیاں لیتے جاتے۔ اس کی وضاحت انہوں نے یہ کی کہ اس طور اللہ کو اپنے حالِ زار کی طرف متوجہ کرنا آسان ہے۔ ہم نے سمجھایا کہ اللہ کو دلوں کا حال معلوم ہے، اسے متوجہ کرنے کے لیے اس قدر آہ و بکا ضروری نہیں تو انہوں نے التجا کا انداز تبدیل کیا اور آہ و بکا میں کمی آئی۔

جیسا کہ میں پہلے ہی وضاحت کر چکا ہوں، سقوطِ ڈھاکا کے بعد ڈھاکا سینٹرل جیل میں جن لوگوں کو غداری کے الزام میں لایا گیا تھا، ان سب کے سیاسی نظریات میں واضح فرق تھا۔ ان میں سے بیشتر کے سیاسی نظریات خاصے متزلزل قسم کے تھے۔ ذرا سا موقع ملنے پر وہ عوامی لیگ کی ٹرین میں سوار ہو سکتے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن پر تنقید کرتے وقت بھی وہ اس کے لیے نرم

گوشہ رکھتے تھے۔ تاہم مجھے اس بات پر حیرت ضرور ہوتی تھی کہ ان میں سے بیشتر عوامی لیگ کے اس پروپیگنڈے کا شکار تھے کہ مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کا استحصال ہوا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں عوامی لیگ کے پروپیگنڈے سے اقتباسات پیش کرنے لگتے تھے۔ میں یہ سب سُن کر حیران رہ جاتا تھا۔

جیل میں مجھے جن لوگوں کے ساتھ رکھا گیا تھا، ان میں سے بیشتر میں اصولوں اور مستقل مزاجی کا فقدان تھا۔ موقع پرستی، تنگ نظری، خودغرضی اور جیل میں رہتے ہوئے بھی کسی نکتے پر متفق نہ ہونے کا رجحان دیکھ کر، مجھے پاکستان کے ٹوٹنے کے اسباب سمجھنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ بہت چھوٹے لوگ تھے اور حالات نے ان کی جھولی میں بہت بڑے بڑے معاملات ڈال دیے تھے اور ان معاملات کو طے کرنے میں انہیں واضح ناکامی کا سامنا تھا۔ دھوکا دہی، سازش، غداری، نظریات اور اصولوں سے دستبرداری، سبھی کچھ اس فضا میں موجود تھا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ چند مضبوط شخصیات ہوتیں تو معاملات بالکل درست ہو جاتے، البتہ یہ بات میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ نظریہ پاکستان سے وابستگی کے جن دعویداروں کو معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا تھا، اگر وہ مضبوط کردار کے مالک ہونے کے ساتھ کچھ کم خودغرض اور کم تنگ نظر ہوتے تو شاید معاملات کی وہ نوعیت نہ ہوتی جو بالآخر ہمارے سامنے آئی۔ میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے بین الاقوامی سطح پر احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہو یا جو ہم وطنوں کی نظر میں مطلوب کردار، مستقل مزاجی اور اصول پسندی کا حامل رہا ہو۔

خان عبدالصبور خان ۶۵ سال کے تھے اور کئی عارضوں میں مبتلا تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے بُری عادات ترک کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ وہ شراب و شباب کی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ پروفیشنل اسمگلر تھے اور پاکستان کی مرکزی کابینہ میں شامل کیے جانے کے بعد بھی اپنے اطوار بدلنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جو لوگ ان کے نزدیک تھے، ان کے بارے میں طرح طرح کی داستانیں سنایا کرتے تھے کہ کس طرح راولپنڈی میں وہ اور دیگر تمام سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے ان کے حاشیہ بردار روزانہ شام کو پینے پلانے کے لیے ان کی

رہائش پر جمع ہوا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران بھی انہوں نے بھارت سے خفیہ روابط برقرار رکھے تھے۔ خان عبدالصبور خان کے نیٹ ورک میں شامل اسمگلرز نے مشرقی پاکستان سے بھارت کو پٹ سن اور چاول کھلنا کے راستے اسمگل کرنے کا سلسلہ متحدہ پاکستان کے ۲۳ سال کے دوران جاری رکھا اور بے حد دولت کمائی۔ خان عبدالصبور کے بارے میں جو کچھ بیان کیا جاتا تھا اسے یکسر مسترد کرنا ممکن نہ تھا، کیونکہ بیان کرنے والے ان کے قریبی ساتھی تھے۔ خان عبدالصبور کے کھاتے میں یقیناً ایسا کچھ تھا جس کے باعث انہیں کوئی رعایت دینا بہت مشکل کام تھا۔ وہ نظریۂ پاکستان پر یقین رکھنے اور عوامی لیگ کے مخالف ہونے کا دعویٰ کرتے تھے مگر عمل کی دنیا میں انہوں نے جو کچھ کیا، اس نے لوگوں کو کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور کیا۔ قول و فعل کا یہ تضاد ہی تھا جس نے عوام کو ان کے بارے میں سنجیدہ ہونے سے باز رکھا۔ ان کی زبان پر کچھ ہوتا تھا اور عمل کچھ اور ہی کہانی سنا رہا ہوتا تھا۔ اس تضاد نے عوام کو ان سے بدظن کر دیا تھا۔

یہ کہنا مبالغہ آرائی ہوگا کہ خان عبدالصبور قومی سطح کی شخصیت تھے، وہ تو مشرقی پاکستان میں بھی کوئی مقبول لیڈر نہ تھے۔ ہاں، کھلنا کے علاقے میں ان کا اثر و رسوخ ضرور غیر معمولی تھا۔ عوامی لیگ نے ان کی سیاسی حیثیت پر ٹھیک ٹھاک بُرا اثر ڈالا تھا، تاہم اس کے باوجود ان کے اثرات کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ میرے لیے یہ بات باعثِ حیرت تھی کہ خان صبور کے بارے میں اتنا بہت کچھ جاننے کے بعد بھی لوگ ان کی ذات پر اعتماد اور یقین کس طرح کر لیتے تھے! یہ عقدہ بھی جیل میں موجود ان کے حاشیہ برداروں کی باتوں سے کھلا۔ بات یہ تھی کہ خان عبدالصبور نے لوگوں کو بہت نوازا تھا اور لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ کسی کے بھی حالات بدل سکتے ہیں۔ جیل میں آفتاب الدین اور ابراہیم حسین بھی تھے، جن پر خان عبدالصبور کی خاص مہربانی تھی۔ آفتاب الدین مل کے مالک تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہے، خان عبدالصبور کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ یہی حال ابراہیم حسین کا تھا۔ انہوں نے بھی خان عبدالصبور کی مدد سے اپنے حالات بہتر بنائے تھے۔ ابراہیم حسین نے رفاقت کا حق یہ کہتے ہوئے ادا کیا تھا کہ خان عبدالصبور اپنے دائیں بازو کے نظریات کے باعث مشکلات سے دوچار ہوئے اور

اپنے آدرشوں سے لازوال وابستگی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خان عبدالصبور سے ان دونوں کی وفاداری غیر متزلزل تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ جس شخص کے ایسے پرستار اور مداح ہوں، اس میں کوئی تو بات ہوگی۔ سیاست میں وفاداری بہت بڑا اثاثہ ہے، اور ایک سیاست ہی پر کیا موقوف ہے، آج کے زمانے میں کسی بھی شخص سے غیر متزلزل وفاداری بہت بڑا سرمایہ ہے۔

یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ خان عبدالصبور جیسے لوگ کسی کی سرپرستی محدود مقاصد کے لیے کر سکتے تھے اور اس سے ان کی سیاسی کمزوری اور غیر دیانت داری کا ازالہ ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ جبھی انہیں اس معاملے میں سراسر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ خان عبدالصبور نے پاکستان کی مرکزی کابینہ میں اہم منصب حاصل کیا اور ان کے اختیارات بھی اچھے خاصے تھے، مگر اس کے باوجود ان میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور وہ چھوٹے آدمی ہی بن کر رہے۔ انہوں نے اپنے مخالف (مشرقی پاکستان کے ایک سابق گورنر) عبدالمنعم خان کو سازش اور دھوکا دہی کے ذریعے مضبوط ہونے سے روکا۔ یوں انہوں نے عبدالمنعم خان کو پاکستان کے دفاع کے لیے عمدہ منصوبہ بندی سے بھی روک دیا۔ جیل میں خان عبدالصبور اپنی مشکلات اور پریشانیوں سے بہت دل برداشتہ دکھائی دیتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ ایسے جینے سے تو مرجانا ہی بہتر ہے۔ مگر دوسری جانب وہ شیخ مجیب الرحمٰن سے مصالحت کے لیے خفیہ روابط بھی قائم کیے ہوئے تھے۔

متحدہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے آخری اسپیکر فضل القادر چوہدری جولائی ۱۹۷۳ء میں جیل میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے آدرش واضح اور لوگ انہیں قومی سطح پر جانتے اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں انہیں خان عبدالصبور سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ خان عبدالصبور کو ان کے حلقے سے باہر کم لوگ ہی سننا پسند کرتے تھے۔ جبکہ فضل القادر چوہدری کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ ان کا قد چھ فٹ تھا۔ لوگ ان کی موجودگی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ لوگ فضل القادر چوہدری کے بارے میں نہیں جانتے تھے کہ انہوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کیا اور مال نہیں بنایا لیکن کوئی بھی انہیں خان عبدالصبور کی طرح جرائم پیشہ قرار نہیں دیتا تھا اور نہ ان کی غیر اخلاقی سرگرمیوں کی کہانیاں عوام میں مشہور تھیں۔ ان کا تعلق چاٹگام کے علاقے سے تھا، جہاں انہیں خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ اس

علاقے کے لوگوں کا کچھ کلچر فضل القادر چوہدری کے مزاج میں بھی در آیا تھا۔ وہ گفتگو کے دوران زوردار قہقہے لگانے کے عادی تھے، جو بہتوں کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ بہت سی نامور شخصیات پر تنقید کرتے کرتے ان کا مذاق اڑانے پر اتر آتے تھے۔ جو لوگ ان کے قریب تھے ان کا کہنا تھا کہ فضل القادر چوہدری کے سینے میں نرم دل تھا اور وہ لوگوں کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ عوام کی نظر میں اس بات کی زیادہ اہمیت تھی کہ انہوں نے پاکستان سے وفاداری نبھائی تھی اور نظریہ پاکستان کو دل سے لگا کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ سے ان کی وابستگی تمام شکوک سے بالاتر تھی۔ ایوب خان کے زمانے میں جب مسلم لیگ تقسیم ہوئی تو فضل القادر چوہدری نے سرکاری سرپرستی میں قائم ہونے والی کنونشن مسلم لیگ سے وابستگی اختیار کی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ پاکستان سے متعلق آدرشوں پر ان کا یقین آخر تک متزلزل نہیں ہوا تھا۔

دکھ اس بات کا ہے کہ جب مقدمہ شروع ہوا تو پہلے ہی دن فضل القادر چوہدری نے پاکستان سے اپنی جذباتی اور نظریاتی وابستگی کو داؤ پر لگا دیا اور شیخ مجیب الرحمٰن کے اعلان آزادی کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ تاہم جج پر اس بیان کا کچھ بھی اثر مرتب نہ ہوا۔ ہمیں بھی بہت دکھ ہوا۔ بعد میں ان سے گفتگو کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کے نظریات تبدیل نہیں ہوئے اور عدالت میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ عارضی کیفیت تھی، جو شدید بدحواسی سے پیدا ہوئی تھی۔ اس ایک واقعے سے مسلم سیاست کی کمزوری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی صورت حال میں کانگریس کے کسی اعلیٰ سطح کے لیڈر سے ایسی حماقت کی توقع کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں کئی ایسے تھے جنہوں نے نظریات کو خیرباد کہنے کے بجائے اس دنیا کو خیرباد کہنے کو ترجیح دی اور پھانسی کے تختے پر جھول گئے۔ فضل القادر چوہدری میں وہ شجاعت اور پختگی نہیں تھی جو شہیدوں میں ہوا کرتی ہے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ بس یہ ایک دھبہ ہی بُرا ہے، ورنہ ان کا سیاسی کیریئر پاکستان سے لازوال محبت سے عبارت رہا ہے۔

پاکستان کی قومی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کے منصب تک پہنچنے والے اے ٹی ایم عبدالمتین سیاست دان کم اور بزنس مین زیادہ تھے۔ قومی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کے منصب تک پہنچنے کے سوا ان کے سیاسی کیریئر میں کوئی قابل ذکر بات نہ تھی۔ اے ٹی ایم متین کی شخصیت میں پتا نہیں

ایسا کیا تھا کہ لوگ ان میں کشش محسوس نہیں کرتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کے نقوش اچھے نہیں تھے یا انہیں کسی بھی اعتبار سے غیر پرکشش چہرے کا حامل قرار دیا جاسکتا ہو۔ لیکن مجموعی طور پر ان میں کچھ چھوٹا پن تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دن اور رات میں خاصا وقت عبادت میں گزارتے۔ پتا نہیں کیوں، لوگوں کا خیال تھا کہ وہ یہ سب کچھ دکھاوے کے لیے کرتے ہیں۔ بیشتر لوگ انہیں منافق تصور کرتے اور سمجھتے تھے کہ ان کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ جب وہ بات کرتے تو یہ تاثر دیتے کہ ان کے خیالات پر عمل ہوتا تو سقوطِ ڈھاکا کا سانحہ رونما ہی نہ ہوتا۔ اے ٹی ایم عبدالمتین ہمارے بلاک میں کئی ماہ رہے، مگر مجھے ان میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان ابلاغ کا بھی خلا تھا جو کسی طور ختم نہ کیا جاسکا۔ اے ٹی ایم متین کے عقائد بھی عجیب و غریب سے تھے۔ کوّوں کو وہ نحوست کی علامت گردانتے تھے اور انہیں بلاک کی چھت پر دیکھتے ہی اڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ارواحِ خبیثہ پر یقین رکھتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ ان کی بعض نمازیں ان ارواح کے شر سے بچنے کے لیے ہیں۔ وہ بعض دعائیں عجیب و غریب حرکات و سکنات کے ساتھ مانگتے تھے اور انہیں اس حالت میں دیکھ کر کوئی بھی ان کے عقائد کی خرابیوں کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

اے ٹی ایم عبدالمتین کے سیاسی نظریات تضادات کا مجموعہ تھے۔ وہ فیلڈ مارشل ایوب خان کی غیر دانش مندی اور شیخ مجیب الرحمٰن کی غداری کی شدید مذمت کرتے تھے۔ مگر جب وہ مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے نام نہاد استحصال کی بات کرتے تو صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ عوامی لیگ کے نظریات سے متفق ہیں۔ ایک طرف تو وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھارت کا ایجنٹ قرار دیتے اور دوسری جانب اپنے نمائندے بھی ان کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اے ٹی ایم عبدالمتین کے بارے میں صحیح رائے کیا ہوسکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی بھی اعتبار سے سیاست میں اپنا مستقبل تلاش نہیں کرسکے تھے۔ سیاست کے میدان میں اے ٹی ایم عبدالمتین کا ماضی جو کچھ بھی تھا اُسی نے تو پاکستان کو یہ دن دکھائے تھے!

نصیرالدین چوہدری کے سیاسی کیریئر میں واحد کامیابی یہ تھی کہ وہ ایوب خان کی جانب سے آئین کو پامال کیے جانے سے قبل تیز رفتاری سے بننے اور ٹوٹنے والی حکومتوں میں وزیر کے

منصب پر فائز رہے تھے۔ وہ اے ٹی ایم عبدالمتین کے مقابلے میں خاصے بے باک اور منہ پھٹ انسان تھے۔ صفائی کا انہیں ذرا بھی خیال نہیں رہتا تھا۔ وہ زمین پر پڑے ہوئے سگریٹ کے ٹوٹے اٹھا کر پینے لگتے تھے، کہیں بچا کھچا کھانا رکھا ہو، خواہ گندا ہی کیوں نہ ہو، کھانا شروع کر دیتے تھے۔ کپڑے دھونے کے وہ قائل ہی نہیں تھے اور ایک ہی لنگی میں وہ کئی کئی دن گزار دیتے تھے۔ ان کے طرزِ عمل سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ شاید نارمل انسان نہیں۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر، نصیرالدین چوہدری کے سیاسی نظریات اے ٹی ایم عبدالمتین کے نظریات کے مقابلے میں خاصے مختلف تھے۔ نظریہ پاکستان کے دفاع کے معاملے میں ان کا رویہ اے ٹی ایم عبدالمتین کی طرح معذرت خواہانہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ نصیرالدین مشرقی اور مغربی پاکستان کے موازنے کے حوالے سے عوامی لیگ کے پروپیگنڈے سے ذرا بھی متاثر نہیں تھے۔ وہ متحدہ پاکستان پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے۔ ایک دن انہوں نے پاکستان کی سیاست کا ایسا تجزیہ کیا جس میں توازن نمایاں تھا اور میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نصیرالدین چوہدری کی بہت سی عادات عجیب وغریب تھیں اور اس حوالے سے لوگ برہمی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کبھی کبھی وہ اس طرح اظہار خیال کرتے تھے کہ ان کے سیاسی عقائد کی پختگی پر کوئی شک نہیں کر پاتا تھا۔

جیل میں اور بھی کئی شخصیات تھیں جن کی قابلیت مسلّم تھی، تاہم ان میں عقائد کی پختگی کا فقدان تھا۔ پبنہ کے عبدالمتین کو اے ٹی ایم عبدالمتین سے الگ شناخت کرنے کے لیے کروڑ پتی متین کہا کرتے تھے۔ وہ مالدار بھی تھے اور سیاست میں خاصا وقت گزارا تھا۔ جو کچھ کہا کرتے تھے اس میں شیخی بگھارنے اور دوسروں پر اپنی رائے تھوپنے کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ اپنی دولت کے بارے میں جو قصے سنایا کرتے تھے، انہیں ہضم کرنا خاصا دشوار مرحلہ ہوتا تھا۔ میں قصے سن کر مبہوت سا ہو جاتا تھا۔ کروڑ پتی متین سیاست میں صرف انتخاب اور منصب کی حد تک دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی باتوں سے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ انہیں اصولوں وغیرہ کی کچھ پروا نہیں ہے۔ حالات نے انہیں مسلم لیگ میں پہنچا دیا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ عوامی لیگ میں ہی زیادہ موزوں رہتے۔ میں پاکستان سے ان کی وفاداری پر شک کا اظہار نہیں کر رہا۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ جب سیاست میں اُن کی آمد کا بنیادی مقصد معاشی مفادات کو تحفظ فراہم کرنا

اور مزید پروان چڑھانا ہی تھا تو مسلم لیگ کے بجائے عوامی لیگ ان کے لیے زیادہ موزوں تھی، اس میں ان کے لیے زیادہ مواقع تھے۔ کروڑ پتی متین بہت سی ایسی افواہیں پھیلاتے تھے جن میں سچ کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا اور یہ کام وہ اس یقین سے کرتے تھے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ ناقابل تردید حقیقت ہے۔ افواہیں فطری طور پر دَم توڑ دیتی تھیں، مگر کروڑ پتی متین کو مزید افواہیں پھیلانے سے باز رکھنا ممکن نہیں تھا۔

سیون سیلز کے آس پاس ڈھاکا کے جن قانون دانوں کو رکھا گیا تھا، ان میں شفیق الرحمٰن ایک نمایاں شخصیت تھے۔ ان کی پیشہ ورانہ قابلیت اور پختگی کا سبھی احترام کرتے تھے۔ جب بھی کوئی قانونی معاملہ زیر بحث ہوتا، ہم ان سے مشاورت ضرور کرتے۔ وہ اس معاملے میں خاصے فراخ دل اور بعض امور میں تو وہ باضابطہ بیان بھی تیار کر دیتے تھے۔ شفیق الرحمٰن خاموش طبع، پرسکون اور متحمل مزاج انسان تھے۔ وہ عام سیاست دانوں سے بہت مختلف تھے جو صرف شور مچانے کو حقیقی قابلیت تصور کرتے ہیں۔ جیل میں انہوں نے جتنا بھی وقت گزارا، پرسکون رہے اور ساتھی قیدیوں سے چھوٹے چھوٹے معاملات پر لڑنے جھگڑنے سے گریزاں رہے۔ سیاست میں کامیابی کے لیے جو خوبیاں درکار ہوتی ہیں، وہ ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ سیاست میں عقل اور جوش کی یکساں ضرورت پڑتی ہے۔ شفیق الرحمٰن میں وہ جوش وجذبہ نہیں تھا جو عام طور پر کامیاب سیاست دانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ عدالت میں جج کو تو متاثر کر سکتے تھے، مگر کسی مجمع کو متاثر کرنے کے لیے جو مسالا درکار تھا وہ ان کے پاس نہیں تھا۔

مجمع کبھی منطقی دلائل پسند نہیں کرتا۔ عموماً انسان کو بڑبولا پن اچھا لگتا ہے، بڑھک سننے میں مزا آتا ہے۔ وہ نفرت یا حب الوطنی جیسے جذبات پھیلانے والی باتیں کرتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر (Julius Caesar) میں انتھونی (Antony) کے مقابلے میں فلسفی بروٹس (Brutus) کا کوئی مقام نہ تھا۔ شفیق الرحمٰن پس پردہ تو بہت اچھے بروکر کا کردار ادا کر سکتے تھے، مگر سیاسی سطح پر کچھ کر دکھانا شاید ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ یہ عوام کا معاملہ ہے اور وہ کبھی تبدیل نہیں ہوں گے۔

چھٹا باب

مشرقی پاکستان کے آخری گورنر کے ساتھ کچھ ایامِ اسیری

جب مجھے ''سیون سیلز'' سے ''نیوٹوئنٹی'' بلاک میں منتقل کیا گیا، تب مشرقی پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے والی کچھ نمایاں شخصیات سے میری ملاقات ہوئی۔ ان میں، آخری گورنر برائے مشرقی پاکستان، ڈاکٹر عبدالمالک، ان کی کابینہ کے رکن اختر الدین، مشرقی پاکستان کونسل مسلم لیگ کے صدر خواجہ خیر الدین اور کونسل مسلم لیگ ہی کے سرکردہ رکن مولانا نورالزماں نمایاں تھے۔ ان میں سب سے کم عمر، اختر الدین تھے جو عمر کی چوتھی دہائی کے وسط میں تھے۔ میں انہیں ان کے زمانہ طالب علمی سے جانتا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں ایک خیر سگالی مشن لے کر برما گیا تھا تو اُس چار رکنی مشن میں اختر الدین بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر عبدالمالک کو میں ۱۹۶۲ء سے ذاتی طور پر جانتا تھا، جب وہ فلپائن میں پاکستان کے سفیر ہوا کرتے تھے۔ اُس سال منیلا میں ڈاکٹر عبدالمالک سے میری ملاقات ہوئی تھی اور مجھے اُن کے سیاسی خیالات اور نظریات کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ غیر معمولی طور پر مذہبی آدمی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بھارت چین تنازع میں پاکستان کا چین کی طرف جھکاؤ خطرناک نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ پاکستان اپنی بنیاد یعنی مذہب کو مسترد کرنے والی اشترا کی ریاست سے دوستی بڑھا کر خطرناک کھیل کھیل رہا تھا؟

میں جانتا ہوں کہ سیاسی سوالوں کے آسان جواب نہیں ہوا کرتے۔ ۱۹۷۱ء میں چین ہمارا بہت اچھا دوست ثابت ہوا۔ یہ بات البتہ قابل بحث ہے کہ پاکستان میں خارجہ پالیسی کی بنیاد تبدیل ہونے کے بعد حکومت اگر بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کی سرپرستی نہ کرتی تو کیا وہ آج اتنی طاقتور ہوتیں؟ اشترا کی لٹریچر کو سرکاری سرپرستی میں ملک بھر میں تقسیم کیا گیا اور اس کے نظریے کو پھیلانے میں حکومت کی آشیرباد شامل رہی ہے۔ حکومت کا خیال یہ تھا کہ وہ بائیں بازو کے

عناصر کی سرپرستی کر کے چین سے تعلقات بہتر اور مزید مستحکم بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اِس سے پاکستان میں بائیں بازو کو تقویت ملی، تاہم بائیں بازو کے جو عناصر چین کے نظریات سے متفق نہیں تھے، انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کا ساتھ دے کر ملک توڑنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر عبدالمالک غیر معمولی طور پر مستحکم شخصیت کے مالک تھے۔ طویل سیاسی کیریئر کے دوران، ان پر کبھی کرپشن اور بددیانتی کا الزام نہیں لگا۔ وہ قائداعظم کے اعتماد پر پورے اترے اور پاکستان کی پہلی کابینہ میں بھی شامل کیے گئے۔ مسلم لیگ کا شاید ہی کوئی معاملہ ہو جو اُن کی نظر سے اوجھل رہا ہو۔ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں تحریکِ پاکستان کے دوران پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں ان کا علم بہت وسیع تھا۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ وہ کبھی مقبول سیاست داں نہیں رہے۔ مزدور تحریکوں سے ان کا گہرا تعلق رہا۔ ٹریڈ یونین ازم کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتے تھے۔ وہ خاموش طبع اور نرم مزاج کے انسان تھے۔ سیاسی مخالفین بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ کسی زمانے میں وہ کانگریس میں بھی رہے تھے، تاہم اس میں بھی انہوں نے کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا تھا۔ یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتیں ڈاکٹر عبدالمالک سے تعاون کی خواستگار رہتی تھیں، کیونکہ ان کی ایمانداری کسی شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ ان کے مخالفین ان پر صرف یہ الزام عائد کرتے تھے کہ وہ بڑے اور اہم منصوبوں کو سوچنے اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ بہت کم بولتے تھے۔ سیاست میں یہ خوبی کبھی کبھی خامی بھی ثابت ہو جاتی تھی۔ میں نے ان میں اور شفیق الرحمٰن میں مزاج کے اعتبار سے خاصی مماثلت دیکھی، حالانکہ شفیق الرحمٰن کی عمر خاصی کم تھی۔

۱۹۷۱ء کے پریشان کن حالات میں ڈاکٹر عبدالمالک کے گورنر کی حیثیت سے تقرر کی پشت پر کئی عوامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے نائب صدر نورالامین نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالمالک ان شخصیات میں سے تھے جو مشکل ترین حالات کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ڈاکٹر عبدالمالک کی جگہ کوئی اور ہوتا تو حالات بہتر ہو سکتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اپنی خاموش طبعی یا کم گوئی کے باعث ڈاکٹر عبدالمالک عوام میں پاکستان کو متحد رکھنے کا جذبہ جگانے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ مگر سوال یہ

ہے کہ اور کون تھا جو اُس وقت حالات کے دھارے کا رخ موڑتا یا اس کے مقابلے میں کھڑا ہو پاتا؟ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے کابینہ کے لیے ارکان کا انتخاب احتیاط سے نہیں کیا۔ ان میں بیشتر وہ تھے جن سے عوام ناواقف تھے اور جو سیاسی معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت سے بھی عاری تھے۔ بعض تو ایسے تھے جن کے نام ہی عوام نے پہلی بار سنے تھے۔ ان میں اعتماد تھا، نہ اپنے منصب سے متعلق فرائض کی بجا آوری کے لیے مطلوب اہلیت۔ ڈاکٹر عبدالمالک کا کہنا تھا کہ انہوں نے ایسی ٹیم منتخب کرنے کی کوشش کی تھی جس کے ارکان کی ایمانداری پر انگلی نہ اٹھائی جا سکے، اس معاملے میں بھی وہ اندازے کی غلطی کر گئے۔ ان کی کابینہ میں عبدالقاسم بھی تھے جو نہ صرف یہ کہ ایماندار نہیں تھے، بلکہ مشکل حالات میں بہتر انداز سے کام کرنے کی صلاحیت یا عزم سے بھی عاری تھے۔ عبیداللہ مُجمدار عوامی لیگ کے سرکردہ رکن تھے۔ عبیداللہ کو اس خیال سے کابینہ کا رکن بنایا گیا تھا کہ دنیا کو بتایا جا سکے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی انتہا پسندی پر، اب خود اُن کے اپنے ساتھیوں میں سخت ردعمل پنپ رہا ہے! مگر اس کا الٹا ہی اثر مرتب ہوا۔ عوام میں یہ تاثر عام ہوا کہ ڈاکٹر عبدالمالک کی کابینہ میں صرف موقع پرست اور چاپلوس قسم کے لوگ ہی جگہ بنا سکے ہیں۔ اس کابینہ پر لوگوں کو کم ہی اعتبار تھا۔ غیر معروف، بلکہ گمنام قسم کے سیاست دانوں کی کارکردگی سے عوام اور حکومت کے درمیان موجود خلا بڑھتا چلا گیا۔

عبیداللہ مُجمدار کی طرح ڈاکٹر عبدالمالک کی کابینہ میں وزیر محنت سلیمان بھی مشرقی اور مغربی پاکستان کے تعلقات کے حوالے سے عوامی لیگ کے نظریات کے حامل تھے۔ عدالت میں انہوں نے اپنے سیاسی فلسفے کے بارے میں جو طویل بیان دیا، اس نے ان تمام لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا جو ان کے پس منظر سے واقف نہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے سیاسی نظریات سے پوری طرح متفق ہیں اور ڈاکٹر عبدالمالک کی کابینہ میں فوج کے دباؤ پر شامل ہوئے تھے۔ مزید یہ کہ فوج نے دھمکی دی تھی کہ کابینہ میں شامل نہ ہونے کی صورت میں انہیں گولی ماردی جائے گی۔ یہ ایک سفید جھوٹ تھا، عوام نے بھی اس بیان کو قبول نہیں کیا۔ اس نوعیت کی بے بنیاد باتیں کر کے انہوں نے خود کو تضحیک کا نشانہ بنا لیا۔

ڈاکٹر عبدالمالک کی کابینہ میں اختر الدین (ڈاکٹر مالک کے بعد) واحد رکن تھے جو قول د

فعل میں یکساں تھے۔مگر ان کی سیاسی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بالکل گمنام شخصیت تھے۔ان کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ وہ ایک ابھرتی ہوئی سیاسی شخصیت ہیں۔ بہتوں کو یقین تھا کہ وہ خوب نام پیدا کریں گے،مگر وقت نے ثابت کیا کہ وہ مشرقی پاکستان میں رائے عامہ کو متاثر یا تبدیل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

میں یہ باتیں اس پہلو کو واضح کرنے کے لیے بیان کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالمالک نے یقیناً نیک نیتی سے کابینہ منتخب کی ہوگی، تاہم وہ عام سی اہلیت کے لوگوں پر مشتمل تھی۔وزرا میں اتنی کشش نہیں تھی کہ لوگ ان کے جلسوں میں کھنچے چلے آتے۔ان کی تقاریر میں بھی کوئی آدرش نہیں ہوتا تھا۔حالات سے لڑنے کے طور طریقے بھانے اور کسی متبادل صورت حال کے حوالے سے ان کے پاس دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔وہ آنے والے زمانے کے لیے کوئی ٹھوس اور امید افزا منظر نامہ تیار نہیں کر سکے تھے۔ان کے اقدامات نے کوئی بھی ہلچل پیدا نہیں کی۔کابینہ نے ستمبر ۱۹۷۱ء میں حلف اٹھایا تھا جب مشرقی پاکستان کا بحران اپنے نقطۂ عروج کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ کابینہ صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی لانے میں ناکام رہی۔اگر اس کے ارکان میں طاقتور اور مقبول شخصیات شامل ہوتیں تو کوئی بھی ان پر کٹھ پتلی ہونے کا الزام عائد نہیں کر سکتا تھا۔ملک کی تاریخ کے نازک ترین موڑ پر کابینہ میں غیر اہم لوگوں کا انتخاب، خود ڈاکٹر عبدالمالک کی ساکھ کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوا۔ڈاکٹر عبدالمالک نے ہم سے گفتگو میں کئی بار اعتراف کیا کہ جو لوگ انہوں نے اپنی کابینہ میں منتخب کیے تھے، وہ ممکنہ بہترین لوگ نہیں تھے۔انہوں نے بتایا کہ چند ارکان کے بارے میں خود ان کا ذہن واضح نہ تھا۔

جیل کے ماحول نے ڈاکٹر عبدالمالک کی سیاسی عزیمت کو مزید پختہ کر دیا تھا۔وہ پہلے سے کہیں زیادہ مذہبی ہو گئے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ پاکستان اور پاکستانیوں کی سب سے بڑی غلطی اپنے بانی کے نظریے سے منحرف ہو جانا تھا۔جب لفظ اسلام ایک لیبل بن گیا، اور مذہب کو ہتھیار کے طور پر ان منافقین نے بھی استعمال کیا جو اپنے جلسوں اور اقدامات میں اسلامی تعلیمات کے مخالف رہے تھے، اس طرح عوام کے لیے صداقت اور منافقت میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو گیا۔

مولانا نور الزماں میرے ایک کزن کے بچپن کے دوست نکل آئے۔ میں نے ان کے

بارے میں سُن رکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بوڑھے اور باریش ہوں گے۔ وہ باریش ضرور تھے تاہم ان کی داڑھی اتنی بڑی نہیں تھی۔ جسم خاصا متوازن اور پھرتیلا تھا اور اس میں چربی یا موٹاپا خال خال ہی تھا۔ وہ عموماً خاصے پرعزم اور پرجوش دکھائی دیتے تھے۔ وہ دیگر عام مذہبی شخصیات سے بہت مختلف تھے جو خاصی سنجیدہ رہتی ہیں اور بیشتر معاملات میں سست روی اور نرم خوئی کا مظاہرہ کرنے کو مذہبی تعلیمات کا درجہ دیتی ہیں! مولانا نورالزماں کا ذخیرہ الفاظ بھی لاجواب تھا اور وہ اسے اپنے مخالفین کے خلاف عمدگی سے بہ روئے کار بھی لاتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کا، یا کوئی بھی دوسرا واقعہ سناتے وقت قسمیں بھی کھاتے تھے اور زیب داستاں کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ ان کا یہ انداز بات کو دلچسپ بناتا تھا، تاہم بہت سے لوگ ان کی باتوں سے پریشان بھی ہو جاتے تھے۔ وہ جمعیت علمائے اسلام سے وابستہ تھے، جو ہندوستان میں کانگریس کی ذہنیت سے ہم آہنگ جمعیت علمائے ہند کی پاکستانی شاخ کا سا درجہ رکھتی تھی۔ جمعیت علمائے اسلام سے وابستگی ہی نے انہیں بھارت کی چند معروف مذہبی شخصیات سے واقفیت کا موقع فراہم کیا تھا۔

دوسری طرف مولانا نورالزماں مسلم لیگ کے بھی رکن تھے، تاہم جب مخالفین نے انہیں پارٹی سے نکال کر ہی دَم لیا، تب انہوں نے پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔ انہیں نظریاتی بنیاد پر جیل میں ڈالا گیا تھا اور کولیبوریٹرز آرڈر کے تحت کسی بھی معاملے میں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا گیا تھا۔

مولانا نورالزماں مجموعی طور پر دوستانہ مزاج کے حامل تھے۔ وہ اچھی انگریزی جاننے کے باوجود عام مولویوں سے مختلف نہیں تھے۔ ذرا واقفیت بڑھی تو اندازہ ہوا کہ خاندانی پس منظر اور تربیت نے انہیں مذہب کے معاملے میں خاصا تنگ نظر بنا دیا تھا۔ ان سے مذہبی امور پر عقلی انداز سے بات کرنا خاصا دشوار تھا۔ وہ خاصے بنیاد پرست تھے۔ انہیں اس بات سے نفرت تھی کہ قرآن کی تفسیر یا احادیث کی تشریح علامتی یا تجریدی انداز سے کی جائے۔ اگر کوئی ایسا کرتا تھا تو وہ سختی سے مخالفت کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی اس معاملے میں طویل بحث کر کے لوگوں کو بیزاری سے دوچار کر دیا کرتے تھے۔ قرآن کی جن آیات سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ علامتی طور پر بیان کی گئی ہیں، مولانا انہیں بھی لفظ بہ لفظ لیتے۔ اگر کوئی عقائد کی تشریح

عقلی یا مختلف انداز سے کرتا تو وہ اسے دین سے انکار کے مساوی سمجھتے تھے۔ ہم میں سے بعض افراد جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتے تھے جو مولانا کے جذبات کو برانگیختہ کر دیتی تھیں۔ ان کا ردعمل دیکھنا مزیدار ہوتا تھا۔ میں ان سے گفتگو کے دوران شیکسپیئر اور سگمنڈ فرائڈ کا اکثر حوالہ دیا کرتا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ اس تصور ہی سے بیزار رہتے تھے کہ کوئی مسلمان کسی تقریر کے ذریعے کوئی ایسی بات کہے جس کے نتیجے میں کوئی غیر مسلم مصنف مذہب یا کسی بھی دوسرے معاملے پر اپنی بات منوانے میں کامیاب رہے۔ انگریزی علم کے باوجود مولانا نورالزماں معاشرے کے ان عمومی مذہبی لوگوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے جو جدید رجحانات سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں۔ کسی جدید خیال کو یکسر مسترد کرنے اور اسے پڑھ کر، سمجھنے کے بعد مسترد کرنے میں بہت فرق ہے۔ اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص پرانی سوچ سے اندھی عقیدت کے ساتھ وابستہ رہنے کی صورت میں نئے چیلنجوں سے اس طرح منہ موڑ لے کہ ان سے پوری طرح واقف ہی نہ ہو پائے۔ مولانا نورالزماں کا تعلق اس دوسری قسم کے لوگوں سے تھا۔ ان کی باتیں سن کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ جدید معاشرے میں مذہبی علما تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہمدردیوں سے کیوں اور کیونکر محروم ہو گئے ہیں؟ ان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ جامعات میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں سے اس زبان میں بات نہیں کر سکتے جو ان میں مروج ہے۔ ابلاغ کا فقدان (Communication Gap) ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اگر نوجوانوں میں مذہبی تعلیمات کے حوالے سے کوئی ابہام یا غلط فہمی پائی جاتی ہے تو اسے علما سوچے سمجھے بغیر الحاد یا مذہب بیزاری قرار دے بیٹھتے ہیں۔ علما کا رویہ اس قدر سخت اور غیر لچکدار ہے کہ مختلف سوالوں کے جواب کے متلاشی ذہن بنیادی مذہبی سوچ سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ نومسلموں میں تبلیغ کرتے تھے۔ مگر وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ قرآن اور حدیث پر مبنی ان کے دلائل صرف ان کے لیے موزوں تھے جو ان کی اتھارٹی کو بلا چوں چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ غیر مسلموں اور تشکیک پسندوں کو اسلام کی طرف لانے کے لیے مختلف نوعیت کے دلائل درکار ہوتے ہیں اور اس معاملے میں علما کی تربیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کسی بھی ناقد کو صرف قرآن کی کسی آیت کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش

کرنا سراسر لاحاصل ہے، اگر ناقد غیر مسلم یا تعقل پسند مسلم ہو۔

مولانا نورالزماں نے ایک بار مجھ پر زور دیا کہ میں مولانا عبدالخالق کی اسلام پر اور مولانا اشرف علی تھانوی کے خطبات پر مشتمل کتابیں پڑھوں۔ دونوں کتابوں میں محض مذہبی عقائد کا تذکرہ تھا اور میرے نقطۂ نظر سے یہ کتابیں خاصی مایوس کن تھیں، بالخصوص مولانا عبدالخالق کی کتاب۔ مولانا عبدالخالق نے صرف راسخ العقیدہ مسلمانوں کو مخاطب کیا تھا اور دین کے بنیادی اصول بیان کیے تھے۔ مولانا تھانوی نے اپنی تحریر کے ذریعے یہ تاثر دیا تھا کہ ان کے دلائل سے دینی تعلیمات کے بارے میں تمام شبہات یا اشکال دور ہو جائیں گے۔ کہیں کہیں انہوں نے تاریخ کے حوالے اور فلسفے کی بنیاد پر دلائل بھی دیے تھے۔ مگر میں نے یہ اندازہ قائم کیا کہ انہوں نے اسلام سے باہر کی پوری دنیا کو یکسر نظرانداز کر رکھا تھا۔ عمومی تاریخ سے متعلق ان کے علم نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ ان کی طرزِ تحریر سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ جدید دور کی منطق اور فلسفے سے ان کی زیادہ واقفیت نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے بارے میں میری رائے بالکل غلط ہو، کیونکہ میں تو ان چند رشحاتِ قلم کے مطالعے کی بنیاد پر بات کر رہا ہوں جو جیل میں میری نظر سے گزرے تھے۔ ان کی بڑی اور معروف تصانیف میرے زیرِ مطالعہ نہیں رہیں۔ البتہ ان کی طرزِ تحریر میں ایک بات نے مجھے متاثر کیا۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں کے مجمع پر وہ اثر انداز ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔

ویسے تو دنیا بھر میں جدید نظریات اور مذہبی فکر کے درمیان خلا پایا جاتا ہے، مگر میں نے پاک و ہند کے مسلمانوں میں یہ خلا کسی بھی دوسرے خطے کے مقابلے میں زیادہ دیکھا ہے۔ اس معاملے میں صرف علامہ محمد اقبال استثنا کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کوئی مذہبی عالم نہیں تھے۔ انہوں نے "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیلِ جدید" لکھ کر لاکھوں پڑھے لکھے مسلمانوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات، جدید دور کے تقاضوں کے مطابق سمجھنے کے قابل بنایا۔ مگر سچ یہ ہے کہ خود علما نے علامہ کی فکری کاوشوں سے کم ہی استفادہ کیا۔ اقبال کے فکری اثرات سے مذہبی طبقہ اس قدر خائف تھا کہ بعض علما نے تو انہیں باغیانہ سوچ کا حامل بھی قرار دے دیا۔ میرے خیال میں مذہبی علما کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے حوالے سے خالص بنیادی اور

غیر بنیادی باتوں میں فرق کرنے کا شعور نہیں رکھتے۔ وہ اس خوف میں بھی مبتلا رہتے ہیں کہ کسی بھی غیر بنیادی بات پر تنقید، دراصل بنیادی بات پر حملے کے مترادف ہے۔

مولانا نورالزماں عجیب و غریب دلائل دے کر مجھے حیران کرتے رہتے تھے۔ منطق کی کسوٹی پر ان کے دلائل کبھی پورے نہیں اترتے تھے۔ مگر مولانا نورالزماں کو اس کی چنداں پروا نہیں تھی۔ اگر کوئی شخص پڑھا لکھا نہ ہو اور خلوص کے ساتھ کوئی غلط بات بھی کہہ رہا ہو تو سادگی کی بنیاد پر اسے سراہا جا سکتا ہے۔ مولانا نورالزماں کا معاملہ خاصا مختلف تھا۔ ان میں اَن پڑھ آدمی کی معصومیت کے ساتھ ساتھ، نیم خواندہ شخص کی جہالت بھی گُندھی تھی! ان کے خیال میں مذہب کی تعلیمات کو تنقیدی نظر سے دیکھنا بغاوت کے مترادف تھا۔

میں نے مولانا نورالزماں کا ذکراتنی تفصیل سے اس لیے کیا ہے کہ وہ ہمارے معاشرے کے ایک طبقے کے نمائندہ تھے۔ اس طبقے کی افادیت سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اسی طبقے نے اپنی خامیوں یا کمزوریوں سے ایسے نتائج بھی پیدا کیے ہیں جنہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ مجھے یہ اعتراف بھی کرنا ہوگا کہ مولانا نورالزماں سے میں نے سیاسی پس منظر کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ وہ نمایاں سیاسی اور عوامی شخصیات کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ اگر مولانا کی صحبت نصیب نہ ہوئی ہوتی تو میں بہت سی سیاسی مصلحتوں کو سمجھنے سے قاصر رہتا۔ جب انہیں سنتا تھا تو مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ سیاست کے بارے میں میری سوچ کس قدر سادہ لوحی پر مشتمل تھی۔ انہوں نے بہت سی بلند قامت شخصیات کی بداعمالیوں کے بارے میں ایسے شواہد پیش کیے کہ انکار کرنے کی تاب نہ تھی۔ سیاسی امور میں ان سے اختلاف بہت مشکل کام تھا۔ وہ ڈاکٹر شہید اللہ مرحوم کا کم ہی احترام ملحوظ رکھتے تھے اور متعدد واقعات کی روشنی میں ان کی حماقت ثابت کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں اسلامی فقہ کے حوالے سے ایک بحث نمایاں ہے۔ جس میں ڈاکٹر شہید اللہ مرحوم نے متعدد مقامات پر شرح وقایہ کا حوالہ دیا ہے۔ مولانا نورالزماں کا استدلال یہ تھا کہ وہ شرح کے بجائے اصل کتاب سے مستفید ہونا پسند کریں گے۔ ڈاکٹر شہید اللہ کو پتا نہیں تھا کہ وقایہ کیا ہے۔ وہ شرح وقایہ کو اصل کتاب سمجھ رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دینی علوم کے معاملے میں ان کی معلومات کتنی سطحی تھیں۔

تیس پینتیس سال قبل کے، ڈھاکا یونیورسٹی کے اساتذہ سے متعلق بھی کچھ کہانیاں سننے کو ملیں، جن سے میں بہت محظوظ ہوا۔ ان سے مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد کرنے کا موقع بھی ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ ماضی اب زمانہ ماقبل تاریخ معلوم ہوتا ہے۔ یادوں سے مشترکہ طور پر مستفید یا محظوظ ہونا بڑی نعمت ہے۔ فلسفیانہ بنیاد پر میرے اور مولانا نورالزماں کے درمیان ایک خلیج حائل تھی، مگر مشترکہ یادوں نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔

سیاست کے حوالے سے میرا خیال یہ تھا کہ مولانا نورالزماں کو خود بھی مکمل اندازہ نہیں تھا کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ جب کبھی اسلامی بنیادوں پر نظم ونسق یا حکمرانی کی بات ہوتی تھی، وہ خود بھی بتا نہیں پاتے تھے کہ ان کے ذہن میں اس کا کیا نقشہ ہے۔ ان کی باتوں میں خاصا ابہام پایا جاتا تھا۔ میں نے بارہا ان سے کہا کہ اسلام سے وفاداری بہت اچھی بات ہے، مگر جب اس وفاداری کو حقوق وفرائض اور انسانی زندگی کے ناگزیر امور جیسی اٹل حقیقتوں میں تبدیل نہ کیا جائے تب تک بات نہیں بن سکتی۔ وہ اس نوعیت کی مشقوں کو وقت کا ضیاع سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ قرآن میں حقوق اور فرائض جامع ترین شکل میں موجود ہیں۔ لہٰذا ان کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ قرآن عالمگیر یا آفاقی اصول بیان کرتا ہے اور بیشتر معاملات کو تمام ممکنہ تفصیلات کے ساتھ بیان نہیں کرتا (یعنی بہت کچھ سوچنے کی گنجائش اللہ نے رکھ چھوڑی ہے)۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ جو کچھ قرآن میں ہے وہ نہ صرف حرفِ آخر ہے بلکہ مزید شرح کا محتاج بھی نہیں۔ ایسے معاملات پر بات کرتے وقت وہ خاصے مشتعل ہو جایا کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں کوئی زک پہنچی ہو۔ ایسے مواقع پر میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مبہم امور پر جیل میں لڑنا درست نہیں۔ مولانا نورالزماں کی باتوں سے یہ بات جاننا ممکن نہیں تھا کہ جدید معاشرے کے سیاسی اور معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے اسلام کے بنیادی اصولوں سے کس طور مدد لی جاسکتی ہے۔

یہ بہرحال ایک تلخ حقیقت ہے کہ جو لوگ اسلام کو ہر اعتبار سے عملی ضابطہ حیات سمجھتے ہیں، وہ خود بھی بعض امور میں ابہام رکھتے ہیں اور کسی بھی معاملے میں ٹھوس دلائل کے ساتھ بحث میں شریک ہونے سے گریزاں رہتے ہیں۔ ان کے پاس جدید دور کے تقاضوں کے مطابق

بیان کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہر دور کا اپنا لب ولہجہ ہوتا ہے جسے اپنائے بغیر بات عمدگی سے بیان نہیں کی جاسکتی۔ جدید سیاسی نظریات اور قرآن کے احکام کے درمیان پایا جانے والا تنازع، انہیں خوفزدہ رکھتا ہے۔ جو لوگ جدید سیاسی نظریات کی روشنی میں بات کرتے ہیں، انہیں تشکیک پسند قرار دے دیا جاتا ہے۔

۱۴ / اور ۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب (۲۷ ویں شبِ رمضان ۱۳۶۶ھ) پاکستان کی جغرافیائی پیدائش ہوئی۔ اُس وقت ملک کے چار صوبے تھے۔ پورا مشرقی بازو ''صوبہ مشرقی بنگال'' تھا۔ جبکہ مغربی بازو میں تین صوبے تھے (''پنجاب''۔ ''سندھ''۔ ''شمال مغربی سرحدی صوبہ'')۔ ان کے علاوہ داخلی طور پر بہت سی خودمختار ریاستیں اور وفاق کے زیرِ انتظام بعض علاقے تھے۔ کراچی وفاقی دارالحکومت تھا اور وفاق ہی کے کنٹرول میں تھا۔

۱۴ / اکتوبر ۱۹۵۵ء تک یہی صورتحال رہی۔ ۱۵ / اکتوبر ۱۹۵۵ء کو پورے مغربی بازو کو ''آملیٹ'' بنا کر ایک صوبہ (''مغربی پاکستان'') بنادیا گیا۔ جس میں یہاں کے تینوں صوبے، بیشتر ریاستیں اور کچھ دیگر علاقے شامل کردیے گئے۔ اِسے ون یونٹ صوبہ کہا گیا، جس کا دارالحکومت لاہور بنا۔ کراچی بدستور وفاقی دارالحکومت رہا۔

اُدھر مشرقی بازو پر مشتمل صوبہ جوں کا توں برقرار رہا۔ البتہ اس کا نام ''صوبہ مشرقی پاکستان'' ہوگیا۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء تا جون ۱۹۶۹ء پاکستان کے دو صوبے رہے۔ ۱۹۶۹ء کے مارشل لاحکم نامے کے ذریعے جنرل آغا محمد یحییٰ خان نے صوبہ مغربی پاکستان کو ختم کرکے یکم جولائی ۱۹۶۹ء کو یہاں چار صوبے بنادیے۔ بلوچستان نام کا صوبہ پہلی بار وجود میں آیا۔ بقیہ تین صوبوں کی بھی حدود تبدیل کردی گئیں۔ بہاولپور کی ریاست کو نئے ''صوبہ پنجاب'' میں ضم کردیا گیا۔ یوں جولائی ۱۹۶۹ء تا سقوطِ مشرقی پاکستان (۱۶ / دسمبر ۱۹۷۱ء) پاکستان کے کُل پانچ صوبے رہے۔ مشرقی بازو کا ایک صوبہ اور مغربی بازو کے چار صوبے۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد، باقی ماندہ پاکستان اور چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے ''نئے پاکستان'' میں چار صوبے رہ گئے۔ (ناشر)

خواجہ خیرالدین اور احسن منزل

نیوٹوئیٹی میں میری کوٹھری کے نزدیک ہی خواجہ خیرالدین بھی چار ماہ رہے۔ میں نے ان کو بھی جدید دور کے تقاضوں سے خائف دیکھا۔ میں انہیں ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ جیل میں ڈالے جانے سے قبل تک میں نے ان کا صرف نام ہی سنا تھا۔ بہت ساری باتوں میں یکساں خیالات رکھنے کے سبب ہم کچھ ہی دنوں میں اچھے دوست بن گئے۔ وہ بھی خاصے نفاست پسند تھے اور جیل کے گندے ماحول کی وجہ سے پریشان رہا کرتے تھے۔ میری طرح وہ بھی پنیر کھانے کے بہت شوقین تھے اور اسلام کے جدید دور میں قابلِ عمل ہونے سے متعلق میرے نظریات سے متفق تھے۔ البتہ اسلام کے بارے میں ان کے خیالات خاصے روایتی قسم کے تھے۔ تاہم وہ میرے اس نکتے کو سمجھتے تھے کہ اسلام کو جدید فکر کی روشنی میں نئے سرے سے دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مذہب کے حوالے سے ان کا مطالعہ وسیع تھا اور وہ اسلام کے دورِ اول کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ جانتے تھے۔ مادری زبان اردو ہونے کا فائدہ بھی انہیں حاصل تھا، جس کی مدد سے وہ مذہب پر بڑی اور قابلِ قدر کتب کا مطالعہ کر پائے تھے۔ اردو سے میری شناسائی واجبی سی تھی۔ بہت سے لوگ کسی زبان سے عدمِ واقفیت کی بنیاد پر اصل کتاب سے زیادہ اس کی شرح سے واقف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر شہیداللہ مرحوم کی طرح۔

خواجہ خیرالدین کا تعلق پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل اور وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کے خانوادے سے تھا۔ خواجہ خیرالدین مشرقی پاکستان میں کونسل مسلم لیگ کے سربراہ تھے اور پرانے مکتبِ فکر کے سیاست دانوں میں انہیں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ڈھاکا میں ان کی مقبولیت غیر معمولی تھی اور وہ پارٹی سطح سے کہیں بلند حیثیت کے حامل تھے۔ ۱۹۷۰ء کے عام

انتخابات میں خواجہ خیرالدین نے شیخ مجیب الرحمٰن کے مرکزی مخالف کا کردار ادا کیا تھا۔ گو کہ انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، تاہم ان کے حق میں ڈالے جانے والے ووٹوں کی تعداد اس امر کی مظہر تھی کہ ڈھاکا میں ان کے چاہنے والوں کی اب بھی کچھ کمی نہ تھی۔ لوگ سیاسی وابستگی سے ہٹ کر بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ طویل مدت تک ڈھاکا میونسپلٹی کے وائس چیئر مین رہے تھے اور شہر کو ہر اعتبار سے اس قدر جانتے تھے کہ اب بھی (۱۹۷۳ء) یہ خدشہ محسوس کیا جارہا تھا کہ کہیں وہ لوگوں کو عوامی لیگ کے خلاف متحرک نہ کر دیں۔

میں جب نیو ٹوئنٹی بلاک میں آیا اس وقت خواجہ خیرالدین کا مقدمہ شروع ہو چکا تھا۔ انہوں نے مجھے وہ بیان دکھایا جو انہوں نے آئین کے آرٹیکل ۳۴۲ کی روشنی میں تیار کیا تھا۔ میں نے چند ایک نکات کو درست کرنے اور دوبارہ لکھنے کا مشورہ دیا جو انہوں نے بہ خوشی قبول کر لیا۔ یہ ایک جرأت مندانہ بیان تھا اور اس کے لہجے سے مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نوعیت کے بیانات میں جو بڑھکیں شامل ہوا کرتی ہیں، وہ اس بیان میں بھی شامل تھیں۔ تاہم جس بات نے اسے ڈاکٹر عبدالمالک اور ان کی کابینہ کے ارکان کے بیانات سے ممتاز بنایا، وہ یہ تھی کہ خواجہ خیرالدین نے پاکستان اور اسلام پر اپنے محکم یقین کو چھپایا نہیں تھا اور ۱۹۷۱ء کے تنازع میں اپنے کردار پر پردہ ڈالنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ خواجہ خیرالدین کا کہنا تھا کہ وہ جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں اور اسی نکتے کی بنیاد پر انہوں نے ایوب خان کی آمریت کی بھی مخالفت کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ کسی بھی معاملے میں اختلاف کو ملک کے وجود کے لیے خطرہ بننے کی حد تک نہیں لے جانا چاہیے۔ عوامی لیگ کی جانب سے شروع کی جانے والی خانہ جنگی اور اس کے نتیجے میں ہونے والے بے پناہ جانی اور مالی نقصان کا حوالہ دیتے ہوئے خواجہ خیرالدین نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ کیا ان حالات و واقعات کی روشنی میں وہ اور عوامی لیگ کی مخالفت کرنے والے دیگر افراد اپنے موقف پر درست ثابت نہیں ہوئے؟

خواجہ خیرالدین نے جب یہ بیان تیار کیا تھا اس وقت انہیں اندازہ نہیں تھا کہ جیل کے باہر لوگوں پر اس کا کیا اثر مرتب ہوگا۔ دوستوں نے بیان کا انداز اور لہجہ تبدیل کرنے پر زور دیا

مگر خواجہ خیرالدین نے بیان میں کسی قسم کی نرمی پیدا کرنے سے انکار کر دیا اور دلیل یہ دی کہ بیان خواہ کیسا ہی (معذرت خواہانہ) ہو، جج کا معاندانہ فیصلہ بدلے گا نہیں، پھر وہ اپنے ماضی کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر کے اپنے وجود پر منافق کا لیبل کیوں چسپاں کریں؟ ان کی بات درست ثابت ہوئی۔ ان کے مقدمے کی کارروائی سننے کے لیے عدالت کے باہر ہزاروں افراد جمع ہوتے تھے۔ انہوں نے عوامی لیگ کی کرپشن، جابرانہ و آمرانہ حکمرانی اور بدانتظامی کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ لاکھوں دلوں کی آواز تھی۔ عدالت میں بہت سے نئے چہرے ان سے ملنے آتے تھے اور انہیں بے باکی سے مقدمے کا سامنا کرنے پر مبارک باد دیتے تھے۔ جب وہ ظہر کی نماز کے لیے جاتے تو مسجد میں لوگ ان سے ہاتھ ملانے کے لیے قطار در قطار آتے تھے۔

ہمیں جیل کے باہر کی سیاسی فضا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ایک موہوم سا اندازہ تو تھا مگر خواجہ خیرالدین کے مقدمے کے ردعمل سے پتا چلا کہ عوامی لیگ کے خلاف حیرت انگیز طور پر فضا تیار ہو رہی تھی۔ سوچنے کی بات تھی کہ کیا لوگ واقعی سونار بنگلہ کے تصور سے اس قدر جلد اکتا گئے تھے؟ خواجہ خیرالدین مقدمے کی کارروائی کو ذرہ بھر اہمیت دینے کو تیار نہ تھے شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے عدالتی بیان میں اس غیر معمولی بے باکی کو برقرار رکھ سکے۔ اس بات کا امکان تھا کہ عدالت انہیں بیس سال تک قید کی سزا سنا دے گی، پھر بھی ان کی حسِ مزاح برقرار تھی۔ وہ جیل کے کھانوں اور دیگر ''سہولتوں'' کے بارے میں پُر مزاح تبصروں سے چوکتے نہیں تھے۔ یہ بات بڑی متاثر کن تھی کہ خواجہ خیرالدین سماعت کے دوران وکلا کی جرح اور جج کے ریمارکس سے ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوتے تھے اور مزاح کی شگفتگی کو قطعاً داؤ پر نہیں لگنے دیتے تھے۔

خواجہ خیرالدین ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھے۔ وہ اچھا کھانا اور اچھی سنگت پسند کرتے تھے۔ انہیں گپ شپ کرنا اور جلد بے تکلف ہو جانا اچھا لگتا تھا۔ وہ اپنے اجداد کا ذکر بڑے فخر سے کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پیدائشی سیاست دان ہیں اور جو کچھ انہیں اپنے بزرگوں سے ملا وہ ہر ایک کو نہیں ملتا۔ وہ اپنے آپ کو فطری طور پر اشرافیہ میں شمار کرتے تھے۔ میرا خیال

ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ خاندانی روایات، شائستگی اور کردار کی بلندی کے باوجود کمتر خاندانی پس منظر والوں کو قدرے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

وہ اپنی خاندانی دولت کے بارے میں بھی بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے کہ کس طرح انیسویں اور بیسویں صدی میں احسن منزل میں رہنے والا یہ خاندان غیر معمولی سیاسی حیثیت کا مالک اور دولت مند رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ فخر کے ساتھ وہ اپنے والد کے معاشقوں کا ذکر کرتے تھے، اور یہ بتاتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے تھے کہ وہ شراب اور شباب کے رسیا تھے۔ خواجہ خیرالدین کی نظر میں شراب و شباب کا رسیا ہونا اہل ثروت کا فطری حق تھا اور اس بات پر پیدائشی مفلس ہی اعتراض کر سکتے تھے۔ اپنے بارے میں انہیں پارسائی کا دعویٰ تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ شادی کے بعد انہوں نے اپنی بیوی کے سوا کسی غیر عورت سے تعلق نہیں رکھا۔

میں خواجہ خیرالدین کی باتیں بہت توجہ اور شوق سے سنتا تھا اور اپنے ذہن میں ان کا قد کاٹھ متعین کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بائیں بازو کے لوگ طبقاتی تفریق پر یقین نہیں رکھتے اور پیدائشی طور پر کسی کو ترجیحی سلوک کا حق دار نہیں مانتے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ خواجہ خیرالدین جیسے لوگوں کو پیدائشی طور پر کچھ نہ کچھ فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اپنے طبقاتی پس منظر کی وجہ سے وہ عامۃ الناس کی نظر میں بہترین قائد تھے اور اس حیثیت کو منوانے کے لیے انہیں تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ اسی نوعیت کی برتری کا ان کے اجداد نے بھی ٹھیک ٹھاک فائدہ اٹھایا تھا۔ اس خاندان میں سے تین اصحاب نے سیاست میں خوب نام کمایا۔ ان میں خواجہ سلیم اللہ، خواجہ ناظم الدین اور خواجہ شہاب الدین شامل تھے۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام میں ڈھاکا کے نواب سلیم اللہ نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے مشرقی بنگال اور آسام کے صوبے کے قیام لیے آواز بلند کی تھی، اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ کلکتہ کے ہندوؤں کے زیر نگیں رہ کر بنگال کے مسلمان کبھی ترقی نہیں کر پائیں گے۔ خواجہ ناظم الدین نے بھی اچھی تعلیم پائی تھی۔ وہ شبانہ روز کی محنت کے بعد میونسپل سطح کی سیاست سے بلند ہو کر ملک کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوئے۔ بعض لوگوں کے نزدیک وہ سیاسی اعتبار سے ایک اوسط درجے کے لیڈر تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کوئی ان کی اہلیت اور ایمانداری پر

انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے بھائی خواجہ شہاب الدین نے شاید ہی رسمی تعلیم پائی ہو، اس کے باوجود وہ انتہائی ذہین و فطین آدمی تھے۔ وہ میرٹ کو پھلانگ کر صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) کے گورنر بنے۔ ان کے خاندان سے سید عبدالسلیم، سید عبدالحافظ، خواجہ نصراللہ، کالو میاں صاحب اور نواب حبیب اللہ وغیرہ اپنے پیدائشی حق کو بنیاد بنا کر سیاست پر چھائے رہے۔ منصوبہ بندی اور حالات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نے انہیں وہاں تک پہنچا دیا جس کا دوسرے سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس وقت سیاسی میدان میں داخلہ چند خانوادوں تک محدود تھا اور اسمبلیوں کے حلقے جیبی ہوا کرتے تھے اور یہ بااثر خاندان جسے چاہتے جتوا دیتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں احسن منزل کے لیے (جس سے خواجہ خیرالدین فیملی کا تعلق تھا) خطرناک صورت حال اُس وقت پیدا ہوگئی، جب اشرافیہ کے مخصوص حلقے سے باہر کے لوگ بھی سیاست میں اعلیٰ منصب پر پہنچنے لگے۔ ۱۹۳۵ء کے انتخابات میں اے کے فضل الحق کے ہاتھوں خواجہ ناظم الدین کی شکست عوام کے رجحانات میں رونما ہونے والی تبدیلی کا پتا دے رہی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں خواجہ ناظم الدین کے خاندان کو زبردست دھچکا اس وقت لگا جب عام انتخابات میں مسلم لیگ کا صفایا ہوگیا۔ یہ خاندان حکمراں اتحاد یونائیٹڈ فرنٹ کا حصہ نہیں تھا، تاہم انفرادی حیثیت میں چند افراد نے سیاست میں اپنا سکہ جمائے رکھا۔ خواجہ شہاب الدین نے ایوب خان کی کابینہ میں شمولیت اختیار کی لیکن جب ایوب خان کی بنائی ہوئی کنونشن مسلم لیگ کے مقابل سیاسی اتحاد قائم کرنے کا مرحلہ آیا تو خواجہ ناظم الدین کو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے دوران صوبے کی سیاست میں جو کچھ بھی رونما ہو رہا تھا اس سے قطع نظر، ڈھاکا میں احسن منزل (نواب سلیم اللہ کا محل جہاں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تھا) کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ خواجہ خیرالدین اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان سخت مقابلہ متوقع تھا۔ جیت شیخ مجیب الرحمٰن کے حصے میں آ تو گئی، مگر اکثریت نے اس فتح پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ انتخابات میں دھاندلی ہوئی تھی۔ عوامی لیگ نے کھل کر لوگوں کو ڈرایا دھمکایا تھا۔ بوگس ووٹ بھی کاسٹ کیے گئے تھے۔ دھاندلی تو خیر پورے مشرقی پاکستان میں ہوئی تھی لیکن اب خواجہ خیرالدین کے مقدمے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بنگلہ دیش کے قیام کا سہرا

اپنے سر بلند ہونے والی جماعت کی مقبولیت میں تیزی سے کمی واقع ہو رہی تھی اور خواجہ خیر الدین کا سیاسی خانوادہ ایک بار پھر سیاسی افق پر ابھر رہا تھا۔

سوال یہ تھا کہ خواجہ خیر الدین اور ان کے خاندان کی مقبولیت میں دوبارہ اضافہ اصولوں کی بنیاد پر تھا یا پھر ان کی جانب سے لوگوں پر کیے جانے والے احسانات کا نتیجہ؟ ایک طرف تو خواجہ خیر الدین اور ان کے خاندان کے لوگوں کا سیاسی عقیدہ یہ تھا کہ پاکستان کا قیام اس خطے کے مسلمانوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھا مگر وہ اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس پس منظر میں کیا آج (۱۹۷۳ء) رائے عامہ اس نقطۂ نظر کی طرف لوٹ رہی تھی؟ مگر دوسری طرف معاملہ یہ بھی تھا کہ لوگ سیاست میں پرانے دَور کے چند سیاسی خاندانوں کی اجارہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لوگ وسیع البنیاد جمہوریت چاہتے تھے جہاں حکومت میں معاشرے کے تمام طبقات سے نمائندے شامل ہوں۔ خود خواجہ خیر الدین بھی اس تصور کی کسی حد تک حمایت کرتے تھے۔

کبھی کبھی خواجہ خیر الدین یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے کہ جدید معاشی نظریات یکسر غلط ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ طویل مدت تک میونسپلٹی کی سطح پر سیاست سے وابستہ رہے تھے اور کاروباری امور سے واقف ہونے کی بدولت جانتے تھے کہ معاشی ڈھانچہ کس طرح کام کرتا ہے۔ مگر مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا (اور ہو سکتا ہے کہ میری رائے غلط ہو) کہ وہ جدید معاشی نظریات کو پوری طرح سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مساوات کے مطالبے یا سوشل ازم کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے ایسا کہتے تھے۔ وہ انصاف کے اسلامی اصولوں کی بات کرتے تھے اور اس سلسلے میں خلافتِ راشدہ کے زمانے سے مثالیں بھی دیا کرتے تھے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں مولانا نور الزماں کی طرح وہ بھی جدید دور میں اسلامی اصولوں کے نفاذ یا انطباق کے بارے میں کوئی لائحۂ عمل نہیں رکھتے تھے۔ معاشی ناہمواری اور استحصال کے خلاف بولتے وقت وہ قرآن کی آیات اور احادیث کے حوالے دل کھول کر دیا کرتے تھے۔ یہ اچھی بات تھی۔ مگر جدید دور میں اسلامی اصولوں کو کس طور متعارف کرایا جا سکتا ہے، اس حوالے سے ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اسلامی

اصولوں کے مطابق معاشرے کی سیاسی اور معاشی تعمیرنو کا تصور بہت اچھا ہے، مگر بات تو تب ہی بنے گی جب اس کی تفصیلات پر غور وخوص کیا جائے اور تمام جزئیات کا جائزہ لے کر ٹھوس لائحہ عمل پیش کیا جائے۔

مولانا نورالزماں تو خیر جدید نظریات سے ناواقف تھے مگر خواجہ خیرالدین کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ ایک بار لفظ حق پر قرآن کے حوالے سے بحث چھڑ گئی۔ میرا خیال تھا کہ اللہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے اردگرد موجود تمام سچائیوں کا جائزہ لیں اور انہیں اپنی عقل کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میری گفتگو سے مولانا نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ شاید میرے نزدیک عقل اللہ کے کلام سے بڑھ کر ہے۔ وہ بضد تھے کہ حق ہر حال میں حق رہتا ہے، اپنے درجے سے کم نہیں ہو پاتا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ عقل ہر حال میں ایمان یا عقیدے سے فروتر ہے۔ اس لیے جب بھی ایمان اور عقل میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا معاملہ درپیش ہو تو انسان کو چاہیے کہ عقیدے اور ایمان کو ترجیح دے۔ بحث کے دوران مولانا نورالزماں کا لہجہ تلخ تر ہوتا چلا گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میری چند باتیں انہیں بری لگی ہیں۔ ایسے میں بحث جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ خواجہ خیرالدین بھی یہ بحث سن رہے تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے جو چند الفاظ استعمال کیے، ان سے اندازہ ہوا کہ مولانا نورالزماں کے مقابلے میں وہ جدید فکر سے خاصے واقف تھے۔

خواجہ خیرالدین اشتراکیت پر تنقید تو بہت کرتے تھے، لیکن انہوں نے اب تک اس حوالے سے کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ میں نے انہیں کریو ہنٹ (Crew Hunts) کی کتاب ''تھیوری اینڈ پریکٹس آف کمیونزم'' پڑھنے کی تحریک دی۔ یہ جیل میں موجود تھی اور ان لوگوں کے لیے بہت اچھی تھی جو اشتراکیت کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنا چاہتے تھے اس خوف کے بغیر کہ کہیں وہ اس نظریے کو گلے نہ لگا بیٹھیں۔ اس کتاب میں اشتراکیت کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل کو جمع کردیا گیا تھا۔ اگر مولانا نورالزماں کو یہ کتاب پڑھنے کا مشورہ دیا جاتا تو شاید وہ اسے وقت ضائع کرنے کا ایک طریقہ گردانتے!

سیاست دان کی حیثیت سے خواجہ خیرالدین کی سب سے بڑی کمزوری ان کی بنگلہ زبان سے

ناواقفیت تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بنگالی جانتے ہی نہیں تھے، ڈھاکا کی مقامی زبان تو وہ روانی سے بولتے بھی تھے، لیکن یہ لکھنے والی زبان نہیں تھی۔ وہ بنگالی پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ البتہ جب کتب و جرائد پڑھ کر سنائے جاتے تو وہ سمجھ ضرور لیتے تھے۔ جس علاقے میں ۹۵ فیصد افراد بنگالی بولتے ہوں وہاں سیاسی رہنما بنگلہ زبان ہی سے ناواقف ہوں، یہ بڑی عجیب بات تھی۔ خواجہ خیرالدین، خواجہ شہاب الدین اور ڈھاکا کی ''احسن منزل'' خاندان کے دیگر حضرات نے بنگلہ زبان پر عبور حاصل کرنے کی کبھی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ عوامی لیگ نے اس کمزوری کو بھی عمدگی سے استعمال کیا۔ جب مشرقی پاکستان میں زبان کی بنیاد پر قوم پرستی کی تحریک چل رہی تھی، انہوں نے خواجہ خیرالدین اور ان کے خاندان کو اردو سامراج کا ایجنٹ قرار دیا تھا۔

گو کہ حسین شہید سہروردی کو خواجہ ناظم الدین یا خواجہ خیرالدین سے بھی کم بنگالی آتی تھی مگر چونکہ وہ ذہین انسان تھے، اس لیے انہوں نے علاقائیت کا زور وشور سے پرچار کر کے زبان کے معاملے میں اپنا دامن بچالیا۔ ان کی کامیابی یہ تھی کہ لوگوں کو آج یہ بھی یاد نہیں کہ حسین شہید سہروردی بنگالی سے نابلد تھے!

خواجہ خیرالدین اور ان کے خاندان کے دیگر افراد نے سیاست میں گہری جڑیں رکھنے کے باوجود بنگالی کو نہیں اپنایا تھا، اس سے ان کی تنگ نظری اور زبان سے متعلق مخاصمانہ رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک وقت وہ بھی تھا، اور یہ بہت پرانی بات نہیں جب مشرقی بنگال کے بیشتر حصوں میں اردو کو ایک ثقافتی یادگار کی حیثیت حاصل تھی اور مرشد آباد (کلکتہ) اور ڈھاکا میں اردو بولنے والے معقول تعداد میں رہتے تھے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ مشرقی بنگال میں صدیوں سے اکثریت کی زبان بنگالی رہی ہے۔ جس لیڈر کی سیاست عوام کے دکھ درد کے نام پر چل رہی ہو، وہ زبان کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے؟ انیسویں صدی میں اور اس کے بعد نواب سلیم اللہ کے دور تک تو خیر سیاست اشرافیہ کا معاملہ تھی اور معاشرے کے منتخب افراد ہی حکمرانی کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔ عوام کی نظر میں یہ لوگ دیوتا کا سا درجہ رکھتے تھے اور اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی کہ وہ کون سی زبان بولتے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں معاشرے کی باگ ڈور تھی، وہ اپنی مرضی سے کسی بھی زبان کو اپنا سکتے تھے اور لوگ ان کے نقشِ

قدم پر چلتے تھے۔ مگر جب سیاسی قائدین کے لیے مختلف امور پر عوامی حمایت کے حصول کا مسئلہ کھڑا ہوا، تب زبان کی اہمیت بھی اجاگر ہوئی۔ سیاست دانوں کے لیے لازم ہوگیا کہ وہ لوگوں سے ان ہی کی زبان میں مخاطب ہوں۔ اگر آپ بحیثیت سیاست دان عوام سے قریبی رابطہ رکھنا چاہتے ہیں تو یہ کام ترجمان کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ عوام کی زبان جاننے کی صورت میں آپ اپنا مافی الضمیر بیان کرسکتے ہیں اور اپنی بات دوسروں تک آسانی سے پہنچا سکتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر یا قائداعظم کا تعلق چونکہ بنگال سے نہیں تھا، اس لیے لوگوں نے انہیں رعایت دی۔ مگر کوئی مقامی لیڈر کس طرح عوام کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے جبکہ وہ ان کی زبان جانتا ہی نہ ہو؟

یہ سمجھنا حماقت پر مبنی ہوگا کہ احسن منزل کے رہنے والے زبان کی اہمیت کو سمجھتے ہی نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو برصغیر کے مسلمانوں میں رابطے کی زبان رہی تھی اور اسے اس وجہ سے کچھ فوقیت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خواجہ خیرالدین کا خاندان اردو پر کسی اور زبان کو اہمیت نہیں دے سکا، اور ان کے ہاں بنگالی وہ مقام نہیں پاسکی جو اردو کو مل چکا تھا۔ انیسویں صدی تک تو خیر یہ سوچ درست تھی، تاہم بیسویں صدی کے آخری عشروں میں مشرقی پاکستان میں ایسی سوچ کو برقرار رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں لسانی تحریک کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ بنگلہ کو یکسر نظرانداز کیے جانے ہی سے خرابی پیدا ہوئی اور مقامی زبان کی اہمیت ختم ہونے کے احساس نے ہی وہ خطرناک صورتحال پیدا کی جو سب کے سامنے عیاں ہے۔

جیل میں بھی خواجہ خیرالدین نے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ مشرقی پاکستان کے المیے میں زبان کے کردار کو بھی کچھ اہمیت دینے کو تیار تھے۔ وہ کبھی کبھی بنگالی میں کچھ مہارت پیدا کرنے کی بات ضرور کرتے تھے مگر کسی بھی مرحلے پر انہوں نے مشرقی پاکستان کے حالات کی ذمہ داری لسانی مسئلے پر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کبھی کبھی شدید مایوسی کے عالم میں پاکستان ہجرت کرنے کی بات کیا کرتے تھے، مگر ساتھ ہی ساتھ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ان کی جڑیں ڈھاکا میں ہیں۔ ایسے میں پاکستان میں مستقل رہائش اختیار کرنا ان کے لیے آسان نہ

ہوگا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا کہ جو لوگ اس خطے میں کچھ کر دکھانا چاہتے تھے، انہیں مقامی زبان میں پوری مہارت ہونی چاہیے تھی۔

بہر کیف، ان چند کمزوریوں کے باوجود، خواجہ خیر الدین ہی اُن بچے کھچے لوگوں میں سے ایک تھے جو اپنی شخصیت اور اپنے تصورات کی بنا پر، معاشرہ کو انارکی اور نراجیت سے بچا سکتے تھے اور جن کے گرد شیخ مجیب الرحمٰن کے مخالف لوگ اکٹھا ہو سکتے تھے۔

نواب آف ڈھاکا کی مشہور سیاسی فیملی سے تعلق رکھنے والے **خواجہ خیر الدین** نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بقیہ زندگی ''نئے پاکستان'' میں گزاری اور یہیں انتقال کیا

چاٹگام، سے تعلق رکھنے والے جسٹس حمود الرحمٰن سب سے طویل عرصے تک چیف جسٹس آف پاکستان رہے، ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۱ء متحدہ پاکستان کے اور ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۵ء بھٹو کے ''نئے پاکستان'' کے

آٹھواں باب

حالات کی خرابی نے سب کو اللہ سے قریب کر دیا!

نیو ٹونٹی بلاک میں ہمارے ساتھ ایک دوسری ابھرتی ہوئی شخصیت اختر الدین احمد تھے۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے بیرسٹر تھے اور ان کی شادی نواب سلیم اللہ کی پوتی (خواجہ نصر اللہ کی بیٹی) سے ہوئی تھی۔ وہ عمر کی چوتھی دہائی میں تھے اور ان کا آبائی علاقہ ضلع باریسال تھا۔

ماضی میں مذہب بیزار شخصیت کے مالک اختر الدین احمد جیل میں خاصے مذہبی ہو گئے تھے۔ حیرت اس بات پر تھی کہ اب جبکہ وہ مذہب کو اپنانے پر آئے تو ایسے متشدد ہو گئے کہ ضعیف الاعتقادی کی ہر منزل سے گزر گئے یہاں تک کہ مذہبی امور کے سمجھنے میں عقل کے استعمال کو یکسر حرام قرار دینے لگے۔ اختر الدین احمد عربی سے تو خیر نابلد تھے ہی اور انہوں نے قرآن کا کوئی ترجمہ وغیرہ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مگر اس کے باوجود انہیں ہر اس چیز سے غیر معمولی عقیدت تھی جس کا اسلام سے ذرا سا بھی تعلق ہو۔ اس معاملے میں وہ عقلیت پسندی کے یکسر مخالف تھے۔ ان کے خیال میں کسی بھی مذہبی عقیدے یا اس کے عملی اظہار پر ایسی تنقید درست نہیں تھی جس سے کسی دینی اصول پر زد پڑتی ہو۔

ایک دن اختر الدین احمد کے ساتھ تہذیب کے موضوع پر بحث چھڑ گئی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ مذہب کے معاملے میں عقل سے دست برداری انسان کو کہاں تک لے جاتی ہے۔ ان کا زور اس بات پر تھا کہ کسی بھی معاشرے کو غیر مہذب قرار دینے کا ہمارے پاس کوئی جواز نہیں۔ دلیل انہوں نے یہ دی کہ ہر معاشرے میں نیکی کا کچھ نہ کچھ جذبہ موجود ہوتا ہے، لوگ محبت بھی کرتے ہیں اور خدا کی عبادت بھی کسی نہ کسی طور کر ہی لیتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ کسی بھی معاشرے کو مہذب اُس وقت قرار دیا جا سکتا ہے، جب وہ چند لازمی مہارتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہو، ایک مخصوص تکنیکی سانچے میں ڈھلا ہوا ذہن رکھتا ہو اور

زندگی بسر کرنے کے چند پختہ طریقوں پر عمل پیرا ہو۔ اختر الدین احمد کا استدلال یہ تھا کہ مہذب اور غیر مہذب کی تفریق ہماری پیدا کردہ ہے۔ اللہ کی نظر میں سب برابر ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ انہیں قائل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بحث کے دوران اندازہ ہوا کہ میرا واسطہ ایسے شخص سے پڑ گیا ہے جس نے طے کر لیا ہے کہ اسکول اور کالج کی تعلیم کو اپنی سوچ اور کسی بھی فیصلے پر "اثر انداز" نہیں ہونے دے گا۔ میں نے یہ نکتہ پیش کیا کہ جن معاشروں نے بھرپور ترقی کے باوجود اب تک خدا کے وجود اور برتری کو تسلیم نہیں کیا، کم از کم انہیں تو غیر مہذب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس نکتے پر اختر الدین احمد کسی حد تک متفق ہوتے ہوئے نظر آئے۔

اختر الدین احمد کی شخصیت منطق و بے عقلی اور صداقت و خام خیالی کا ملغوبہ تھی۔ وہ دنیوی امور میں ٹھیک ٹھاک کامیاب تھے۔ پیشہ ور وکیل کی حیثیت سے وہ خاصے ذہین (بلکہ شاطر) اور بے باک تھے۔ اس معاملے میں ان کی معاملہ فہمی لاجواب تھی۔ مگر مذہب کا نام آتے ہی وہ عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے تھے۔ یہ بات واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی کہ ۱۹۷۱ء کے حالات نے انہیں ذہنی اور جذباتی سطح پر خاصی شکست و ریخت سے دوچار کیا تھا۔ غیر معمولی مشکلات اور جیل کی زندگی نے ان پر شدید منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انہی عوامل سے چھٹکارا پانے کے لیے انہوں نے مذہب کے دامن میں پناہ تلاش کی تھی۔ وہ دل کا سکون بھی چاہتے تھے لیکن اپنے مسائل کا حل مذہب ہی میں تلاش کرتے تھے۔ امریکا اور یورپ میں جو لوگ اشتراکیت کے دائرے سے نکلتے ہیں، انہیں کیتھولک عقیدے میں زیادہ سکون ملتا ہے، کیونکہ اس عقیدے میں بالعموم عقل پر جذبات اور عقیدے کی پختگی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اشتراکیت سے مذہب کی طرف آنے والوں میں سے کم ہی پروٹیسٹنٹ (Protestant) عقائد کی طرف گئے ہیں۔ اشتراکیت کے بنیادی عقائد سے دوری اختیار کرنے میں کیتھولسزم (Catholicism) زیادہ مدد فراہم کرتا ہے۔

اختر الدین احمد باقاعدگی سے نماز پڑھتے، روزے رکھتے اور تلاوت کرتے تھے۔ مذہبی لٹریچر کا مطالعہ بھی وہ اچھا خاصا کرتے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان کی عمومی زندگی پر ان سب باتوں کا کچھ خاص اثر مرتب ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ مذہبی امور سے اس قدر عقیدت یہ بھی

ثابت نہ کرسکی کہ وہ صداقت، رحم دلی، خیرات اور حسنِ عمل کو دیگر امور سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ روحانی اور دنیوی امور کا یہ تضاد گو کہ زیادہ حیرت انگیز نہیں تھا، کیونکہ ہمارے اکثر سیاسی قائدین میں یہ کمال درجے کو پہنچا ہوا ملتا ہے۔ لیکن میرا یہ خیال تھا کہ اختر الدین احمد چونکہ غیر معمولی پیشہ ورانہ تربیت کے حامل اور ذہین و بے باک وکیل تھے اس لیے ان کا مستقبل تابناک ہوگا۔

ڈھاکا جیل میں مجھے مولانا مخلص الرحمٰن سے بھی نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا، جو قدامت پرستی اور مذہبی سادگی کا حسین مرقع تھے۔ ڈھاکا کے نزدیک تیج گاؤں کے علاقے میں ان کا قائم کیا ہوا ایک یتیم خانہ تھا، جس پر دسمبر ۱۹۷۱ء میں بھارتی بمباری سے کم و بیش ۱۳۰۰ افراد لقمۂ اجل بنے تھے۔ ان میں اکثریت بچوں کی تھی۔ مخلص الرحمٰن ۷۵ سال سے زیادہ کے تھے، مگر ان کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے نظر انداز کر دی جاتی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ساتویں مرتبہ جیل آئے ہیں یا لائے گئے ہیں۔

مولانا مخلص الرحمٰن نے سیاسی کیریئر کی ابتدا ۱۹۲۰ء کے عشرے میں کانگریس سے کی تھی۔ اس کے بعد وہ ملک کی آزادی کے لیے سرگرم ایک ایسے گروپ سے وابستہ ہوگئے تھے جس نے دہشت گردی کو اپنا رکھا تھا۔ ماضی میں اس گروپ سے وابستگی پر مخلص الرحمٰن کو خاصی شرمندگی تھی۔ تاہم وہ اس حوالے سے کسی بھی سوال کا جواب دینے کو تیار نہیں تھے۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں وہ خلافت تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے جس پر انہیں پہلی بار جیل بھیجا گیا تھا۔ اے کے فضل الحق نے جب کسانوں کے حقوق کے لیے تحریک چلائی تو مخلص الرحمٰن اس کا بھی حصہ بن گئے تھے۔ لوگوں نے انہیں ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں کردار ادا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد مولانا مخلص الرحمٰن سیاست اور ٹمبر کا خاندانی کاروبار ختم کرکے خدمت کے جذبے سے دین کی راہ پر نکل پڑے تھے۔

مولانا مخلص الرحمٰن نے ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ تیج گاؤں میں ایک یتیم خانہ قائم کیا تھا۔ اس یتیم خانے کے قیام کا بنیادی مقصد بے سہارا بچوں کو پناہ دینا اور ان کی نگہداشت کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بہتر زندگی کے لیے تیار کرنا بھی تھا۔ یہ یتیم خانہ مخیّر حضرات کے عطیات پر چلتا تھا۔ ۱۹۷۱ء سے قبل اس یتیم خانے میں ۵۰۰ لڑکے اور

لڑکیاں قیام پذیر تھے۔ ان سب کی نظر میں مخلص الرحمٰن کی حیثیت ایک روحانی پیشوا کی سی تھی۔

مخلص الرحمٰن کو علم کے حصول کا بہت شوق تھا۔ سب کچھ انہوں نے خود ہی سیکھا تھا۔ انہوں نے اردو اور انگریزی میں بڑی محنت سے خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ عربی اور فارسی بھی جانتے تھے۔ انہوں نے تمام بڑی تفاسیر کے مطالعے کی کوشش کی تھی۔ ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ رسمی تعلیم انسان کو متوازن رکھنے کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ مخلص الرحمٰن نے جو کچھ غیر منظم طور پر پڑھا تھا، اس کے نتیجے میں ان کے خیالات میں عجیب وغریب تضادات پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں روشن خیالی بھی تھی اور غیر معمولی ضعیف الاعتقادی بھی۔ ان کے نزدیک زندگی کا بنیادی مقصد دوسروں سے محبت کرنا تھا، اور بلاشک ان میں دوسروں کی محبت اور ان کی خدمت کا جذبہ غیر معمولی حد تک تھا۔ تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ دینی امور میں وہ ذرا سا بھی اختلاف برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہیں یہ ماننے کے لیے آمادہ کرنا انتہائی دشوار تھا کہ ان کے مقابلے میں کسی اور کی رائے بھی صائب ہو سکتی ہے۔ ایک دن وضو کی بات چلی تو میں نے کہہ دیا کہ نماز سے قبل وضو کرنا طہارت کے لیے تو لازم ہے لیکن اس کی ایک علامتی حیثیت بھی ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کو اپنے رب کے حضور اب حاضری کے لیے تیار ہو جانا ہے۔ یہ گویا تیاری کی حالت ہے۔ اس پر مخلص الرحمٰن بھپر گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے کہیں بھی وضو کی علامتی اہمیت کے بارے میں نہیں پڑھا۔ وہ اس معاملے میں اس قدر متشدد ہوئے کہ میری رائے کو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے منافی قرار دے دیا۔ میں نے طویل بحث کے دوران انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ علامتی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ مگر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری بات سے پوری طرح مطمئن ہوئے ہوں گے۔

ایک بار قرآن کی تعلیمات کو جدید انداز سے پیش کرنے پر بحث چھڑی تو میں نے کہا کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو جدید فلسفے کی روشنی میں بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پر مخلص الرحمٰن نے کہا کہ فلسفہ تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اسلامی معاشرے میں اسے شجرِ ممنوعہ کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ بعض معاملات میں ان کی تعبیر وتشریح عجیب وغریب ہوا کرتی تھی۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ لنگی اور بنیان میں نماز پڑھنا درست نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ہے کہ نماز کے وقت لباس عمدہ ہونا چاہیے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ لنگی اور بنیان جیسے لباس میں نماز پڑھنا درست نہیں۔ اہمیت ستر ڈھانپنے اور شائستگی برقرار رکھنے کی ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ یہ ہماری پہلی فتح تھی۔

مخلص الرحمٰن کے نزدیک 'سوچنا' نہ صرف غیر ضروری، بلکہ خطرناک بھی تھا۔ انہوں نے مستند علما کی رائے کو بلا چوں چرا قبول کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہوا تھا لیکن انہوں نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ خود علمائے سلف نے بھی تو بعض امور پر آپس میں اختلاف کیا تھا اور یہ اختلاف ظاہر ہے کہ سوچ کی بنیاد پر تھا۔ خود مخلص الرحمٰن نے بھی بعض علما کا دامن تھاما ہوا تھا ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ خیالات کی بنیاد ہی پر کیا گیا ہوگا۔

مخلص الرحمٰن میں عدم رواداری شدت کے ساتھ تھی۔ یہ رویہ اگرچہ الفاظ تک ہی محدود رہتا تھا، تاہم بہت سوں کے لیے پریشانی کا باعث بھی تھا۔ وہ بولتے وقت بالکل نہیں سوچتے تھے۔ انہیں اس بات کا خیال ہی نہیں رہتا تھا کہ ان کی بات کسی کے لیے کس حد تک دل آزاری کا باعث بن سکتی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود مخلص الرحمٰن میں بلا کی سادگی تھی۔ روز مرّہ کے معاملات میں وہ بالکل سیدھے سادے واقع ہوئے تھے۔ انہیں بہت سے چھوٹے موٹے کام بھی نہیں آتے تھے۔ مثلاً ملک پاؤڈر سے دودھ تیار کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی طرح ڈبوں میں بند خوراک بھی ان کے لیے پریشانی کا باعث ہو جاتی تھی۔

مخلص الرحمٰن اپنی تمام تر سادگی کے باوجود حیرت انگیز طور پر بہت اچھے منتظم تھے۔ ان کا قائم کیا ہوا یتیم خانہ بے سہارا بچوں کو ہنر مند بھی بناتا تھا اور تدریس کے ساتھ ان کے لیے خانقاہ کا درجہ بھی رکھتا تھا۔ یہ ایک منفرد تجربہ تھا۔ لیکن بنگلہ دیش کے قیام کے بعد اسلام سے وابستگی کے سبب ان کے یتیم خانے کو مکتی باہنی اور پولیس کی جانب سے حملوں کا نشانہ بنایا گیا اور اسے لوٹ لیا گیا۔ تاہم اس سے مخلص الرحمٰن کے جوش اور ولولے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ۷۶ سال کی عمر میں بھی وہ برطانیہ جانے اور اپنے مشن کی شاخ کھولنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

پاکستان کے بارے میں ان کا نظریہ اور رویہ ملے جلے جذبات کا مرقع تھا۔ وہ ان حالات پر افسردہ تھے جو پاکستان کے ٹوٹنے کا سبب بنے۔ تاہم پاکستانی سپاہیوں کے بارے میں وہ بھی طرح

طرح کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ وہ عوامی لیگ کے اس پروپیگنڈے سے پوری طرح متاثر تھے کہ لاکھوں بنگالیوں کو قتل کیا گیا اور خواتین کی آبروریزی کی گئی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے ایک عوامی لیگی دوست کو چاٹگام کے علاقے میں ایک جبری مشقت کے کیمپ (Concentration Camp) کا پتا چلا تھا جس میں اس کے بقول ۶۰۰ خواتین کو برہنہ رکھا گیا تھا۔ اگر یہ کہانی سچی تھی تو واقعی سفا کی کا مظہر تھی۔ میں نے مخلص الرحمٰن سے پوچھا کہ یہ بات اگر سچ تھی تو منظر عام پر کیوں نہیں لائی گئی، حالانکہ عوامی لیگ ہر وقت یہ راگ الاپتی رہی ہے کہ پاکستانی فوج نے دولاکھ خواتین کی آبرو پامال کی تھی۔ اگر کوئی کونسنٹریشن کیمپ واقعی ملا تھا تو غیرملکی میڈیا کو بھی دکھایا جانا چاہیے تھا۔ سنی سنائی باتوں کے مقابلے میں ثبوت کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ حقیقت پر پردہ ڈالا گیا تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ اگر واقعی ایسا کوئی کونسنٹریشن کیمپ ہوتا تو عوامی لیگ اس پر پردہ ڈال کر پاکستانی فوج کو ذلت سے کیوں بچاتی؟ ظاہر ہے کہ مخلص الرحمٰن جیسے سادہ لوگوں کو پاکستانیوں کی سفا کی کا یقین دلانے کی غرض سے یہ داستان ان کے دوست کے ''زرخیز'' ذہن کی اختراع تھی۔

میرا تجزیہ سننے کے بعد مخلص الرحمٰن نے اس بات سے تو اتفاق کیا کہ کونسنٹریشن کیمپ کے بارے میں جو کچھ انہیں بتایا گیا تھا وہ جھوٹ پر ہی مبنی ہوگا۔ مگر اس کہانی کو ابتدا میں قبول کرنے کا سبب ان کی سادگی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے بارے میں ان کا ملا جلا رویہ بھی تھا۔

جیل میں مجھے ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ مگر ان کی قربت میں میری تنہائی بڑھتی چلی گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ ان لوگوں کا رویہ غیر دوستانہ تھا۔ کبھی کبھی ہمارے درمیان کچھ بدمزگی ضرور پیدا ہوئی مگر جیل میں ہمارا وقت زیادہ تر بہت اچھا گزرا اور ہم نے ایک دوسرے کے نظریات سے آگہی حاصل کی۔ تاہم میں ان کے ذہن کو پوری طرح سمجھ نہ سکا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی میرے بارے میں یہی رائے رکھتے ہوں۔ جس چیز نے مجھے شدید تکلیف پہنچائی وہ یہ حقیقت تھی کہ ملک کے دولخت ہونے کے باوجود ہم میں پاکستان کی اہمیت کا احساس اجاگر نہیں ہوا تھا۔ شیکسپیئر کے بقول ہماری زندگی کو شرابیوں نے داؤ پر لگا دیا ہے۔

ڈھاکا جیل کی دیواروں اور سلاخوں نے کبھی اتنے تعلیم یافتہ قیدی ایک ساتھ نہیں دیکھے ہوں گے۔ ان میں پانچ پی ایچ ڈی تھے، جو سب کے سب یونیورسٹی کے اساتذہ تھے۔ بیرون ملک

تربیت یافتہ بیرسٹرز تھے۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل کو بھی گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ قیدیوں میں درجنوں وکلا تھے۔ ایک ڈاکٹر تھے جن کے پاس ایم آر سی پی کی ڈگری تھی۔ چند علماء کے علاوہ یونیورسٹی اور کالج کے سو سے زائد طلبا بھی قیدیوں میں شامل تھے۔ جیل کا عملہ جس قسم کے قیدیوں سے آشنا تھا یہ سب ان سے بہت مختلف تھے۔ اس لیے وہ تھوڑا بہت پریشان بھی رہتے تھے اور انہیں مشکلات بھی پیش آتی تھیں۔ جیل کا عملہ جانتا تھا کہ یہ قیدی مجرم نہیں اور تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ان ہی سے نہیں، ان کے نئے حکمراں طبقے سے بھی بہت بہتر تھے۔ ان سب میں سے بہ مشکل ڈیڑھ سو افراد کو ڈویژن ون میں رکھا جاسکا، باقیوں کے نصیب میں کھاتہ ہی آیا۔ کھاتہ جیل کی اصطلاح میں اُس وارڈ کو کہتے ہیں جہاں عام قیدی رہتے ہیں۔

جو کچھ کھاتہ میں ہوتا تھا اس کی خبریں ہم تک فالتو قیدیوں کے ذریعے پہنچتی رہتی تھیں جو کھاتے والوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے۔ ان خبروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ گزشتہ ابواب میں جن لوگوں کا میں نے ذکر کیا ہے، ان کے مقابلے میں کھاتہ کے ان قیدیوں کا پاکستان پر زیادہ یقین تھا۔ ان میں چند ہی لوگ تھے جو کسی نہ کسی قیمت پر رہائی چاہتے تھے۔ ورنہ بیشتر کو پاکستان پر یقین تھا اور ان کے اس یقین میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ برملا کہتے تھے کہ بنگلہ دیش کا قیام کوئی اچھی چیز نہیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ بدترین مقدمے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حالات خواہ کچھ ہوں اور خواہ کیسے ہی نتائج بھگتنے پڑیں، وہ اپنے آدرشوں سے وفاداری نبھانا چاہتے تھے۔

کم تعلیم یافتہ اور رضا کار فورس سے وابستگی رکھنے والوں کی وفاداری پر بھی کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جن لوگوں کے گھر لوٹ لیے گئے تھے اور والدین یا دیگر رشتہ دار قتل کر دیے گئے تھے، ان کا ولولہ بھی برقرار تھا جو ایک طرف تو ڈویژن ون کے بعض قیدیوں کے کمزور عزائم کے منہ پر طمانچہ تھا اور دوسری طرف کھاتہ میں بند دیگر قیدیوں کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث۔ جیل میں چار بھائیوں کی کہانی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ان میں سب سے چھوٹا تیرہ سال کا تھا۔ اس کے والد، بھائی اور بہنوئی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ تینوں علاقے میں اپنے تقویٰ اور دینی علم کے حوالے سے محترم سمجھے جاتے تھے۔ اس کے والد ڈھاکا کے ایک مدرسے کے منتظم تھے۔ گھر کا سارا سامان لوٹ لیا گیا تھا۔ گھر میں اب والدہ، بیوہ بہن، اس کے بچے اور ایک غیر شادی شدہ

بہن رہ گئی تھی۔ ان بدنصیب بھائیوں میں سے ایک ''باقر'' ڈویژن ون کے قیدیوں کی خدمت میں رہتا تھا۔ میں نے بعد میں اس کے ایک اور بھائی سے بھی ملاقات کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہیں کسی بھی امر پر کوئی تاسف نہیں تھا۔ انہوں نے حالات کے جبر کو اللہ کی مرضی سمجھ کر قبول کیا۔ انہیں اللہ کے کرم اور انصاف پر غیر متزلزل یقین تھا۔ باقر قرآن کی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کا تحمل، اس کی وضع داری اور تمیز کم از کم میرے لیے تو ایک سبق تھے۔

جیل میں ایک نوجوان مجیب بھی تھا جس نے اسپتال میں علاج کے دوران میری خدمت کی تھی۔ وہ سابق رضا کار تھا۔ وہ بھیس بدل کر اگرتلہ گیا تھا اور اپنی آنکھوں سے بارلیش مسلمانوں کو پاکستان سے ہمدردی رکھنے کے جرم میں کالی دیوی کے قدموں میں ذبح ہوتے ہوئے دیکھ کر آیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مشرقی پاکستان کو جابروں کے پنجے سے چھڑانے کا اس کا عزم مزید پختہ ہو گیا تھا۔

باقر اور مجیب ان ہزاروں نوجوانوں میں سے تھے جنہیں کسی قصور کے بغیر ہی جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان کے کئی ساتھی تشدد سے جاں بحق ہو چکے تھے۔ جیل میں ڈالے جانے والے خود کو خوش نصیب تصور کرتے تھے کہ جان تو بچ گئی! ان کے حوصلے ماند نہیں پڑے تھے۔ ان میں جو ذہین تھے، انہوں نے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی، گو کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے پریشانی کے دن کب ختم ہوں گے۔ تاہم جیل میں مزید دو یا تین سال گزارنا یقینی امر لگتا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ نجات کا دن ضرور آئے گا اور وہ اپنے آپ کو اس وقت کے لیے تیار کر رہے تھے۔

وہ سب اور ان کے بعض ہمر ساتھی اس قدر دل جمعی اور استقامت سے عبادت کرتے تھے کہ جیل ایک بڑی خانقاہ کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ دن رات عبادت اور تلاوت کا اہتمام ہوتا تھا۔ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ جیل میں مشقت کے دوران جب وقفہ ہوتا تھا تو وہ عبادت میں لگ جاتے تھے۔ جن لوگوں کو نماز کا طریقہ معلوم نہ تھا، وہ دوسروں سے پوچھتے تھے۔ روزانہ شام کو جب سیلز کو تالا لگا دیا جاتا تھا، تب قرآن کی تلاوت کی آواز سے پوری جیل کی فضا گونج اٹھتی تھی۔ جن لوگوں نے مذہب کے حوالے سے کوئی تربیت پائی تھی، وہ مختلف امور میں دوسروں کی رہنمائی کرتے تھے۔ کچھ ہی لوگ ایسے تھے جو گلیوں سے اٹھا کر جیل میں ڈال دیے گئے تھے اور وہ خود کو اس ماحول میں رنگنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ مذہب پر عمل کے معاملے میں کھاتہ

اور ڈویژن ون کے قیدیوں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ دونوں طرف کے قیدی پورے جوش وخروش سے نماز ادا کرتے اور روزے رکھتے تھے۔ قرآن کی تلاوت کا جذبہ بھی بیشتر میں بیدار ہو چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب کی تعلیمات پر عمل کے معاملے میں بیشتر قیدی مخلص تھے۔ حالات کی خرابی نے انہیں اللہ سے زیادہ نزدیک کر دیا تھا۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو برے حالات میں تو اللہ کو یاد کرلیا کرتے تھے، مگر جب بھی انہیں کچھ آسانیاں نصیب ہو جاتی تھیں، وہ اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ڈھاکا جیل کے قیدیوں کی اکثریت معاشرے کے مجموعی رنگ میں رنگ جانے والی تھی۔ ان میں پارسائی بھی تھی اور گناہ گاری بھی۔ ان میں سے بیشتر حالات کے بہتر ہو جانے پر دوبارہ گناہ آلود زندگی کی طرف پلٹ جانے والے تھے۔ رہی حقیقی اور دیرپا تبدیلی! تو انسان اتنی آسانی سے کہاں بدلتا ہے؟

ایک بات البتہ میں ضرور کہوں گا کہ پاکستان اور اسلام کے بارے میں ان کی عقیدت لازوال تھی۔ حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا، اس نے ان سب کو اسلام اور پاکستان سے مزید قریب کر دیا تھا۔ جو لوگ مذہب کے رجحانات پر گہری نظر رکھتے ہیں، وہ ان کے عقائد اور ان کی پختگی میں خامی تلاش کریں گے۔ جو لوگ مادہ پرستی کے اصولوں پر نظر رکھتے ہیں، ان کی نظر میں یہ لوگ خاصے کمزور ہوں گے۔ تاہم سچ یہ ہے کہ عام آدمی کوئی فلسفی یا عالم نہیں ہوتا کہ ہر معاملے میں بہت غور وفکر کر کے کوئی راستہ اپنائے۔ وہ دوسروں کی دیکھا دیکھی تھوڑا بہت تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہمیں اُس کے عقائد او راعمال کا تجزیہ اُس کے حالات کے تناظر میں کرنا چاہیے۔ عام آدمی سے جب پوچھا جاتا ہے کہ اس نے بعض عقائد کیوں ترک کر دیے یا بعض دوسرے نظریات کیوں اپنا لیے تو وہ خاصے بچکانہ اور خام سے دلائل دیتا ہے۔ جو شخص منطق کی تربیت حاصل کر چکا ہو، وہ ان دلائل کو پلک جھپکتے میں ریزہ ریزہ کر دے گا۔ مگر ہم بھول جاتے ہیں کہ عقائد اور منطق میں بہت فرق ہوتا ہے۔

جو لوگ جیل میں تھے، انہیں اندازہ تھا کہ اگر وہ پاکستان سے برأت کا اظہار کر بھی دیں تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ گویا اپنے آپ سے غداری ہوگی۔ ایسے میں بہتر یہی تھا کہ اپنے نظریات پر قائم رہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے گرفتاری سے بچنے کے بعد یا گرفتاری سے بچنے کے لیے خود کو نظریۂ پاکستان سے الگ تھلگ کر لیا۔ ان میں پرنسپل ابراہیم خان کی مثال نمایاں تھی۔ یہ وہ

صاحب تھے جنہوں نے ۱۹۷۱ء سے قبل تک مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کی تھی اور ایوب خان کی حاشیہ برداری میں اس حد تک چلے گئے تھے کہ ان کے اپنے حلقے کے لوگ حیران رہ گئے تھے۔ اب یہ فرما رہے تھے کہ عوامی لیگ نے جو آزادی حاصل کی ہے وہ بنگالیوں سے متعلق خود ان (ابراہیم خان) کے خوابوں کی تعبیر تھی! کیا وہ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح خاموش نہیں رہ سکتے تھے؟ یا واقعی ان کے خیالات میں تبدیلی رونما ہو چکی تھی؟ بات کچھ بھی ہو، سچ یہ ہے کہ وہ منافق اور جھوٹے انسان کی حیثیت سے سب پر بے نقاب ہو گئے تھے۔ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے، اگر وہ درست تھا تو پھر انہوں نے (متحدہ پاکستان میں) اپنے ۲۳ سال ضائع کیے، اور اگر وہ اندر سے نہیں بدلے تھے اور صرف جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے تھے تو پھر اسے منافقت ہی قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ عمر کے جس مرحلے میں تھے، اس میں الگ تھلگ ہو کر خاموش ہو رہنا ہی ان کے لیے بہتر تھا۔

ابراہیم خان کے دوست ابوالکلام شمس الدین نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے عشروں میں روزنامہ "آزاد" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت پائی تھی۔ قیام پاکستان کے مطالبے کا ان سے زیادہ پرجوش حامی کوئی نہ تھا۔ عوامی لیگ کے عروج اور دسمبر ۱۹۷۱ء کے المناک واقعات کے بعد ابوالکلام شمس الدین خاموش ہو گئے۔ انہوں نے کسی بھی اخبار یا ریڈیو کو ایک بیان تک نہیں دیا۔ ان کی خاموشی نے انہیں لوگوں کی نظر میں مزید محترم بنا دیا۔

دیوان محمد اظرف نے کم و بیش وہی کردار ادا کیا جو ابراہیم خان نے ادا کیا۔ دیوان محمد اظرف نے بنگلہ دیش کے قیام کی خوشی میں منعقد کی جانے والی تقاریب میں شرکت کی اور بنگالیوں کی آزادی کے حق میں تقاریر کیں۔ ابراہیم خان کے مقابلے میں البتہ وہ خاموش تماشائی رہے۔ پرنسپل ابراہیم کی بیٹی خالدہ ادیب خانم نے ۱۹۷۱ء سے پہلے کے دور میں ایک اہم عورت کی حیثیت سے شہرت پائی تھی جو سیاست دانوں پر ڈورے ڈال کر اپنی پوزیشن مستحکم کر لی تھی۔ خالدہ ادیب خانم نے اب پینترے بدلے اور اخباری بیانات کے ذریعے اپنے ماضی کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ یہ قلابازی اور اداکاری تھی۔ چیتے اپنی کھال کے دھبے بھی دور نہیں کر سکتے۔ مرد اور عورت بھی اپنے اعمال دوسروں سے چھپا نہیں سکتے۔ ہر دور کے عظیم شعراء، ناول نویس اور ڈرامہ نگار ان کے بارے میں لکھتے آئے ہیں۔ ہر زمانے کے ہومر (Homer)،

دانتے (Dantes)، شیکسپیئر (Shakespeares)، مولائر (Moliers)، بالزیک (Balzacs) اور ڈکنس (Dickenses) نے انسانوں کے قول وفعل کے تضاد کو دنیا پر واضح کیا ہے۔ تبدیل ہونا اچھی بات ہے۔ لیکن تیزی سے تبدیل ہوجانا یکسانیت ہی کی ایک شکل ہے!

جو بہادری انسان کو موت کے مقابل کھڑا کرکے اس سے ٹکرانے کا حوصلہ دیتی ہے وہ دنیا بھر میں کمیاب ہے۔ ہمارے معاشرے میں بھی یہی کیفیت ہے۔ ہماری سرشت میں کچھ ایسا ہے جو ہمیں بحرانی کیفیت میں جان کی بازی لگانے سے روکتا ہے۔ ہم ہر حال میں اپنے وجود کو بچانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اپنے تمام اصولوں اور اوصاف کی قربانی دینے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی بحرانی کیفیت میں ہم بہت تیزی سے ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور ہمیں اس سے دامن چھڑانے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ صحیح کیا اور غلط کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں راج شاہی یونیورسٹی کے اساتذہ نے پاکستانی فوج کی موجودگی میں جو رویہ اختیار کیا اس نے بہتوں کو حیران کر دیا۔ یونیورسٹی میں میرا پبلک ریلیشنز آفیسر ناظم محمود تھا۔ وہ پکا دہریہ تھا اور ہر معاملے میں بائیں بازو کی حمایت کیا کرتا تھا۔ مگر جب کریک ڈاؤن ہوا تو اس نے سر پر ٹوپی رکھنے کو اپنی شناخت بنا لیا اور پنج وقتہ نمازی بن گیا۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ایسا کرکے وہ اپنے آپ کو بچا لے گا۔ اس کی یہ شرمناک اور ذلت آمیز بزدلی کسی کو متاثر نہ کر سکی۔

اگر کوئی ڈھاکا جیل لائے جانے والے نام نہاد غداروں کے عزائم کی پختگی پرکھنا چاہتا ہے تو اس صورت حال کے تناظر میں پرکھے جس کا انہیں سامنا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نوجوانوں میں عزم زیادہ راسخ تھا اور وہ کسی بھی موڑ پر ڈگمگانے سے گریز کرتے تھے۔ جن نوجوانوں کی تربیت مدارس میں ہوئی تھی، وہ دوسروں سے بہت الگ دکھائی دیتے تھے۔ وہ بہت متحمل مزاج تھے، حالات کی سختی کو عمدگی سے برداشت کرتے تھے۔ ان کا یہ رویہ دوسروں کے لیے بھی حوصلہ افزا تھا۔ ان میں امید نے کسی بھی مرحلے پر دم نہیں توڑا۔ ان نوجوانوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنے آدرشوں کو مرنے نہیں دیں گے۔

کچھ لوگ اس نکتے پر بھی بہت غور کرتے تھے کہ ہم نے جو آدرش اپنے وجود کا حصہ بنا رکھا تھا، وہ عارضی طور پر ہی سہی، ناکامی سے کیوں دوچار ہوا۔

جیل میں ہم بھی اپنے گریبان میں جھانکنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ہم اپنی کوتاہیوں پر غور کرتے تھے اور ہماری کوشش ہوتی تھی کہ اپنے ماضی کو بیان کر کے اس سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھیں۔ کوئی نہیں تھا جو حالات کی روش پر غور نہ کرتا ہو اور ملک کو المیے سے دوچار کرنے والے حالات کے اسباب سمجھنے کا خواہش مند نہ ہو۔ انسان ہر حال میں اپنے وجود کو مقدم رکھتا ہے۔ ڈھاکا جیل کے قیدیوں میں بھی ہر ایک سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتا تھا۔ تاہم ساتھ ہی ساتھ وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا تھا کہ اس کا مستقبل ملک کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ ان میں صرف دو افراد ایسے تھے جو ہم سے الگ ہوئے۔ یہ دونوں ڈاکٹر عبدالمالک کی صوبائی کابینہ کے ارکان عبیداللہ مجمدار اور سلیمان تھے، جو اس بات پر سخت تاسف کا اظہار کرتے تھے کہ انہوں نے پاکستان کا ساتھ ایک ایسے وقت میں کیوں دیا جب اُس کی موت واقع ہو رہی تھی! ان کے خیال میں نجات کی واحد صورت یہ تھی کہ اپنے جرائم کا اعتراف کر کے شیخ مجیب الرحمٰن سے معافی مانگی جائے۔ شیخ مجیب الرحمٰن ان کے لیے روئے زمین پر خدا کا متبادل تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو پاکستان کے حامی نہیں رہے تھے، مگر چونکہ ان کے جرائم کی نوعیت سنگین تھی اس لیے انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

جب مصیبت سر پر آ پڑتی ہے تو ہر انسان دانش کا مرقع بن جاتا ہے۔ اے ٹی ایم متین سیاست میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے، مگر وہ بھی سقوطِ مشرقی پاکستان کو ٹالنے والے حالات کے حوالے سے اپنی رائے دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد اقتدار سونپنے کی صورت میں المیے کو ٹالا جا سکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کو چلانا شیخ مجیب الرحمٰن کے بس کی بات نہ تھی۔ کچھ ہی دنوں میں اس کی مقبولیت فضا میں تحلیل ہو جاتی۔ مولانا نورالزماں کا کہنا تھا کہ پاکستان کی ناکامی کا اصل سبب یہ تھا کہ اس نے اسلام ان بنیادی آدرشوں کے مطابق خود کو ڈھالنے میں ناکام رہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک لسانی معاملے سے جس طرح نمٹا گیا، اس نے خرابی پیدا کی اور ملک کو دشمنوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ۶ نکات تسلیم کر لیے جاتے تو ملک نہ ٹوٹتا۔ جیل میں ایسے لوگ بھی تھے جو (پاکستان کے) غداروں کی مذمت تو کرتے تھے۔

مگر ساتھ ہی پاک فوج کے مظالم کا بھی رونا روتے تھے۔ ایک طبقہ اس خیال کا حامل تھا کہ ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو حکومتی امور میں اپنی اہلیت ثابت کرنے میں ناکام رہے اور شیخ مجیب کے ہاتھ میں کھلونا بن گئے۔ بعض لوگوں کے خیال میں مغربی پاکستان کے سیاسی قائدین نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو ان کے حقوق دینے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے حوالے سے مختلف آرا پائی جاتی تھیں۔ عوامی لیگ کے مقابل تمام سیاسی جماعتیں ناکام رہیں۔ وہ کوئی ایسا اتحاد بنانے میں کامیاب نہ ہو سکیں جو متبادل قیادت کی حیثیت سے کام کرنے کا اہل ہوتا۔ جب بھی عام انتخابات کا ذکر چھڑتا، جیل میں موجود سیاسی قائدین خاموشی اختیار کرتے یا آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہیں اور کچھ کہنے کی ہمت نہیں پا رہے ہیں۔ اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا ہو کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے یا اس کی پارٹی نے انتخابات کے موقع پر پاکستان کے لیے اپنا کردار پوری ایمانداری سے ادا کیا تھا۔ بصیرت سے محرومی اور خود غرضی میں سبھی برابر تھے۔ جس وقت ملک کو ان سے اخلاص درکار تھا، وہ نشستوں کی تقسیم پر لڑ رہے تھے۔ بہت سے دوسرے معمولی امور بھی نزاع کا سبب بنے ہوئے تھے۔ جس بحران سے وہ نظریں چرا رہے تھے، اس کے بارے میں خود بھی انہیں یقین تھا کہ وہ اِن سمیت سب کو بہا کر لے جا سکتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ متحد ہو کر ہی بحران کا سامنا کیا جا سکتا ہے، مگر وہ پھر بھی متحد نہ ہوئے۔

سب کی گفتگو سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ مشرقی پاکستان کے المیے نے انہیں شدید متاثر کیا ہے۔ پندرہ ماہ گزر چکے تھے، مگر اس کے باوجود انہیں حالات سے مطابقت پیدا کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی میں پہلے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ آخر ہوا کیا ہے۔

کسی بھی معاملے کا تاریخی پس منظر ایک خاص مدت گزرنے کے بعد ہی واضح ہوتا ہے، تب ہی لوگ اس پر غور کر کے کسی نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ اصول ہر قسم کے معاملات پر لاگو ہوتا ہے۔ پس منظر بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ قریب کا اور دور کا۔ جو واقعہ ابھی کل ہوا ہے اس کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ۵۰۰ یا ۱۰۰۰ سال بعد کیسا دکھائی دے گا! جن واقعات کو محدود نقطۂ

نظر سے دیکھنا ممکن نہ ہو، اُن کا غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تجزیہ آسان ہو جاتا ہے۔ دو عالمگیر جنگوں کے اسباب اور عوامل پر غور کرنا نپولین بونا پارٹ کے عروج و زوال کے اسباب تلاش کرنے سے بہت مختلف ہے۔ نپولین کا معاملہ محدود ہے، دو عالمگیر جنگوں کا معاملہ خاصا وسیع ہے اور اس میں کئی براعظم ملوث ہیں۔

مشرقی پاکستان کے المیے کو گزرے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں (یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے)۔ اب تک ہم اسے درست پس منظر میں دیکھنے کے قابل نہیں ہوئے۔ اس کے اسباب صحیح نہج پر ہماری سمجھ میں نہیں آرہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سانحے کے اثرات ابھی تک واضح ہو رہے ہیں اور ہم ان کی زد میں ہیں۔ اس بات کو سمجھنا بہرحال مشکل نہیں کہ ملت کے غداروں نے دشمن کے ساتھ مل کر ہمیں اس المیے سے دوچار کیا۔

غدار کیونکر کامیاب ہوئے، اس سوال پر بحث کی بھرپور گنجائش ہے۔ ایک مرحلے پر ایسا دکھائی دیا جیسے ملک میں کوئی بھی محب وطن نہیں اور سبھی نے دشمن سے ساز باز کرنے والوں کی قیادت قبول کر لی ہے۔ مگر جیل میں اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں تھا۔ ملک میں ایسے ہزاروں محب وطن تھے جو وطن کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے کا عزم رکھتے تھے۔ تو پھر وہ اپنے ارادے میں ناکام کیوں رہے؟ میں جانتا ہوں کہ اس سوال کے جواب میں لوگ مشتعل ہو کر کہیں گے کہ ایک بڑی فوج نے ایک آزاد ملک کے بہت بڑے رقبے پر قبضہ کیا۔ اگر غداروں کو بھارتی فوج کی مدد حاصل نہ ہوئی ہوتی تو وہ ہرگز کامیاب نہ ہو پاتے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستان میں جو جاندار آوازیں تھیں وہ بھی کمزور پڑ گئی تھیں اور انہوں نے ملک کے بارے میں سوچنا اور بولنا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف بیٹھ گئی تھیں۔ رائے عامہ کو اس قدر متاثر کر دیا گیا تھا کہ لوگوں نے مجموعی طور پر پاکستان کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب رائے عامہ پاکستان کے خلاف ہو گئی تو بھارتی فوج کے لیے کام آسان ہو گیا۔ کوئی بھی بڑا ملک کسی چھوٹے یا کمزور ملک پر قبضہ کر سکتا ہے، مگر رائے عامہ کو اپنا نام نہاد نہیں بنا سکتا۔ جرمنی نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فرانس، بلجیم اور ہالینڈ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان ممالک میں جرمنوں کو کچھ غدار بھی مل گئے تھے۔ فرانس میں مارشل پیٹین (Marshal Petain)

اس حوالے سے نمایاں تھا، کچھ لوگ اس کے ساتھ بھی تھے۔ مگر کوئی مؤرخ کسی بھی حال میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ جرمنوں نے فرانسیسی عوام کے جوش وجذبے پر بھی قابو پالیا تھا۔

ایک فرق اور بھی ہے۔ مارشل پٹین اور لاول (Laval) نے بھی کسی مرحلے پر ہٹلر کو نجات دہندہ قرار نہیں دیا۔ جبکہ شیخ مجیب الرحمٰن نے مسز اندرا گاندھی کو بنگالیوں کا نجات دہندہ قرار دے دیا۔ آندرے ملراکس (Andre Malraux) اور ژاں پال سارتر (Jean Paul Sartre) نے مشرقی پاکستان کے المیے کو قومی آزادی کی لڑائی قرار دیا تھا، لیکن امریکا اور برطانیہ میں کوئی بھی بڑی شخصیت خود کو اس قدر واضح انداز سے بنگلہ دیش کے کاز سے نہ جوڑ سکی۔ البتہ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ مشرقی پاکستان کے المیے کے دوران امریکا اور برطانیہ کے پریس نے باغیوں کا کھل کر ساتھ دیا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان اور امریکی سینیٹرز نے اس معاملے میں خود کو غیر جانبدار رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر انہوں نے کبھی ایک آزاد و خود مختار ملک، پاکستان کو دولخت کرنے والے عوامل کی مذمت کی بھی تو بس سرسری انداز سے۔ وہ بڑی آسانی سے پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے۔ سوال یہ ہے کہ اتنی آسانی سے اتنے سارے لوگوں کو کس طرح بے وقوف بنایا گیا؟ ایسا کون سا طریق کار اپنایا گیا جس نے معاملات کو یکطرفہ طور پر پاکستان کے خلاف کردیا؟ ہم معاملات کو الگ تھلگ نہیں کرسکتے۔ سب کچھ ایک ہی تناظر میں دیکھنا ہوگا۔

میرے خیال میں اس معاملے کے کئی پہلو ہیں، جن پر غور کیے بغیر ہم اُن بین الاقوامی عوامل کو، جنہوں نے امریکا، سوویت یونین اور چین کے رویے کو ڈھالا، سمجھنے میں ناکام رہیں گے۔ امریکا اور سوویت یونین کا رویہ اس قضیے میں کچھ اس نوعیت کا رہا جیسے وہ اس سے یکسر الگ تھلگ رہنے کا تاثر بھی دینا چاہتے ہوں اور بھارت کی مدد بھی کررہے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ سوویت یونین نے بھارت کو پاکستان توڑنے کی شہہ کیوں دی؟ امریکا اور چین نے پاکستان کے لیے جس حمایت کا اعلان کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟ بھارت کا کردار تو سمجھ میں آتا ہے۔ اسے پاکستان سے نفرت تھی جو ظاہر ہوکر رہی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا کردار سمجھنا بھی دشوار نہیں۔ غداروں نے دشمن کے اشاروں پر وہی کیا جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔ پیچیدگی اس بات کو سوچنے سے پیدا ہوتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کو کیا ہوگیا تھا کہ اس قدر آسانی سے شیخ مجیب اور اس کے ساتھیوں کے پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے؟

پندرہ بیس سال کے نوجوانوں کو الزام دینا درست نہیں۔ مگر بڑی عمر کے لوگوں نے پاکستان کے قیام سے قبل کلکتہ کے ہاتھوں اپنا استحصال دیکھا اور بھگتا تھا۔ مشرقی پاکستان بن جانے والے علاقوں سے پٹ سن، چائے اور چرمی کھالیں مغربی بنگال جایا کرتی تھیں اور اس کے بدلے میں برائے نام سہولتیں ملتی تھیں۔ مشرقی بنگال مچھلی، پولٹری، انڈے، سبزیاں اور دوسری بہت سی چیزیں بھی فراہم کیا کرتا تھا۔ ترقیاتی کاموں کے فقدان اور رابطوں کی سہولت نہ ہونے کے باعث غیر منقسم بنگال میں مشرقی علاقے پس ماندہ رہ گئے تھے (یا رکھے گئے تھے) اور انہیں عملاً مغربی بنگال کی معاشی غلامی اختیار کرنی پڑی تھی۔ ترقیاتی منصوبوں کا مطالبہ یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا جاتا تھا کہ مشرقی بنگال میں کوئی بھی بڑا منصوبہ معاشی اعتبار سے سودمند ثابت نہیں ہوگا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی بنگال یعنی مشرقی پاکستان میں جس قدر بھی ترقیاتی کام ہوئے انہیں عوامی لیگ نے پس ماندگی کی علامت بنا کر پیش کیا۔ حقائق دبا دیے گئے، اعداد و شمار مسخ کر دیے گئے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ ان علاقوں میں اربوں روپے کی سرمایہ کاری کرنے والے مغربی پاکستان کے کاروباری افراد کو استحصالی عناصر ٹھہرایا گیا۔ جس سرمایہ کاری کی مشرقی پاکستان کو اشد ضرورت تھی اسے مغربی پاکستان کے کاروباری افراد کا استحصالی ہتھکنڈا قرار دیا گیا۔ نئی صنعتوں کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا اور روزگار کی فراہمی کے لیے نئے اداروں کو کس طور چلایا جائے گا، یہ وہ سوالات تھے جن کا جواب تلاش کرنے یا ان کے بارے میں سوچنے سے گریز کیا گیا۔ پاکستانی حکومت کے شدید ترین ناقدین وہ نئے بنگالی سرمایہ دار تھے جنھیں خود وفاقی یا مرکزی حکومت نے پیدا کیا تھا۔ قیامِ پاکستان نے ان پر جو احسان کیا تھا، اسے فراموش کر کے وہ غیر بنگالی سرمایہ کاروں کو نکال کر راتوں رات بے حساب دولت کا مالک بننے کے خواب دیکھنے لگے۔

ایک طرف تو یہ غداری، فریب کاری، حماقت اور خود فریبی کی داستان ہے اور دوسری طرف دور اندیشی کے فقدان، لاعلمی ولاتعلقی اور بے حسی کی کہانی ہے۔ ان تمام عوامل نے مل کر سانحہ مشرقی پاکستان کو جنم دیا۔

نواں باب

سازش کا بیج

ملک توڑنے کی سازش کا بیج ڈالنے سے ۱۹۷۱ء میں اِس فصل کے ''بار آور'' ہونے تک کے بعد دیگر رونما ہونے والے تمام واقعات کی بنیاد بنگالی قوم پرستی تھی۔ دانشوروں اور طلبا نے اس پُرفریب ''نظریے'' کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا عزم ظاہر کر کے اس کے ساتھ مکمل وفاداری کا حلف اٹھایا۔ بعض نے اپنے آپ کو اس یقین کے ساتھ بنگالی قوم پرستی کے لیے وقف کر دیا کہ اُن کی نسل کی بقا اسی میں ہے! پھر یہ بھی ہوا کہ آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کو ''نظریہ'' بنا کر اپنا لیا گیا۔ اس ضمن میں منطقی تجزیے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی اور نہ ہی جذبات کی سطح سے بلند ہو کر معاملات کا جائزہ لینے کے بارے میں سوچا گیا۔ قوم پرستی پروان چڑھتی گئی اور اس پر فدا ہونے والوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ جنون کا یہ عالم تھا کہ اسے عملاً مذہبی عقیدے کی حیثیت حاصل ہو گئی! جن لوگوں نے بنگالی قوم پرستی کی مخالفت کی، وہ بھی اس میں چھپی ہوئی طاقت کو نہیں سمجھ سکے اور انہوں نے بہت سے بنیادی نکات کو نظر انداز کیا جن کے باعث اس لعنت کو راتوں رات پنپنے کا موقع مل گیا۔ نوجوانوں میں قوم پرستی کے جذبات تیزی سے پروان چڑھے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بارود کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں بنگالی قوم پرستی کے سراسر خلاف تھا لیکن نوجوانوں میں اس نظریے کی مقبولیت کا میں بھی اندازہ نہیں لگا سکا اور جب یہ بم پھٹا تو پتا چلا کہ مجھ سمیت کسی نے بھی بچنے کی تیاری نہیں کی تھی۔

شیکسپیئر نے ایک جگہ کہا ہے کہ فطرت کو میرے معصوم لوگوں کی پرورش کی خاطر وہ سبھی کچھ لانا چاہیے جو وہ چاہتے ہیں، خواہ زہر ہی کیوں نہ ہو!

پاکستان کے خلاف عوامی لیگ نے جس بنگالی قوم پرستی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، اسے ایک فریب اور سراب کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ زبان کی بنیاد پر ابھاری جانے والی قوم

پرستی لوگوں کو ہیروازم کی طرف لے جا سکتی ہے، انہیں نئے آدرش پروان چڑھانے کی تحریک دے سکتی ہے، انہیں جنگوں پر اُکسا سکتی ہے، فرقہ وارانہ خانہ جنگی کو راہ دے سکتی ہے اور معاشرے میں شدید بے چینی بھی پیدا کر سکتی ہے۔ مگر کیا بنگالی قوم پرستی کو معروف معنوں میں قوم پرستی قرار دیا جا سکتا ہے؟

برصغیر کی تاریخ کی پیچیدہ نوعیت کی وجہ سے یہ بات بلا خوف و تردد کہی جا سکتی ہے کہ اس خطے میں لوگوں کو متحد رکھنے میں مذہب اور تاریخ نے زبان سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ زبان کی بنیاد پر تنازعات بنگالیوں اور آسامیوں میں اور شمالی بھارت میں ہندی بولنے والوں اور ہندی نہ بولنے والوں کے درمیان سر اٹھاتے رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب بیسویں صدی میں ہوا ہے۔ انیسویں صدی میں زبان کی بنیاد پر فساد برائے نام تھا۔ علاقائیت ضرور فروغ پائی تھی تاہم وہ جغرافیائی اور مذہبی بنیاد پر تھی، زبان کی بنیاد پر نہیں۔ بھارت میں قوموں اور زبانوں کا تنوع رہا ہے۔ ان متنوع زبانوں اور مختلف ثقافتی پس منظر کے حامل لوگوں پر حکمران اپنے انتظامی نظریات تھوپتے رہے ہیں۔ اگر مغل اور برطانوی سلطنت زبان کی بنیاد پر قائم نہیں تھی تو قدیم ہند میں موریہ خاندان کی حکومت کی بنیاد بھی زبان نہیں تھی۔ جب بھی مرکزی حکومت کمزور پڑتی تھی اور سلطنت چھوٹے چھوٹے راجواڑوں میں تقسیم ہو جاتی تھی، اُس وقت بھی ہر یونٹ زبان یا اسی طرح کی کسی اور بنیاد پر کام نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے معاملات مرکز سے بغاوت کرنے والے قائدین کے ہاتھ میں ہوا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل جنوبی بھارت میں چولا اور چیرا کی بادشاہت، مسلم بادشاہت میں ضم ہو جانے والی وجے نگر کی ریاست، مرہٹوں اور سکھوں کی حکومت یا پھر بنگال کی بادشاہت، یہ سب زبان کی بنیاد پر قائم ہونے والی جغرافیائی اکائیاں نہیں تھیں بلکہ یہ سب راجواڑے تھے جن کی قیادت کسی انتہائی بااثر سردار کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور ان کی حدود کا تعین اس کی فوجی طاقت کا مرہونِ منت تھا۔

سلطنتِ بنگال کو یہ نام زبان اور جغرافیہ دونوں کی بنیاد پر ملا۔ اس کی حدود میں بہار کے ہندی/اردو بولنے والے اور شمال مشرقی بھارت میں اڑیسہ کے علاقے بھی شامل تھے۔ مشرق میں بنگال کی سلطنت آسام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی۔ نام کے سوا بنگال کی سلطنت میں مغلوں

سے قبل کے زمانے کی ریاستوں کے مقابلے میں کوئی فرق نہ تھا۔ کسی بھی ہندوستانی یا برطانوی مؤرخ نے ان ریاستوں کے عروج و زوال میں زبان کے کسی کردار کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ مرہٹے مغربی ہندوستان کے جنوبی ہندو تھے۔ سکھ بھی بڑی حد تک مذہبی جنونی تھے کیونکہ وہ ہندوؤں سے چند صدیاں پہلے ہی الگ ہوئے ہیں۔ نسلی طور پر سکھ اور پنجابی مسلمان ایک ہی ہیں۔

ہندوستان کے ہر دور میں زبانوں اور نسلوں کا تنوع رہا ہے۔ بہار کی مغربی سرحدوں سے پنجاب کی مشرقی سرحدوں تک پھیلے ہوئے زرخیز علاقے میں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ بستے آئے ہیں۔ اگر ان علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کو بنیادی ہندوستانی بولی کی مختلف شکلیں اختیار کر جانے والی بولی کی حیثیت سے شناخت کیا جائے تو پھر ان نسلوں کو کیا کہا جائے گا؟ راجپوتوں کی رگوں میں خالص آریہ نسل کے لوگوں کا خون دوڑتا ہے۔ دارالحکومت دہلی، لکھنؤ، الٰہ آباد اور آگرہ کے اردگرد پورے خطے میں مختلف النسل لوگ ملیں گے۔ آریوں کی اولادیں ترک، مغل، ایرانی اور پٹھان نسلوں میں گھل مل گئی ہیں۔

زبانوں اور نسلوں کا یہی تنوع ہمیں جنوب میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ جنوبی ہند میں تامل، تیلگو، ملیالم اور کنڑ بڑی اور نمایاں زبانیں ہیں۔ ان زبانوں کا تعلق نسل سے نہیں۔ جنوبی ہند میں سب سے بڑا نسلی گروپ دراوڑ ہے اور اس خطے کی نمایاں زبانیں بھی دراوڑ ہیں۔ ان تمام حقائق کے باوجود برصغیر کی تاریخ نسلی ہے نہ لسانی۔ شمال اور جنوب تعصب کی بنیاد پر تقسیم رہا ہے اور ان میں کشیدگی بھی رہی ہے تاہم اسے زبان یا نسل کا تنازع قرار نہیں دیا جاسکتا۔ برطانوی راج کے دوران جنوبی ہند میں حیدرآباد کی خودمختار ریاست میں مغل، ترک اور افغان نسل سے تعلق رکھنے والے مسلمان بڑی تعداد میں آباد تھے اور یہ لوگ اردو بولا کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ شمال کی طرف اسی طرح شک بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے جس طرح ہندو یا دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے دراوڑ۔ بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے کے دوران جب بہار سے آباد کار بلا کر بنگال میں آبادی کا عدم توازن دور کرنے کی بات کی گئی تو مسلمانوں نے اس تجویز کی بھرپور مخالفت کی۔

برصغیر پاک و ہند آج اُسی مقام پر کھڑا ہے، جہاں قرونِ وسطیٰ میں رومن ایمپائر کی شکست و ریخت کے بعد یورپ تھا۔ انگلینڈ کے چاسر (Chaucer)، اٹلی کے دانتے (Dante)، فرانس کے رابے لائی (Rabelais)، لاطینی کے مقابلے میں اپنی اپنی زبانوں کا جھنڈا بلند کرنے کے باوجود اپنے آپ کو سب سے پہلے یورپین ہی گردانتے تھے۔ چاسر کو انگلینڈ کی اس جداگانہ حیثیت کا احساس تھا کہ یہ یورپ سے علیحدہ ایک جزیرہ ہے۔ اسی طرح بیسویں صدی کا اٹلی دانتے کے دور کے اٹلی سے یکسر مختلف ہے اور پھر دانتے کی کُل حب الوطنی اپنے شہر فلورنس کے گرد گھومتی تھی۔ ان یورپی دانشوروں نے سمجھ لیا تھا کہ مختلف علاقائی اور لسانی مظاہر سے بڑھ کر یورپی ثقافت تھی جو ان میں مشترک تھی۔ یہ دانشور بھونچکے رہ جاتے اگر کوئی ان کو بتلاتا کہ فرانس اور انگلینڈ کی یا اٹلی اور فرانس کی ثقافت کوئی الگ چیزیں ہیں۔ اس وقت کی یورپی ثقافت کی بنیاد عیسائیت اور روم و یونان کا تہذیبی ورثہ تھا۔ ان ثقافتی بنیادوں پر اگلی چار صدیوں میں یورپ میں قومی ریاستوں کا تانا بانا بُنا گیا، جن میں نسل اور زبان کا عنصر نمایاں تھا۔ تاہم زبان اور قومیت مکمل طور پر برتری حاصل نہیں کر سکے۔ سوئٹزرلینڈ اس کی زندہ مثال ہے۔ اسی طرح ہالینڈ ہے جو یورپی سیاست میں نمایاں ہے مگر جس کا وجود زبان یا قوم کا مرہونِ منت نہیں ہے یا پھر جرمن زبان بولنے والا ملک آسٹریا ہے، جس کی علیحدگی کی تحریک کو ہٹلر بھی نہیں کچل سکا۔ آخر ایک ہی زبان بولنے والے دو ملکوں یعنی آسٹریا اور جرمنی کا کیا جواز بنتا ہے۔ اسی طرح مشرقی اور مغربی جرمنی کو ہم کیا کہیں جو مسلمہ طور پر ایک ہی زبان بولنے والے دو ملک تھے۔

لسانی بنیاد پر قوم پرستی کی بات کرنے والوں کو ہنگری، ہالینڈ یا سوئٹزرلینڈ کی مثال پسند نہیں آئے گی۔ مگر کیا ریاستوں کی تشکیل میں ہم زبان اور کلچر کے کردار کو تاریخی حقائق کے معاملے میں زیادہ اہمیت دیں گے؟ رومن سلطنت کے ٹوٹ کر بکھرنے پر یورپ نے جو کچھ کیا وہی سب کچھ برصغیر میں بھی ہوا۔ مغل سلطنت کے بکھرنے پر مختلف علاقوں میں بااثر قائدین کے زیر اثر چھوٹی چھوٹی ریاستیں نمودار ہوگئیں۔ مقامی سیاست کے الٹ پھیر نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ بہار، اڑیسہ اور بنگال پر مشتمل علی وردی خان کی بادشاہت، اودھ اور آگرہ میں نوابوں کی حکمرانی، پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت، مغرب میں مرہٹوں کی، حیدرآباد اور میسور

میں مسلمانوں کی فرماں روائی مجموعی طور پر الگ الگ ریاستوں کی شکل میں باقی رہ سکتی تھی مگر برصغیر میں برطانیہ اور فرانس کی کشمکش نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

میں اپنی بات منوانے کے لیے ماضی کو نہیں کھنگال رہا بلکہ جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں، اس کا بنیادی مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ لسانی قوم پرستی ایک بالکل نئی چیز ہے۔ جو کچھ حکمرانوں نے لوگوں پر مسلط کیا اس سے ہٹ کر برصغیر میں اتحاد اور یکجہتی کی بنیاد ہمیشہ مذہبی ثقافت پر رہی ہے۔ مغرب کے مرہٹے، مشرق کے بنگالی اور دوسرے، بہت سے علاقوں کے ہندوؤں کی مذہبی روایات ایک تھیں۔ ان کے دیوتا مشترک تھے، گیتا اور اپنشد پر ان کا کامل یقین تھا۔ مہابھارت اور رامائن ان کے لیے محض نظمیں نہیں تھیں بلکہ ان میں وہ مذہبی احکام بھی تلاش کرتے تھے۔ البتہ یہ اتحاد بلا استثنا نہیں تھا، جزوی تھا۔ کروڑوں مسلمان تھے جو کسی بھی اعتبار سے ہندوؤں کی مذہبی روایات کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ہم تھوڑے بہت عیسائیوں اور پارسیوں کو نہ گنیں تو پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے باشندوں کو ایک لڑی میں پرونے والی چیز ہندوازم تھا یا پھر اسلام۔ زبان یا نسل نے کبھی اتحاد کی بنیاد کا کردار ادا نہیں کیا۔ اگر ہندوازم اور اسلام کو نکال دیا جائے تو اس خطے میں صرف نسلی اور قبائلی روایات اور ان کے باہمی تصادم سے پیدا ہونے والی بدحواسی ہی رہ جائے گی۔

کانگریس نے ہندوستان میں قوم پرستی کا جو تصور پیش کیا، اس نے مسلمانوں کی جانب سے پیش کیے جانے والے اس تصور کو مسترد کر دیا کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی کتاب ''دی ڈسکوری آف انڈیا'' میں بھارتی یکجہتی اور یگانگت پر زور دیا ہے اور اس سے انکار کرنے والوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ انہوں نے بھارتی یکجہتی کے جواز کے طور پر ہندو کلچر کے سوا کیا پیش کیا ہے؟ اور دوسروں کی طرح خود نہرو بھی اس خیال کے حامل تھے کہ ہندو کوئی مذہب نہیں، روایات کا مجموعہ ہے! وہ ہندو کلچر کو خالص مذہبی نہیں بلکہ سیکولر کلچر قرار دیا کرتے تھے۔ مشکلات اسی مقام سے شروع ہوئیں۔ گیتا، اپنشد اور ویدوں کے کلچر میں مذہب کو اپنانے کا تصور نہیں تھا، تاہم قرآن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ قرآن کو زندگی بسر کرنے کے مکمل ضابطے کی حیثیت سے اپنانے کا واضح مطلب مذہب کو گلے لگانا ہی

تھا۔ اب ہوا یہ کہ جس نے ہندو کلچر کو اپنایا اور اس کے مطابق زندگی بسر کرتا رہا، وہ تو مرکزی دھارے میں شامل کہلایا اور اس سے کسی کو کوئی اختلاف نہ رہا مگر جس نے اس کلچر سے ہٹ کر کچھ اور اپنایا تو اسے قبول کرنے سے انکار کا رویہ پروان چڑھا اور اسے فرقہ پرست قرار دیا گیا۔ ہندو واضح اکثریت میں تھے اور یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ برصغیر کا اجتماعی کلچر ہی یہاں کا مذہب ہے۔ مسلمانوں کے لیے ہندوؤں کی عددی برتری کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔

مسلمانوں نے اپنے لیے برصغیر میں الگ وطن کا مطالبہ طویل مدت تک بحث و تمحیص کے بعد کیا۔ کانگریس نے ایسے حالات پیدا کیے کہ مسلمانوں کے لیے اس مطالبے کے سوا چارہ نہ رہا۔ مسلمانوں کے جذبات کو یکسر نظر انداز کرنے اور تضحیک کا نشانہ بنانے کا یہی نتیجہ برآمد ہونا تھا۔ مسلمانوں کے لیے کانگریس کی تنگ نظری ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ کانگریس نے ہندوستان کے لیے یگانگت کی بنیاد ہندو مذہب اور کلچر کو بنایا اور اس حوالے سے مسلمانوں کے کسی بھی دعوے یا دلیل کو سننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ جب مسلمانوں نے یہ سوال کیا کہ کیا ہندوستانی کلچر ہندو مذہب سے ہٹ کر کوئی چیز ہے تو جواہر لعل نہرو نے دی ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں اس کا جواب یہ دیا کہ کشمیر میں ان کی اپنی نسل کے لوگ مسلمانوں کی طرح گوشت کھاتے ہیں! اس مثال کو پیش کرنے کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے اس دعوے کو غلط قرار دینا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی کھانے پینے کی عادات بھی مختلف ہیں۔ نہرو نے گوشت کے لیے Beef کے بجائے Meat کا لفظ استعمال کیا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ان کے نزدیک بعض ہندو بکرے یا مرغی کا گوشت کھاتے ہیں، گائے کا نہیں! کشمیر یا بھارت میں کہیں ہندوؤں کا کوئی ایسا گروپ نہیں جو گائے کا گوشت کھانے کا عادی ہو۔ مغربی طرزِ فکر رکھنے والے چند ایک ہندو کھاتے ہوں تو کھاتے ہوں، مجموعی طور پر ہندوؤں کی کوئی آبادی ایسی نہیں جو گائے کے گوشت کو خوراک کا باضابطہ حصہ بنا کر زندگی بسر کر رہی ہو۔ جواہر لعل نہرو نے کشمیر میں بسنے والے ہندوؤں کو گوشت خور قرار دے کر سفید جھوٹ بولا تھا۔ نہرو جیسے پڑھے لکھے اور جدید اطوار کے حامل شخص نے بھی اس جھوٹ کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

نہرو کی کتاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر میں تفاوت کے حوالے سے ایک اور

مضحکہ خیز مثال موجود ہے۔ نہرو نے مسلمانوں کی جانب سے ہندوؤں سے ثقافتی طور پر الگ ہونے کا دعویٰ مسترد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہیں ایک بڑا فرق بس یہی دکھائی دیا ہے کہ مسلمان ایسے لوٹے استعمال کرتے ہیں جن میں سے پانی نکالنے کے لیے ٹونٹی الگ سے بنی ہوتی ہے جبکہ ہندو گول لٹیا کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں۔ کلچر کے فرق کو واضح کرنے کے لیے اس سے زیادہ احمقانہ بات اور کیا ہو سکتی ہے!

ہندوستان میں کلچر، زبان، نسل اور مذہب کا تنوع غیر معمولی رہا ہے۔ اس بنیاد پر ہندوستان کے پاس آپشن بھی اچھے خاصے تھے۔ جو لوگ برطانوی سامراج کی جانب سے انتظامی مقاصد کے لیے قائم کی جانے والی مصنوعی وحدت کو برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے، وہ ایک ایسا وفاقی ڈھانچا تیار کر سکتے تھے جس میں تمام اکائیاں رنگ، نسل، کلچر یا مذہب کی بنیاد پر آزاد حیثیت کی حامل ہوتیں تاہم ویسے مل کر رہتیں۔ اس صورت میں ان کی انفرادیت اور خود مختاری داؤ پر لگنے سے محفوظ رہتی۔ کانگریس کے قائدین نے ابتدا ہی سے یہ راگ الاپا کہ ہندوستان ایک قومی ریاست ہے اور ہندوستان کی حدود میں رہنے والے ہندوستانی ایک قوم ہیں۔ مسلمان اور دیگر اقوام نے اس تصور کی جس قدر مخالفت کی، کانگریس اسی شدت سے کثیر القومی ہندوستان کے تصور سے دور ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے لیے یہ مشکل گھڑی تھی۔ ہندوستان کو ایک قوم قرار دینے میں انتہا پسند ہندو مثلاً مالویہ اور سیکولر ہندو مثلاً جواہر لعل نہرو اس حد تک چلے گئے کہ واپسی مشکل ہوگئی۔ مالویہ اور مونجے جیسے لیڈر کھل کر کہتے تھے کہ ہندوستان ہندو ریاست ہوگا جبکہ پنڈت موتی لعل نہرو اور پنڈت جواہر لعل نہرو ہندوستان کو سیکولر بنیاد پر قومی ریاست بنانے کے حق میں تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود ہندو قائدین کے ذہنوں میں واضح نہ تھا کہ ہندو ازم اور سیکولر ازم میں فرق کیا ہے۔ قدیم ویدانت کے فلسفے کو قبول کر لینا تو (مذہب نہ ہونے کے باوجود) درست تھا تاہم اسلام کو قبول کرنے میں قباحت تھی۔

برطانوی سلطنت کے ختم ہونے کی صورت میں لسانی بنیاد پر ریاستیں بھی معرضِ وجود میں آ سکتی تھیں۔ اس صورت میں جنوب میں تو ایک دراوڑ ریاست بن جاتی، آسام میں زبان اور کلچر

کے فرق کی بنیاد پر کئی ریاستیں معرض وجود میں آتیں، پنجاب میں پنجابی راج کرتے اور مغربی ہند میں مرہٹے اور گجرات والے۔ وسطی اور مشرقی ہندوستان میں بھی زبان کی بنیاد پر ریاستیں بنائی جاسکتی تھیں۔ وسطی اور مشرقی ہندوستان میں ایک ہی نسل کے لوگوں میں مختلف زبانیں بولنے والے گروپ تھے جو مختلف علاقوں میں رہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل کوئی اچھایا قابلِ عمل حل نہیں تھا۔

اگر ریاستوں کی تشکیل میں نسل سے زیادہ زبان اہم ہے تو پھر برصغیر میں جتنی بھی زبانیں ہیں، اُتنی ریاستیں ہونی چاہیے تھیں۔ کانگریس نے زبان کی بنیاد پر ہندوستان کو ایک انتظامی اکائی کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی کوشش کی تاہم ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ ہر زبان کی بنیاد پر الگ ریاست کے قیام کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کانگریس نے ابتدا ہی سے اس بات پر زور دیا کہ برطانیہ نے ہندوستان کو جس شکل میں چلایا، اسی شکل میں اسے برقرار رکھتے ہوئے قومی ریاست میں تبدیل کرنا چاہیے۔ انتظامی طور پر وفاق کے برقرار رکھنے کے باوجود اس کے انتظامی یونٹ اپنی نوعیت کے اعتبار سے تو قومی ریاستیں ہی ہوتیں۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے تحت ہندوستان سے برما کی علیحدگی کی کانگریس نے مخالفت کی تھی۔ واضح رہے کہ برما ثقافتی یا لسانی اعتبار سے کبھی ہندوستان کا حصہ نہیں رہا۔ کانگریس کے لیڈر عظیم تر ہندوستان چاہتے تھے جس پر وہ برطانوی سامراج کے ختم ہونے پر حکومت کریں۔ مسلمانوں کی جانب سے علیحدہ ریاست کے قیام کے مطالبے کی مخالفت بھی اسی بنیاد پر کی گئی۔ ہندو چاہتے تھے کہ برطانوی حکمرانوں کے جانے کے بعد پورا ہندوستان انہیں ملے اور وہ اس پر بلاشرکتِ غیرے حکومت کریں۔

جنوبی ایشیا

بنگلہ دیش
خشکی کے ذریعہ
تین اطراف سے اور
سمندر (خلیج بنگال) کے
ذریعہ جنوب سے بھی
بھارتی حصار میں

۱۹۶۰ کی دہائی میں تعمیر شدہ ڈھاکا کی معروف بیت المکرم مسجد

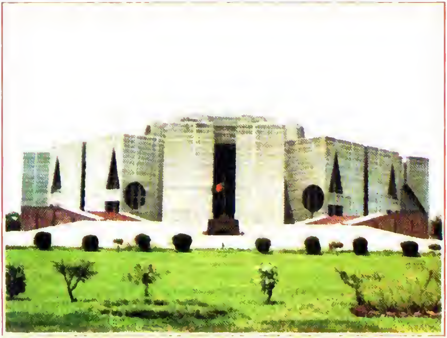

متحدہ پاکستان کے لیے تعمیر کردہ قومی اسمبلی کی عمارت (شیر بنگلہ نگر، ڈھاکا)

اب یہ بنگلہ دیش کی پارلیمان ہے

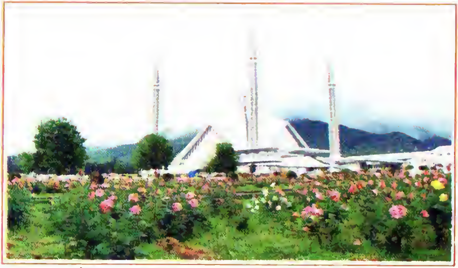

۱۹۷۰ء کی دہائی میں تعمیر شدہ، شاہ فیصل مسجد، اسلام آباد۔ پاکستان کے لیے شاہ فیصل شہید کا تحفہ

اسلامی جمہوریہ پاکستان کی مجلس شوریٰ کی عمارت (پارلیمنٹ ہاؤس) اسلام آباد

مزار قائداعظم، کراچی

یہاں
قائداعظم محمد علی جناح
لیاقت علی خان
نورالامین
اور
محترمہ فاطمہ جناح
مدفون ہیں

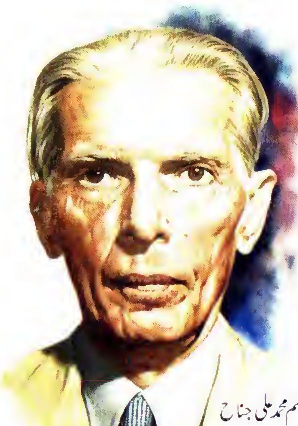

قائداعظم محمد علی جناح

بیسویں صدی میں برصغیر جنوبی ایشیا کی ملت اسلامیہ کے
عظیم قائد اور بانی پاکستان (مشرقی ومغربی پاکستان)

قائداعظم کا پاکستان

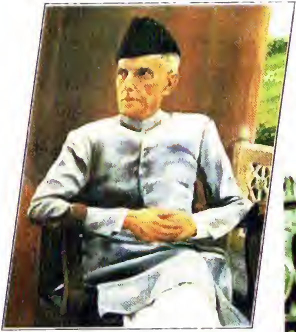

ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی
کے پہلے صدر اور
پاکستان کے پہلے گورنر جنرل
قائداعظم محمد علی جناح

پاکستان کے پہلے وزیراعظم، شہید ملت
نوابزادہ لیاقت علی خان

حسین شہید سہروردی
بانی عوامی مسلم لیگ، جو بعد میں عوامی لیگ بن گئی
نیز پاکستان کے پانچویں وزیراعظم
۱۹۵۶ء۔۱۹۵۷ء

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (مفکر پاکستان)

مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے، متحدہ پاکستان کے حکمراں

خواجہ ناظم الدین

متحدہ پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل اور دوسرے وزیراعظم

مرشد آباد، بنگال سے تعلق رکھنے والے میجر جنرل

صاحبزادہ سید اسکندر علی مرزا

متحدہ پاکستان کے چوتھے اور آخری گورنر جنرل اور پہلے صدر

محمد علی بوگرہ

متحدہ پاکستان کے تیسرے وزیراعظم (۱۹۵۳۔۱۹۵۵ء)

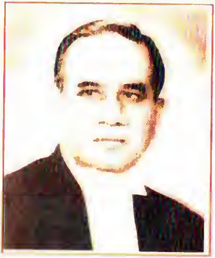

حسین شہید سہروردی

متحدہ پاکستان کے پانچویں وزیراعظم (۱۹۵۶۔۱۹۵۷ء)

قائداعظم کے بعد متحدہ پاکستان کی مرکزی اسمبلی کے
تمام صدور اسپیکرز مشرقی پاکستان سے تھے (۱۹۴۸ تا ۱۹۶۹ء)

مولوی تمیز الدین خان
(صدر دستور ساز اسمبلی ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۴ء
اسپیکر قومی اسمبلی ۱۹۶۲ء ۱۹۶۳ء)

عبدالوہاب خان
(صدر دستور ساز اسمبلی ۱۹۵۵ء ۱۹۵۶ء
اسپیکر قومی اسمبلی ۱۹۵۶ تا ۱۹۵۸ء)

اے کے ایم فضل القادر چوہدری
(اسپیکر قومی اسمبلی ۱۹۶۳ تا ۱۹۶۵ء)

عبدالجبار خان
(اسپیکر قومی اسمبلی ۱۹۶۵ تا ۱۹۶۹ء)

عظیم بنگلہ شاعر
قاضی نذرالاسلام
جنہیں بنگلہ زبان کا علامہ اقبال
بھی کہا جا سکتا ہے

شیر بنگلہ اے کے فضل الحق
جنہوں نے لاہور میں ۱۹۴۰ء
کی قرارداد پاکستان پیش کی تھی

پروفیسر غلام اعظم، جو مشرقی
پاکستان میں جماعت اسلامی
کے صوبائی امیر تھے اور بعد میں
بنگلہ دیش جماعت اسلامی کے
بھی امیر رہے

صدر محمد ایوب خان
فیلڈ مارشل کی یونیفارم میں

صدر ایوب خان
۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو قوم سے
خطاب میں کرسئ صدارت
چھوڑنے کا اعلان کر رہے ہیں

عبدالمنعم خاں
۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک
مشرقی پاکستان کے گورنر رہے

شیخ مجیب الرحمٰن

(صدر عوامی لیگ ۔ بنگلہ دیش کے وزیر اعظم اور پھر "ون پارٹی سسٹم" کے تحت صدر بنگلہ دیش)

ذوالفقار علی بھٹو

(چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی ۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر پاکستان ۔ بعد میں بہ متفقہ وزیر اعظم)

اندرا گاندھی

(قیام بنگلہ دیش کے وقت بھارت کی وزیر اعظم)

جنرل آغا محمد یحییٰ خان

(چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر پاکستان ۱۹۶۹ء۔۱۹۷۱ء)

جن کے دور صدارت میں پاکستان دولخت ہوا

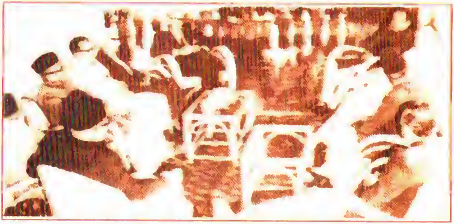

صدر ایوب خان حزب اختلاف کے رہنماؤں کے ساتھ

صدر پاکستان یحییٰ خان اور ہنری کسنجر (امریکی صدر کے قومی سلامتی کے مشیر اور بعد میں وزیر خارجہ)

مشرقی پاکستان کے شعلہ بار سیاست دان
عبدالحمید خان بھاشانی

بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی
مقبولیت کے بام عروج پر

دسمبر ۱۹۷۰ء میں ہونے والے پہلے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کی کل ۳۱۳ (۳۰۰ عام اور ۱۳ خواتین کی) نشستیں تھیں۔ ۳۰۰ عام نشستوں میں سے ۱۶۲ مشرقی پاکستان سے اور ۱۳۸ مغربی پاکستان سے۔ مشرقی پاکستان کی ۱۶۲ نشستوں میں سے ۱۶۰ پر عوامی لیگ نے کامیابی حاصل کی۔ صرف دو نشستوں پر عوامی لیگ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ (بقول شیخ مجیب الرحمٰن: ہمارے لئے تو یہ دو نشستیں بھی لے لینا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے انہیں دے دیا)۔ ایک نشست مسلم لیگ کے رہنما جناب نورالامین نے جیتی اور دوسری چکما قبیلے کے سردار راجہ تری دیو رائے نے حاصل کی۔ جبکہ ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان میں الیکشن نہیں لڑا۔ جبکہ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے مغربی پاکستان میں برائے نام حصہ لیا اور صرف چند امیدوار کھڑے کیے۔ کوئی جیت نہ سکا۔

نورالامین

۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۴ء صوبہ مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ اور تقسیم پاکستان کے وقت مختصر مدت کے لیے وزیر اعظم رہے (۱۹۷۱ء)۔ ۱۹۷۲ء میں نائب صدر پاکستان بنے۔ پاکستان ہی میں رہے۔ یہیں انتقال کیا اور مزار قائد اعظم کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔

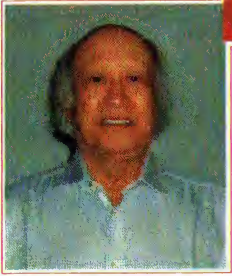

راجہ تری دیو رائے

مشرقی پاکستان کے چاٹگام ہل ٹریکٹ، رانگامتی کے قبائلی علاقے سے تعلق رکھنے والے چکما قبیلے کے سردار۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش نہیں گئے۔ پاکستان میں رہے۔ پاکستان کے مرکزی وزیر اور سفیر کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ ۱۷ ستمبر ۲۰۱۲ء کو اسلام آباد میں انتقال کیا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء

رمنا ریس کورس گراؤنڈ، ڈھاکا میں پاکستان آرمی کی مشرقی کمان کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی (دائیں طرف) اور بھارتی حملہ آور فوج کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا (بائیں طرف) مشرقی پاکستان پر بھارتی قبضہ مکمل ہونے کی دستاویز پر دستخط کر رہے ہیں

۳ سابق صدور پاکستان

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء۔ اسلام آباد۔ انتقالِ اقتدار کی دستاویز پر دستخط کرتے ہوئے۔ فارغ ہونے والے صدر و چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل آغا محمد یحییٰ خان۔ نئے صدر و چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو اور اس وقت کے وفاقی سیکرٹری غلام اسحاق خان (دائیں سے بائیں)

۸ جنوری ۱۹۷۲ء

شیخ مجیب الرحمن (بائیں) راولپنڈی جیل سے اپنی رہائی کے فوری بعد، باقی ماندہ پاکستان کے صدر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ

جولائی ۱۹۷۲ء۔ شملہ (بھارت)

بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی پاکستانی صدر ذوالفقار علی بھٹو کے وفد کا استقبال کرتے ہوئے۔ دائیں جانب سردار سورن سنگھ اور بے نظیر بھٹو بھی نظر آ رہی ہیں

ذوالفقار علی بھٹو

پاکستانی وزیرخارجہ اور نائب وزیراعظم

(سقوطِ ڈھاکہ سے ایک روز قبل) ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ کو

نیویارک میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے

اجلاس سے واک آؤٹ کرتے ہوئے۔

بھارتی وزیرخارجہ سورن سنگھ بیٹھے نظر آرہے ہیں

جسٹس حمود الرحمٰن "حمود الرحمٰن کمیشن" کی رپورٹ صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو پیش کر رہے ہیں

۱۹۷۱ء۔ موہن جو دڑو ایئرپورٹ

صدر پاکستان جنرل آغا محمد یحییٰ خان پاکستان

پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی دعوت

پر لاڑکانہ کے موہن جو دڑو ایئرپورٹ پر

جناب بھٹو جنرل یحییٰ خان کا استقبال کر رہے ہیں

نوجوان شیخ مجیب الرحمٰن اپنے سیاسی لیڈر اور استاد حسین شہید سہروردی کے ساتھ (۱۹۴۹ء)

چینی وزیراعظم چو این لائی اور پاکستانی وزیراعظم حسین شہید سہروردی کی موجودگی میں شیخ مجیب الرحمٰن، بطور صوبائی وزیر کوئی اعلان پڑھتے ہوئے (۱۹۵۶ء)

صوبہ مشرقی بنگال کے "جگتو فرنٹ" (متحدہ محاذ) کی صوبائی حکومت میں بطور وزیر، وزیرِاعلیٰ فضل الحق کے سامنے حلف اٹھاتے ہوئے (۱۹۵۴ء)

شیخ مجیب الرحمٰن
اگرتلہ سازش کیس میں
پیشی کے لیے ٹریبونل جاتے
ہوئے (۱۹۶۸ء)

۷ مارچ ۱۹۷۱ء
ڈھاکہ ریس کورس گراؤنڈ
میں لاکھوں حامیوں کے
سامنے تقریر کرتے ہوئے۔
عام توقع کے برعکس بنگلہ دیش
کی ''آزادی'' کا اعلان
نہیں کیا۔

بنگلہ دیش کے حکمران کی حیثیت سے بھارتی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی
کے ساتھ ۲۵ سالہ ''معاہدۂ دوستی'' کرتے ہوئے (مارچ ۱۹۷۲ء)

۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو کراچی سے براستہ لندن
ڈھاکہ پہنچنے پر استقبال

میجر جنرل ضیاء الرحمٰن

بطور میجر، پاکستان آرمی سے بغاوت کر کے ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو چاٹگام کے قریب ریڈیو اسٹیشن سے بنگلہ دیش کی ''آزادی'' کا پہلی بار اعلان کیا۔ اگست ۱۹۷۵ء میں شیخ مجیب الرحمٰن کے قتل کے بعد بنگلہ دیش میں ۲۰ ماہ سویلین حکومت رہی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۷۷ء کو (تب بنگلہ دیش آرمی کے چیف آف اسٹاف) میجر جنرل ضیاء الرحمٰن نے مارشل لاء لگا کر بنگلہ دیش کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ ۳۱ مئی ۱۹۸۱ء میں وہ چاٹگام کے اسی علاقے میں بھارتی ''را'' کی تیار کردہ سازش کے نتیجے میں قتل کر دیے گئے جہاں انہوں نے ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی ''آزادی'' کا اعلان کیا تھا

شیخ حسینہ واجد
شیخ مجیب الرحمٰن کی
صاحبزادی اور سیاسی وارث

بیگم خالدہ ضیاء
میجر جنرل ضیاء الرحمٰن کی
بیوہ اور سیاسی وارث

میجر جنرل ضیاء الرحمٰن
بنگلہ دیش کے سابق صدر اور
مارشل لاء لگانے میں پیش پیش

دسواں باب

علیحدہ وطن کا مطالبہ

مسلمانوں کی جانب سے علیحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ خاصے تذبذب کے بعد پیش کیا گیا تھا۔ بہار، یوپی، سی پی، بمبئی، مدراس اور آسام میں کانگریس کی حکومتوں کے تحت مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ انہیں ہندوستانی قوم پرستی کے نتیجے میں کیا کیا جھیلنا پڑے گا، تب انہوں نے اپنے لیے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے قیام کے لیے سوچنا شروع کیا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر جب کانگریس کی حکومتوں نے استعفیٰ دے دیا تھا، اس موقع پر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے جلسے میں مسلمانوں نے ایک قرارداد منظور کی جس میں مسلمانوں کے لیے ہندوستان سے الگ ایک ریاست کے قیام کا باضابطہ مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ قرارداد اصلاً ایسی نہ تھی کہ واپس نہ لی جاسکتی ہو۔ اس میں ایک آزاد وطن کے قیام کا مطالبہ ضرور کیا گیا تھا تاہم تفصیلات بیان کرنے سے گریز کیا گیا تھا۔ اس قرارداد کی منظوری کا بنیادی مقصد سیاسی ردعمل کا جائزہ لینا تھا اور جیسے ہی یہ قرارداد منظرعام پر آئی، مسلمانوں کو غدار اور وطن دشمن قرار دینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیاں اس قدر بڑھیں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب دونوں کے درمیان بات چیت کا دروازہ ہی بند ہوگیا۔ ایسی صورت میں معاملات کو درست کرنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

یہ بات تو بعید از تصور ہے کہ کانگریس کے تجربہ کار اور جہاندیدہ قائدین علیحدہ وطن کے مطالبے کی پشت پر کام کرنے والی نفسیات کو سمجھ ہی نہ پائے ہوں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا وہ کسی بھی معاملے پر سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھے۔ گاندھی جی کے نزدیک مسلمانوں کے لیے ہندوستان کو کاٹ کر علیحدہ ملک بنانا ایسا ہی تھا جیسے کسی جاندار کے دو ٹکڑے کردیے جائیں! بھارت ماتا کے ٹکڑے ہونے کے نام پر ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ابھارا گیا۔ ڈاکٹر راجندر

پرشاد (Dr. Rajendra Prasad) نے (جو بعد میں بھارت کے پہلے صدر منتخب ہوئے) تقسیم ہند کے موضوع پر اپنی کتاب میں علیحدہ وطن کے قیام کے مطالبے کو مسترد کرنے کے لیے دلائل کا انبار لگا دیا ہے مگر وہ ان عوامل کی تشریح کرنے میں ناکام رہے جو مسلمانوں میں علیحدگی پسند رجحان کے پہنچنے کی راہ ہموار کرنے کا سبب بنے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اپنے مخصوص انداز میں مسلمانوں کے اس مطالبے کے خلاف بڑے زور و شور سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مغرب کو متاثر کرنے کے لیے اپنے مخصوص نظریات کے مطابق بڑھ چڑھ کر بولتے رہے۔ تاہم انہوں نے ہندوؤں کے حد سے بڑھتے ہوئے تسلط کے بارے میں مسلمانوں کے خدشات کو رفع کرنے کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا۔ کانگریس کے سینئر قائدین میں صرف سی راج گوپال آچاریہ (C. Rajagopalacharia) ہی ایسے رہنما تھے جو مسلمانوں کے اس مطالبے کی اہمیت کو سمجھتے تھے تاہم نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے!

اتحاد کے تمام دعوؤں کے باوجود یہ کانگریس ہی تھی جس نے ۱۹۴۶ء میں گروپنگ اسکیم کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ہندوستان کو متحد رکھنے سے متعلق یہ آخری آئینی کوشش تھی۔ کیبنٹ مشن کی جانب سے پیش کی جانے والی گروپنگ اسکیم کو مسلم لیگ نے قبول کر لیا تھا۔ شروع میں تو کانگریس نے بھی اسے قبول کر لیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل مشرقی گروپ، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، کسی بھی وقت ملک سے الگ ہونے کا مطالبہ کر سکتا ہے تو اس نے اپنی حمایت واپس لے لی۔ پہلے تو کانگریس نے گروپوں اور صوبوں کے اختیارات کی تشریح پر مشتمل اپنی تجاویز پیش کیں جو قبول نہیں کی گئیں۔ پھر لندن میں ایک کانفرنس کے دوران کانگریس نے مسلمانوں کا یہ موقف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ گروپنگ اسکیم کے مطابق کوئی بھی علاقہ متحدہ بھارت سے علیحدگی اختیار کر سکے گا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ کانگریس کے قائدین اس نکتے پر اَڑ گئے کہ گروپنگ اسکیم کی جو تشریح انہوں نے بیان کی ہے وہی درست ہے، تجویز پیش کرنے والے کچھ بھی کہتے رہیں۔ اور انتہا جواہر لعل نہرو کے اس اشتعال انگیز بیان سے ہوگئی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آنے والی آئین ساز اسمبلی ماضی کے تمام معاہدوں اور سمجھوتوں کو منسوخ کرنے کی اہل ہوگی اور اس اسمبلی کے ایک بار قائم ہو نے

کے بعد پچھلے کسی بھی سمجھوتے کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ آئین ساز اسمبلی ملک کے سیاسی ڈھانچے کا نئے سرے سے تعین کرے گی۔ اس بیان کا صاف مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو جو بھی یقین دہانیاں کرائی گئی تھیں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' میں جواہر لعل نہرو کے اس بیان کو ایک فاش غلطی قرار دیا ہے جس نے ہندوستان کے مقدر کو تبدیل کر کے تقسیم کو ناگزیر بنا دیا۔ اس بیان کے بعد مسلمان کانگریس کی کسی بھی بات پر کیسے یقین کر سکتے تھے؟

گروپنگ اسکیم کو تاراج کرنے کے بعد کانگریس کی اگلی چال پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے وائسرائے بننے سے قبل تک ایسا کوئی مطالبہ سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ گویا جاتے جاتے مسلم لیگ کا زور توڑنے کی ایک کوشش تھی حالانکہ برطانوی حکومت آئینی تعطل دور کرنے کے لیے پاکستان کے قیام کا فیصلہ کر چکی تھی۔ پنجاب میں سکھ اور بنگال میں مہاسبھا، شیاما پرشاد مکھرجی (Shyama Prasad Mukherjee) کی قیادت میں، صوبوں کی تقسیم کی اس تحریک کے ہراول دستے مقرر ہوئے اور تحریک نے چند ہی ہفتوں میں ایسا زور پکڑا کہ مسلم لیگ کے لیے اعصاب شکن صورت حال پیدا ہوگئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تجویز ایک گہری اور سوچی سمجھی سازش کا حصہ تھی جس کا بنیادی مقصد مسلم لیگ کے لیے مشکلات پیدا کرنا اور رکاوٹیں کھڑی کرنا تھا۔ مسلم لیگ اس تحریک سے کس حد تک دباؤ میں آ گئی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قائداعظم نے سہروردی کے خود مختار بنگال کے منصوبے کی خاموش حمایت شروع کر دی تھی۔ منقسم پنجاب تو سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے ساتھ جی سکتا تھا مگر مشرقی بنگال کے لیے مغربی بنگال میں رہ جانے والے دارالحکومت کلکتہ سے علیحدہ ہو کر جینا بہت مشکل تھا کیونکہ وہاں تک پہنچنے کے لیے بھارت کے ہزار میل کے علاقے سے گزرنا پڑتا۔ اگر مشرقی بنگال کے مسلمان اس وقت مغربی بنگال کے ہندوؤں سے مل کر ایک خود مختار ریاست قائم کر لیتے تو شاید وہ ہندوؤں کے تسلط سے نجات پا جاتے۔ ہم جو اُس وقت نوجوان تھے، خود مختار بنگال کے حق میں نہیں تھے۔ ہماری نظر میں تو جیسا تیسا پاکستان بھی خود مختار بنگال کے منصوبے سے کہیں بہتر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے

انگریزی ہفت روزہ ''کامریڈ'' میں جو مولانا اکرم خان کی ادارت میں اسی وقت بحال ہوا تھا، حسین شہید سہروردی اور ابوالہاشم کے خود مختار بنگال کے منصوبے پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔ گو کہ اس منصوبے کو سرت بوس (Sarat Bose) کی حمایت حاصل تھی مگر کانگریس کی ہائی کمانڈ نے اسے مسترد کر دیا تھا۔

جو احمق ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار مسلم لیگ کو قرار دیتے ہیں، وہ بہت سے تاریخی حقائق کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ بنگالی قوم پرستی کے علمبرداروں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خود مختار بنگال کے مطالبے کو تسلیم کیے جانے کی صورت میں بھی بنگال کی وحدت برقرار رہتی۔ ۱۹۴۷ء کے یوم آزادی کے موقع پر میں نے ''کامریڈ'' میں لکھا تھا کہ صوبوں کی تقسیم تو عمل میں آ گئی ہے تاہم مشرقی بنگال کے جن اضلاع کو الگ کر دیا گیا ہے، ان کا دوبارہ اپنے اصل علاقوں سے جوڑا جانا ناگزیر ہے۔

جو لوگ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا تجزیہ کریں گے وہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے کانگریس نے آخری وقت تک کسی بھی تصفیے پر آمادگی ظاہر نہیں کی بلکہ وہ اس کی راہ میں روڑے ہی اٹکاتی رہی۔ بنگلہ دیش اور ہندوستان میں آج بنگالی قوم پرستی کا راگ الاپا جا رہا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ۱۹۴۷ء میں بنگال کو تقسیم کیوں ہو جانے دیا گیا؟ جن ہندوؤں نے ۱۹۰۵ء میں بنگال کی انتظامی تقسیم کو یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا تھا کہ بنگال جسدِ واحد کی طرح ہے اور اسے دو حصوں میں نہیں بانٹا جا سکتا، انہی ہندوؤں نے ۱۹۴۷ء میں کیوں بنگال کو تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا؟ اس لیے کہ وہ خود مختار بنگال میں مسلم اکثریتی حکومت کے ماتحت زندگی گزارنے کے بجائے مغربی حصے میں رہنا پسند کرتے تھے۔ اس وقت کسی نے بنگالی نسل کی بات نہیں کی۔ مادرِ وطن کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے پر کسی نے آنسو نہیں بہائے۔ آج بندے ماترم کا راگ الاپنے والے اُس وقت کے سیاسی افق پر کہاں تھے؟

بنگال کے مسلمانوں کی ''بصیرت'' اور سیاسی فیصلے کرنے کی صلاحیت پر کیا تبصرہ کیا جائے، دکھ بس یہی ہے کہ وہ یہ سب کچھ بھول گئے ہیں! قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کلکتہ میں ہندو پریس

نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں لکھنا شروع کر دیا کہ ان کا مستقبل غیر یقینی ہے اس لیے کہ زبان اور نسل کے رشتے آسانی سے ختم نہیں ہوتے اور مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمان اس پروپیگنڈے کا بہت آسانی سے شکار ہو گئے۔

ہندوستان نے باضابطہ پروپیگنڈا کیا کہ اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیے جانے سے مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمانوں کا استحصال ہو جائے گا اور انہیں غلامانہ زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ بھارت میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا مگر مغربی بنگال کے ہندوؤں کو اس میں اپنی زبان اور نسل کے لیے کوئی خطرہ دکھائی نہیں دیا! کیا یہ کھلا تضاد نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کے نام نہاد دانشور ہندوستان کے اس کھیل کو سمجھنے میں ناکام رہے اور انہوں نے بنگالی زبان کو اردو سے لاحق خطرات پر واویلا شروع کر دیا۔ راتوں رات یہ بدگمانی پھیلا دی گئی کہ پاکستان میں بنگالی زبان کے خلاف کوئی زبردست سازش کھڑی کر دی گئی ہے۔

صرف لسانی مسئلہ کھڑا کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بدگمانی بھی پھیلائی گئی کہ بنگال میں تو دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی تھیں اور اسے پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔ نام نہاد بنگالی دانشور اب یہ بھی بتانے لگے تھے کہ بنگال کا عظیم ثقافتی ورثہ خطرے سے دوچار ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھول بیٹھے کہ بنگال اُس وقت تک ۱۹۴۲ء کے قحط کے اثرات سے ہی چھٹکارا نہیں پا سکا تھا بلکہ دوسری جنگ عظیم کے باعث معیشت اور معاشرت کو پہنچنے والے نقصانات کا ازالہ بھی اس وقت تک نہیں ہو پایا تھا۔ بنگال میں قحط عام بات تھی۔ مختلف ادوار میں غذائی اجناس کی شدید قلت رونما ہوتی رہی ہے۔ عام حالات میں بھی غذا ایک مسئلہ رہا ہے مگر اس حقیقت سے بھی نظر چرائی گئی۔ ۱۹۴۲ء کے قحط سے پہلے ۲۳ سال قبل بھی بنگال میں ایک ایسا قحط پڑا تھا کہ لاکھوں جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ بنگالی ادب ہر بیس پچیس سال کے بعد رونما ہونے والے قحط اور اس کے نتیجے میں ہونے والی خوراک کی قلت سے متعلق کہانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس حوالے سے شاعروں نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس تکالیف دہ صورتحال پر بہت سی نظمیں بھی لکھی گئی ہیں۔ مگر بنگال کے ناخواندہ لوگوں کا حافظہ کمزور ہے اور وہ تلخ سچائی کی طرف سے آنکھیں موند لینے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا اور

خیالی پلاؤ پکانا اچھا لگتا ہے۔ بنگال کی تاریخ قحط، سیلاب، طوفان اور افلاس سے عبارت ہے مگر وہ ان تمام باتوں کو بھول کر اس خیال سے دل کو بہلانا چاہتے ہیں کہ بنگال میں تو ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی تھی اور یہاں کبھی کوئی بھوکا نہیں مرتا تھا۔

بعض مصنفین نے بنگال کی نام نہاد اور خیالی خوشحالی کے راگ الاپنے کی کوشش کی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں سے بنگال کے حصے میں مشکلات ہی آئی ہیں۔ آبادی کی بہتات اور بھوک نے اس خطّے کو دبوچ رکھا ہے۔ سترھویں صدی میں کلینڈر کی وضع پر لکھی جانے والی نظمیں ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونی چاہئیں۔ ان نظموں میں کشاکشِ زندگی میں پیچھے رہ جانے والے انسانوں پر ہر بارہ ماہ میں آنے والے چکر کا ذکر کیا جاتا تھا جو اپنے تن کے کپڑوں سے بھی محروم تھے اور جن میں زندہ رہنے کی لگن بھی ختم ہو چکی تھی۔ جو کچھ انہیں غذا کے نام پر ملتا تھا وہ بعض دوسرے خطوں میں جانوروں کی خوراک کے لیے بھی ناکافی اور غیر معیاری سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ تہذیب کے دائرے سے باہر ہوتے تھے اور ان میں اپنی حالت کو بدلنے کی صلاحیت تھی نہ سلیقہ۔

بنگال کی خوش حالی کے بارے میں اس قدر ڈھول اس لیے پیٹا جاتا ہے کہ یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ مگر اس پر دباؤ بھی تو غیر معمولی ہے۔ جو زمین ایک ملین افراد کا پیٹ بھرنے کے لائق ہو، وہ پانچ یا دس ملین افراد کا پیٹ کیسے بھر سکتی ہے؟ بنگال میں وسائل اور آبادی کے درمیان ہمیشہ کھینچا تانی رہی ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے وسائل میں اضافے کے لیے کسی نے نہیں سوچا۔ زمین تو محدود ہے اور خوراک کے دیگر ذرائع بھی۔ ایسے میں خوشحالی کا کیسے سوچا جا سکتا ہے؟ بنگال کی زمین زرخیز ہونے کے باوجود لوگوں کو پیٹ بھرنے کی سکت اس لیے نہیں رکھتی کہ یہاں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔

قدرتی آفات بھی بنگال کا باقاعدگی سے رخ کرتی رہی ہیں۔ سیلاب اور سمندری طوفان سے کھڑی فصلوں کا تباہ ہونا رہنا ایک مستقل حقیقت ہے۔ بھارت اور برما سے بٹنے والے ڈھلوان کی بلندی پر واقع ہونے کے باعث بنگلہ دیش سمندری طوفانوں، مون سون ہواؤں اور سیلابی ریلوں کی زد میں رہتا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، کوئی ایک سال بھی ایسا

نہیں دیکھا جب بنگال کے کسی نہ کسی حصے میں سمندری طوفان، قیامت خیز بارشوں اور سیلاب نے تباہی نہ مچائی ہو اور فصلوں کو تباہ نہ کیا ہو۔ ان قدرتی آفات سے جانی نقصان بھی بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ سال میں کوئی ایک مہینہ بھی آفات سے مکمل طور پر محفوظ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خلیج بنگال میں اٹھنے والے طوفان کے سامنے بنگلہ دیش ہی کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کی خوش نصیبی ساتھ دے بھی رہی ہو تو طوفان شمال مشرق میں برما یا پھر شمال مغرب میں ہندوستان کا رخ کر جاتا ہے۔ مگر اس خوش نصیبی کا بھی تو کوئی فائدہ نہیں۔ طوفانی بارشیں تو بہر حال بنگلہ دیش ہی کا رخ کرتی ہیں۔ اس کے بعد سیلابی ریلے امڈے چلے آتے ہیں۔ ستمبر ۱۹۷۰ء کے سمندری طوفان میں مشرقی پاکستان کے پانچ لاکھ سے زائد باشندے جاں بحق ہوئے تھے۔ اس طرح کے طوفانوں اور تیز بارشوں سے چالیس پچاس ہزار ہلاکتیں اور بڑے پیمانے پر تباہی کسی کو حیرت میں مبتلا نہیں کرتی۔ یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ ۱۹۵۴ء کے بعد کے دس سالوں کے دوران سمندری طوفانوں سے سالانہ چالیس سے پینتالیس ہزار افراد موت کے منہ میں جاتے رہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طرف تو سیلاب اور سمندری طوفان آتے ہیں اور سب کچھ تباہ کر ڈالتے ہیں، دوسری طرف شدید خشک سالی بھی بنگال ہی کا مقدر بنتی ہے۔ شمال مغربی علاقوں میں صورتِ حال زیادہ سنگین ہوتی ہے۔ یہاں موسم زیادہ خشک رہتا ہے اور بوائی کے بعد مہینوں بارش نہیں ہوتی۔ جنوبی بنگال میں بھی بارش کا نہ ہونا ایک معمول ہے۔ بارش کا نہ ہونا اور طوفان اور سیلاب کا آنا، بات ایک ہی ہے۔ یعنی فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور خوراک کی شدید قلت پیدا ہو جاتی ہے۔

گزشتہ چند عشروں کے دوران یہاں کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے اور فی مربع میل اوسطاً ۱۵۰۰ افراد کی رہائش نے قابلِ کاشت زمین پر دباؤ مزید بڑھا دیا ہے۔ بہتر زندگی کے لیے دنیا بھر میں اور بالخصوص ترقی یافتہ دنیا میں فی کس قابلِ کاشت زمین اور رہائشی زمین کا تناسب بنگلہ دیش سے کہیں زیادہ ہے۔ بنگلہ دیش میں بڑے کھیت ناپید ہیں۔ عام طور پر منقسم زمین کے ٹکڑوں پر کسان اپنی اپنی کاشت کاری کرتے ہیں۔ ایک یا نصف ایکڑ کے کھیت عام ہیں۔ کھیتی باڑی کے پرانے طریقے مروج ہیں جس کے باعث بنگلہ دیش کا شمار ان ممالک میں

ہوتا ہے جن میں فی ایکڑ پیداوار بہت کم سطح پر ہے۔

بنگال میں کوئی بھی شخص ان تمام سنگین حقائق سے بے خبر نہیں ہے اور بے خبر رہ بھی نہیں سکتا۔ یہاں غربت کا یہ عالم ہے کہ جو لوگ صبح کا ناشتہ اور دو وقت کا کھانا باقاعدگی سے کھا پائیں، وہی خوش حال سمجھے جاتے ہیں۔ مغرب یا دنیا کے کسی اور خطے میں جس کو دولت کہا جاتا ہے، اس طرح کی دولت کا بنگلہ دیش میں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ کسی زمانے میں زمینداروں کا ایک طبقہ تھا جو بڑی حویلیوں میں رہتا تھا، مگر انہیں اعلیٰ معیارِ زندگی کا کوئی شعور نہیں تھا۔ اب تو یہ طبقہ بھی تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ یہ حویلیاں کیا تھیں؟ اینٹوں کی بے ترتیب بدنما دیواریں، بلا فرنیچر سجاوٹ، بنیادی سہولتوں سے محروم، حفظانِ صحت سے عاری! آخر کون سی آسائشیں تھیں جن کا انہوں نے اہتمام کر رکھا تھا؟ جب تک معیارِ زندگی کا جدید تصور سامنے نہیں آیا تھا، انہی بڑی حویلیوں کو اعلیٰ معیار کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

بنگال میں شاندار زندگی کا تصور کیا ہے؟ یہی کہ مٹی اور گھاس پھوس کا ایک مکان ہو، ارد گرد پھلوں کے چند درخت ہوں، قریب ایک چھوٹا سا تالاب ہو اور دو ڈھائی ایکڑ زمین ہو، جس سے گزر بسر کے لیے فصل مل جائے۔ ایک عام بنگالی کے ذہن میں کامیاب زندگی کا تصور کچھ یہ ہے کہ اسے اپنے کھیتوں سے اناج، تالاب سے مچھلی، درختوں سے پھل اور گھر کے مویشیوں سے دودھ حاصل ہو جائے۔ بہتر زندگی وہی تصور کی جاتی تھی جس میں کسی سے کچھ لینے دینے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو۔ زرعی معاشرے کی یہ سوچ اسی وقت کارگر ثابت ہوتی ہے جب کوئی معاشرہ خود کو باقی دنیا سے الگ تھلگ کر لے اور پھر کچھ لینے یا دینے پر یقین نہ رکھے۔ قرونِ وسطیٰ کے بنگالی ادب سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ "اعلیٰ معیار" کی یہ زندگی بھی محض چند ہی افراد کو میسر تھی۔ آبادی کا بڑا حصہ انتہائی افلاس زدہ تھا۔ بہت کم نرخوں پر بھی یہاں لوگ کھانے پینے کا سامان خریدنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ یہ افلاس ان کی زندگی میں کسی جدت اور مہم جوئی کے فقدان سے اور سنگین ہو گیا۔ یا شاید افلاس کی شدت کی وجہ سے وہ کچھ بھی نیا کرنے کا جذبہ اپنے اندر محسوس ہی نہیں کر پاتے تھے۔ انہیں کہیں اور پردیس میں جا کر قسمت آزمانے کا خیال سوجھتا ہی نہیں تھا۔ آبائی علاقوں سے چپٹے رہنا ان کی نظر میں حب الوطنی تھی۔

کہیں کہیں اور کبھی کبھی تو یہ حب الوطنی تمام منطقی حدود عبور کر جاتی تھی۔ بعض علاقوں کے لوگ بڑے دریا کو پار کرنا بھی معیوب اور منحوس سمجھتے تھے۔ پدما، برہم پترا اور میگھنا محض دریا نہ تھے۔ بلکہ حد بندی کا کام بھی کرتے تھے۔ ان دریاؤں کے درمیانی علاقوں میں لوگ اپنی اپنی آبادیوں تک محدود رہا کرتے تھے اور کنویں کے مینڈک بن گئے۔ ان کی سوچ اس قدر محدود ہوگئی تھی کہ وہ اپنے ہی خیالات کو معیار سمجھنے لگے اور پر تعیش زندگی سے متعلق اپنے ان تصورات کو قابل تقلید نظریات کا درجہ دینے لگے۔ بنکم چیٹرجی (Bankim Chatterjee)، رابندر ناتھ ٹیگور (Rabindranath Tagore) اور سرت چند چیٹرجی (Sarat Chand Chatterjee) کو بنگالی ادب کی تین اعلیٰ ترین شخصیات قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریروں سے کہیں بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ بنگال میں زندگی کا اعلیٰ معیار عام تھا یا علوم وفنون میں کوئی غیر معمولی ترقی کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ بنکم اور ٹیگور نے اعلیٰ طبقے کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ علاوہ ازیں ٹیگور نے اپنی خودنوشت میں جو کچھ لکھا وہ بھی ادبی لحاظ سے اعلیٰ معیار کا ہے۔ ان کے والد کی یادداشتیں بھی بنگال کے سماجی خدوخال پر ایک بہترین دستاویز کا درجہ رکھتی ہیں۔ ٹیگور کا تعلق ہندوؤں کی اعلیٰ ترین ذات سے تھا اور وہ زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بنکم چیٹرجی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ان دونوں عظیم ادیبوں نے دیہی معاشرے میں اعلیٰ معیار زندگی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ فیلڈنگ (Fielding) اور جین آسٹن (Jane Austen) کے بیان کردہ دیہی معاشرے کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اس لیے کہ مغرب کے دیہی معاشرے میں معیار بود و باش بہت بلند رہا ہے۔ ٹیگور نے اپنے گھر اور معاشرے کے ماحول کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور معیار زندگی کو بلند کرنے والی جن سہولتوں کا ذکر کیا ہے، ان کا موازنہ کسی طرح بھی اس سوسائٹی سے نہیں کیا جا سکتا جس کا نقشہ لیو ٹالسٹائی نے اپنے بچپن کے دیہی معاشرے کے لیے کھینچا ہے۔ ٹیگور اور ٹالسٹائی اپنے اپنے دیہی معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھتے تھے تاہم دونوں میں غیر معمولی فرق تھا۔ ٹیگور اپنے اعلیٰ معیار زندگی کی تہہ میں چھپے ہوئے افلاس کو پوشیدہ رکھنے میں ناکام رہے۔ ٹیگور کو جو خادم اور خادمائیں میسر تھیں، وہ حالات کے دباؤ کا نتیجہ تھیں۔ یہ ان غریبوں میں سے تھیں جو حالات کے جبر کے تحت نوکری کرتے تھے۔

انہیں عمدہ کھانا میسر تھا نہ اچھے کپڑے۔ موزوں لباس یا وردی کا تصور تو ایک طرف، خواتین کو تن ڈھانپنے کے نام پر بغیر سلے کپڑے کا بس ایک بڑا ٹکڑا دے دیا جاتا تھا۔ مردوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ان ادب پاروں میں قالین اور پردوں کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ البتہ چند دیہاتی برتنوں کا ذکر کچھ اس طرح ملتا ہے جیسے وہ اعلیٰ معیار زندگی کی کوئی بڑی علامت ہو۔

بنگال میں غربت اور خوش حالی میں فرق بس اتنا تھا کہ جو خوش حال تھے وہ دن میں تین وقت دودھ، چاول اور مچھلی پر مشتمل کھانے کا انتظام کر پاتے تھے۔ بنگال میں کھانا پکانے کو باضابطہ فن کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ میز بانی کا تصور یہ تھا کہ مہمان کو چاول اور دالیں دے دی جاتی تھیں جنہیں وہ خود پکا تا تھا۔ اگر مہمان راضی ہوتا تو دودھ سے بنی خام شکل کی مٹھائیاں بھی پیش کر دی جاتی تھیں۔

بنگال کے لوگوں کا مسلمانوں سے پہلی بار واسطہ تیرہویں صدی عیسوی میں پڑا جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا۔ بنگال کے رہنے والوں کی روایات اور مسلم فاتحین کی اقدار میں بہت واضح فرق تھا۔ مفتوح زمین کے لوگ اپنے ذات پات کے نظام اور ہزاروں سال پرانی دیگر روایات سے چمٹے رہے اور صدیوں تک حکومت کرنے والے فاتحین کی اقدار کو بہ آسانی قبول نہ کر سکے۔ جس طبقے نے مسلم فاتحین سے رابطے بڑھائے انہیں پتا چلا کہ کھانا پکانے کا فن کیا ہوتا ہے اور کھانے کے معمولات میں موزوں تبدیلی سے کس طرح زندگی کا معیار بلند کیا جاسکتا ہے۔ حکمراں طبقے سے انہوں نے پنیر اور آئس کریم بنانے کا فن سیکھا اور کھانے کا شعور پایا۔ ویسے بنگال کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی اکثریت سیکڑوں سال سے اپنے غیر مقدس، فرسودہ اور لاحاصل نظریات یا اقدار ہی کی نمائندگی کرتے چلے آئے ہیں۔

۱۹۷۱ء کی خانہ جنگی کے دوران امریکی پریس، بالخصوص ''ٹائم'' اور ''نیوز ویک'' جیسے جرائد نے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ پنجابیوں نے بنگالیوں پر اپنی ثقافت مسلط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر بنگالیوں سے مراد مسلم بنگالی ہیں تو یہ بات سراسر بے بنیاد ہے کیونکہ بنگال اور پاکستان کے دیگر علاقوں کی عمومی ثقافت میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔ جہاں تک بنگالیوں کی قدیم روایات اور ثقافتی اقدار کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایسا کچھ تھا ہی نہیں جسے خطہ وار اتی

ہوتا اور دفاع کی ضرورت پیش آتی۔ ایسا نہیں تھا کہ بنگالیوں کو کوئی نئی طرزِ زندگی اپنانے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی جانب سے اپنائی جانے والی صنعتی پالیسی کے نتیجے میں جدید ترین سہولتوں کے ساتھ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو بھی نئی زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ کچی مٹی سے لیپے ہوئے فرش کی جگہ ٹائلز نے لی۔ بانس اور گھاس پھوس کے بجائے سیمنٹ اور دیگر جدید تعمیراتی سامان کا استعمال عام ہوا۔ تنکوں کی چٹائی کی جگہ لکڑی اور دھات کی بنی ہوئی میز اور کرسیوں نے لی۔

سڑکوں کی تعمیر، مواصلات کے دیگر ذرائع کی ترقی، سرمایہ کاری اور صنعتی اداروں کے قیام نے زندگی کا ڈھانچا ہی بدل دیا تھا۔ پرانے اطوار کو اپنانے کا رجحان دم توڑ رہا تھا اور مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کی تنہائی ختم ہو رہی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو غیر ملکیوں سے رابطوں کا زیادہ موقع مل رہا تھا جن کے طور طریقے بہت مختلف تھے۔ لال منیر ہاٹ اور شائستہ نگر جیسے دور افتادہ مقامات پر ایئر پورٹس۔ چندرا گھونا میں پیپر مل اور کھلنا میں نیوز پرنٹ مل، صوبے بھر میں پٹ سن کی مختلف ملوں کے قیام اور ہری پور اور ٹیٹاز میں گیس کی دریافت سے ترقی کی نئی راہیں کھلیں اور تبدیلی کے عمل کی ابتدا بھی ہوئی۔

نئے معاشی مواقع پیدا ہونے سے معاشرے میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں تھیں اور بڑی تعداد میں غیر بنگالی مشرقی پاکستان میں آباد ہونے لگے تھے۔ ان کے طور طریقے مختلف تھے۔ جدید سہولتوں نے بہت سے پرانے اور روایتی طریقوں کو خیر باد کہنے کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ یہ تھیں وہ تبدیلیاں جن کے باعث بنگال میں طرزِ زندگی کو ''خطرہ'' لاحق تھا اور بنگالیوں کو طرح طرح کی تشویش میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔ ردعمل کے طور پر غیر بنگالیوں سے خوف کھانے کا رجحان پیدا ہوا۔ یہ دراصل بنگالیوں کا احساس کمتری تھا۔ غیر بنگالیوں کے خلاف نفرت پروان چڑھنے لگی۔ اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ مشرقی بنگال کو بڑے پیمانے پر سرمائے کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس اپنا سرمایہ نہیں تھا۔ غیر بنگالیوں کے پاس سرمایہ بھی تھا اور مہارت بھی۔ علاوہ ازیں ان کے خلاف نفرت میں اضافہ کیا جا رہا تھا اور لوگ انہیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے خلاف نفرت کو مزید پروان چڑھانے کے

لیے یہ جواز تراشا گیا کہ غیر بنگالی مشرقی بنگال کی معیشت کو سہارا نہیں دے رہے تھے بلکہ اس علاقے سے منافع بٹور رہے تھے۔ نفرت پھیلانے والوں کا دعویٰ تھا کہ ماضی میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب کسی بیرونی فرد کی ضرورت نہ تھی اور یہ خطہ غیر معمولی خوشحالی سے ہمکنار تھا اور یہ کہ غیر بنگالیوں یا غیر ملکیوں نے آکر مشرقی بنگال کی خوشحالی کو ختم کیا، اس کے وسائل لوٹے اور اسے غربت اور پس ماندگی کی دلدل میں دھکیل دیا۔ لوگوں کو رفتہ رفتہ یہ سوچنے اور سمجھنے کی تحریک دی گئی کہ ان کی سرزمین زرخیز ہے اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ اور یہ کہ اسے لوٹا گیا ہے۔ لوگوں کو جب بھی فرصت ملتی تھی وہ اپنی اصل مشکلات کے بارے میں دیگر زمینی حقائق کے حوالے سے بھی سوچا کرتے تھے مگر مجموعی طور پر انہیں اس قدر جذباتی کر دیا گیا کہ وہ اس تصور کو درست سمجھنے لگے کہ کبھی ان کی سرزمین خوشحال تھی اور اسے لوٹ کر ویران اور پس ماندہ بنا دیا گیا۔ ہندوستانیوں کی شہ پر سازشیں کرنے والوں نے لوگوں کو یہ باور کرا دیا کہ ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ بیرونی سرمائے کی آمد سے جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، ان کا بھی خوب فائدہ اٹھایا گیا۔

پاکستان کے خلاف تحریک جوں جوں زور پکڑتی گئی، بڑی عمر کے لوگ بھی پروپیگنڈے کا شکار ہوتے گئے جنہیں اچھی طرح یاد تھا کہ ۱۹۴۷ء سے قبل غیر منقسم بنگال میں انہیں کس طرح پس ماندگی کے جال میں جکڑ دیا گیا تھا۔ اور سونار بنگلہ کا راگ اس قدر الاپا گیا کہ عمر رسیدہ افراد کے حافظے کو بھی پروپیگنڈے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ پیچھے پلٹنے کے قائل نہ رہے۔ ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ ڈھاکا کے بنگلہ بازار میں کانگریس کے زیر سرپرستی چلنے والے ادارے کھادی پرتشٹھان کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا۔ اس جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری نے مشرقی پاکستان سے روا رکھی جانے والی زیادتیوں کا رونا رویا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ مشرقی پاکستان کی سرزمین کو یکسر بے جان کر دیا گیا ہے۔ دو سال بعد راج شاہی میں جماعت اسلامی کے ایک کارکن عبدالغنی کی زبان سے بھی میں نے یہی باتیں زیادہ پر جوش انداز سے سنیں۔ یہ بات مجھے بہت عجیب لگی کہ پاکستان کو ختم کرنے کے درپے اشتراکی عناصر اور شیخ مجیب الرحمٰن کی مخالفت میں کھڑے ہونے والے لوگوں کی زبان ایک

ہوتی جا رہی تھی۔ اسے پروپیگنڈے کی کامیابی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۰ء کے آتے آتے حالت یہ ہو چکی تھی کہ اگر کوئی شخص مشرقی پاکستان کے استحصال سے متعلق عوامی لیگ کے پروپیگنڈے میں کسی خامی کی نشاندہی کرتا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ عوامی لیگ کا فلسفہ قومی مفادات کے یکسر منافی ہے تو لوگ اسے غدار قرار دینے پر تُل جاتے تھے۔ تمام سیاسی جماعتیں شیخ مجیب الرحمٰن کی جانب سے خود مختاری کے مطالبے کی حمایت کے لیے میدان میں آ گئی تھیں۔ بیشتر سیاسی جماعتوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے ٦ نکات کی بھرپور حمایت کا اعلان کر دیا جبکہ حقیقت میں یہ نکات ملک سے علیحدگی کے پروگرام کے سوا کچھ نہیں تھے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے سیاسی قائدین کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ جو کچھ عوامی لیگ کہہ رہی ہے اور کر رہی ہے اس سے ملک تیزی سے عدم استحکام کی کھائی میں لڑھکتا جا رہا ہے، مگر کسی میں زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ اب عوامی لیگ کے منشور کے خلاف بولنا بنگالیوں کے مفاد کے خلاف بولنا تصور کیا جانے لگا تھا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ عوامی لیگ اپنے فلسفے اور پروپیگنڈے میں کس حد تک کامیاب رہی۔

صداقت عام طور پر سنی سنائی اور گھڑی ہوئی باتوں سے زیادہ عجیب ہوا کرتی ہے۔ مگر مشرقی پاکستان میں آئیڈیل ازم نے ہر سچائی کو گہنا دیا تھا۔ سازش، جہالت، خیالی باتیں، غیر ملکیوں کا خوف۔۔۔ ان تمام تصورات نے مل کر بوڑھوں اور جوانوں کو یکساں طور پر ایک ایسی فضا کے حوالے کر دیا تھا جس میں صرف یہ بات یاد رکھنے کے قابل سمجھی جا رہی تھی کہ کسی زمانے میں بنگال کی سرزمین سونار بنگلہ تھی، اس علاقے میں دودھ کی ندیاں بہا کرتی تھیں اور اس سرزمین پر بسنے والے مختلف علوم و فنون میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے اور کسی کو بھی مات دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اب دنیا بھر سے لوگ اس خطے میں وارد ہو کر اس کی خوشحالی کو لُوٹ کر لے جانے لگے تھے۔

پاکستان کے مشرقی بازو کے وزرائے اعلیٰ

صوبہ مشرقی بنگال	سیاسی وابستگی	عرصۂ اقتدار
خواجہ ناظم الدین	مسلم لیگ	۱۵/اکتوبر ۱۹۴۷ء۔۱۴/ستمبر ۱۹۴۸ء
نورالامین	مسلم لیگ	۱۴/ستمبر ۱۹۴۸ء۔۳/اپریل ۱۹۵۴ء
اے کے فضل الحق	متحدہ محاذ	۳/اپریل ۱۹۵۴ء۔۲۹مئی ۱۹۵۴ء
گورنر راج		۲۹مئی ۱۹۵۴ء۔اگست ۱۹۵۵ء
ابوحسین سرکار	کرشک سرامک پارٹی	اگست ۱۹۵۵ء۔۱۴/اکتوبر ۱۹۵۵ء

۱۵/اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ملک میں دو صوبوں کا نظام نافذ ہوا
مشرقی بازو ''صوبہ مشرقی بنگال'' کے بجائے ''صوبہ مشرقی پاکستان'' کہلایا

صوبہ مشرقی پاکستان	سیاسی وابستگی	عرصۂ اقتدار
ابوحسین سرکار	کرشک سرامک پارٹی	۱۵/اکتوبر ۱۹۵۵ء۔ستمبر ۱۹۵۶ء
عطاء الرحمٰن خان	عوامی لیگ	ستمبر ۱۹۵۶ء۔مارچ ۱۹۵۸ء
ابوحسین سرکار	کرشک سرامک پارٹی	مارچ ۱۹۵۸ء
عطاء الرحمٰن خان	عوامی لیگ	مارچ ۱۹۵۸ء۔۱۸/جون ۱۹۵۸ء
ابوحسین سرکار	کرشک سرامک پارٹی	۱۸/جون ۱۹۵۸ء۔۲۲جون ۱۹۵۸ء
گورنر راج		۲۲جون ۱۹۵۸ء۔۲۵/اگست ۱۹۵۸ء
عطاء الرحمٰن خان	عوامی لیگ	۲۵/اگست ۱۹۵۸ء۔۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء

۸/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صدر اسکندر مرزا اور پاک آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے مل کر پہلا ملک گیر مارشل لا نافذ کر دیا۔ صوبوں میں وزرائے اعلیٰ کے عہدے ختم کر دیے گئے۔ صوبائی گورنر ہی صوبائی انتظامیہ کے سربراہ بنا دیے گئے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی (۱۶/دسمبر ۱۹۷۱ء) تک صوبائی وزیر اعلیٰ کا عہدہ بحال نہیں ہوا۔ جبکہ نئے ملک بنگلہ دیش میں نہ صوبے بنے اور نہ وزرائے اعلیٰ۔ (ناشر)

گیارہواں باب

میرے آغاز میں میرا انجام پوشیدہ ہے!

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بارے میں جس قدر بھی غور کیجیے، ذہن اسی قدر الجھتا جاتا ہے۔ میں خانہ جنگی کے دوران رونما ہونے والے سفاک حالات کی بات نہیں کر رہا اور نہ یہاں فوجی حکمتِ عملی پر بحث مقصود ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کے ذہنوں سے پاکستان کی اہمیت کا تصور اس قدر تیزی سے کس طرح کھرچ کر پھینک دیا گیا۔ ہمارے لیے پاکستان ایک بنیادی ضرورت تھا، مگر حیرت اس امر پر ہوتی ہے کہ ہمیں اس بنیادی ضرورت کے احساس سے ہی غافل کر دیا گیا۔ عوامی لیگ پورے مشرقی پاکستان پر اثرات نہیں رکھتی تھی۔ مگر ۱۹۷۱ء کے حالات نے اسے ایسی پوزیشن کا حامل بنا دیا کہ کوئی اسے چیلنج کرنے والا نہ رہا۔ جو لوگ عوامی لیگ سے اختلاف رکھتے تھے، وہ بھی اپنے اندر اس اختلاف کو برملا ظاہر کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ عوامی لیگ کے بعض مخالفین نے صورتِ حال کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسا پینترا بدلا کہ وہ صوبائی مفادات کے تحفظ کا چمپئن بننے کے معاملے میں عوامی لیگ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلتے دکھائی دیے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں ڈھاکا کی سڑکوں پر نوجوان مارچ کرتے ہوئے یہ نعرہ لگاتے تھے کہ انہیں اسلام آباد کے شکنجے سے نکالا جائے! لوگوں کو کس طرح اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ان کی زندگی اور اس کے تمام معاملات اسلام آباد یعنی پاکستانی حکمرانوں کے شکنجے میں ہیں۔ ہوسکتا ہے لوگوں کو خود بھی معلوم نہ ہو کہ یہ احساس کیونکر پیدا ہوا۔ دوسری طرف سرحد پار بھارت میں باغیوں کی خوب حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی۔ انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ جابر پاکستانی حکمرانوں کے خلاف وہ جو کچھ بھی کریں گے، اس میں انہیں بھارتی حکومت اور میڈیا کی بھرپور حمایت حاصل رہے گی۔ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے ماضی میں ہندوؤں

کے ہاتھوں بہت سی مشکلات سہی تھیں، مگر سب کچھ بھول کر وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ آزاد بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہ بھارت کی مدد سے بھرپور ترقی کریں گے اور خوش حال زندگی بسر کریں گے۔ ہم جیسے لوگ، جو عوامی لیگ کے ساتھ نہ تھے، حالات کا رُخ دیکھ کر صرف حیران اور پریشان ہی ہو سکتے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے خطے (مشرقی پاکستان) نے جس سیاسی بے بصیرتی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی عصر حاضر کی تاریخ میں کوئی مثال ملتی ہے یا نہیں۔ ۱۹۰۵ء میں انگریزوں نے بنگال کو مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ تقسیم مسلمانوں کے مطالبے پر عمل میں آئی تھی۔ انگریزوں کے نزدیک اس فیصلے کی حیثیت انتظامی سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر انگریزوں نے ہندوؤں کے دباؤ میں آ کر ۱۹۱۱ء میں اس تقسیم کو منسوخ کر دیا تھا۔ مشرقی بنگال اور آسام کے علاقوں کو ملا کر جو انتظامی یونٹ تشکیل دیا گیا تھا، اس کی ترقی کے امکانات دیکھ کر ہندوؤں نے انگریزوں کو ورغلایا اور مغربی بنگال میں ممکنہ خرابی سے ڈرا کر انہیں یہ فیصلہ واپس لینے پر مجبور کیا۔ بنگال میں مشرقی اور مغربی کی تقسیم کوئی نئی بات نہیں۔ یہ طویل داستان ہے، اس کی ایک تاریخ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی دونوں خطوں میں بہت فرق ہے۔ مشرقی بنگال دریائی علاقہ ہے۔ یہاں موسم غیر معمولی طور پر مرطوب رہتا ہے اور ہر سال سیلاب اور سمندری طوفان سے تباہی مچتی رہتی ہے۔ دوسری جانب مغربی بنگال میں موسم خشک اور غیر مرطوب رہتا ہے۔ شہری آبادی زیادہ ہے۔ صنعتی ڈھانچا مضبوط ہے۔ انگریزوں نے جب مغلوں کو شکست دی تو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے انہوں نے کلکتہ کو دارالحکومت بنایا۔ ہندو اور انگریز دونوں ہی مسلمانوں سے مخاصمت رکھتے تھے۔ اس لیے وہ ایک ہو گئے اور کلکتہ کے ہندوؤں نے انگریز حکومت کے ایوانوں میں گہرا اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ ہندوؤں نے کلکتہ میں دارالحکومت ہونے کا خوب فائدہ اٹھایا۔ مغربی بنگال میں صنعتوں کا جال بچھا دیا گیا اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے بھی اسی علاقے میں قائم کیے گئے۔

انگریزوں نے ۱۹۱۱ میں بنگال کی انتظامی تقسیم ختم تو کر دی، مگر انہوں نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ وہ ڈھاکا میں یونیورسٹی تعمیر کر دیں گے۔ ہندوؤں سے یہ بھی برداشت نہ ہوا۔ انہوں

نے انگریزوں کو ورغلانا شروع کر دیا کہ ڈھاکا میں یونیورسٹی کے قیام سے کلکتہ میں یونیورسٹی کی تعلیم اور آمدنی متاثر ہوگی۔ کانگریس کے ایک وفد نے اس سلسلے میں وائسرائے سے ملاقات کی اور انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ ڈھاکا میں یونیورسٹی کا قیام کوئی منفعت بخش فیصلہ نہ ہوگا، کیونکہ وہ ایک پسماندہ علاقہ ہے اور جہاں یونیورسٹی قائم کی جارہی ہے وہاں ناخواندہ لوگ رہتے ہیں۔ ہندو مسلم تاریخ اور دوطرفہ کشیدگی کے پیش نظر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو کن حالات کا سامنا تھا۔ ہندوؤں نے ایک طرف تو مشرقی اور مغربی بنگال کی تقسیم ختم کروا کر مسلمانوں کو پہنچ سکنے والے ممکنہ فوائد سے محروم کروا دیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو تعلیم سے دور رکھنے کی سازش بھی جاری رکھی!

ڈھاکا یونیورسٹی ۱۹۲۱ء میں قائم ہوئی۔ ہندوؤں نے حسد کے مارے اسے مکہ یونیورسٹی قرار دیا کیونکہ اس میں مسلمانوں کے لیے بنگالی اور انگریزی کے علاوہ عربی اور فارسی سکھانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ابتدا میں عملے کے بیشتر ارکان ہندو تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے شعبوں کے علاوہ دیگر شعبوں میں بڑے لمبے عرصے تک صرف چار یا پانچ ہی مسلم اساتذہ تھے۔ بنگالی میں ڈاکٹر شہید اللہ، تاریخ میں اے ایف رحمٰن، انگریزی میں ایم حسن اور ریاضی میں قاضی مطاہر حسین تھے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے قیام کے سترہ سال بعد ۱۹۳۸ء میں جب ہم نے یونیورسٹی میں قدم رکھا، اس وقت بھی صورتحال زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس وقت ڈاکٹر شہید اللہ تو تھے، مگر اے ایف رحمٰن ریٹائر ہو کر جا چکے تھے اور ان کی جگہ محمود حسین آئے تھے۔ انگریزی میں ایک نوجوان جلال الدین احمد کو کلاس ٹو کا لیکچرر مقرر کیا گیا تھا۔ معاشیات میں مظہر الحق تھے اور سیاسیات میں عبدالرزاق نئے بھرتی ہونے والے اساتذہ میں سے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ڈھاکا یونیورسٹی میں تاریخ کے شعبے سے چند ماہ کے لیے وابستگی اختیار کی اور پھر مستعفی ہو کر چلے گئے۔ شعبۂ سائنس میں قاضی مطاہر حسین واحد مسلم لیکچرر تھے جنہیں کلاس ٹو کا گریڈ دیا گیا تھا۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں مسلم اساتذہ کی شدید قلت تھی اور یہ کسی سازش کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ حقیقتاً مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خال خال تھے۔ خالی اسامیوں پر بھرتی کے لیے لوگ نہیں ملتے تھے۔ جبکہ ہندو امیدوار بہتر قابلیت کے حامل ہوتے

تھے اور ان میں نظم وضبط بھی ہوتا تھا۔ تعلیم وتعلم کے معاملے میں ان کا رویہ خالص پیشہ ورانہ تھا۔ یونیورسٹی کی گورننگ باڈی، جسے ایگزیکٹو کونسل کہا جاتا تھا، کے مسلم ارکان کو جلال الدین احمد کے تقرر کے لیے بہت زور لگانا پڑا تھا، کیونکہ ان کے پاس سیکنڈ کلاس ڈگری تھی۔ عبدالرزاق ہندو اور مسلمان، دونوں ہی کے لیے دردِ سر تھے۔ ان کے اطوار غیر روایتی تھے اور ان میں نظم وضبط کا بھی فقدان تھا۔ فرائض سے غفلت برتنا ان کی عادت تھی۔ وہ ہندوؤں کی تنقید کا نشانہ بنتے تھے اور مسلمانوں کو ان کے حوالے سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مظہرالحق نے کئی مواقع پر یونیورسٹی کے تسلیم شدہ قواعد کو ماننے سے انکار کیا۔ ان کا گورننگ باڈی سے بار بار تنازع کھڑا رہتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ڈھاکا یونیورسٹی میں کسی مسلم کلرک کے تقرر کو بھی مسلمان اپنی بڑی کامیابی تصور کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ڈھاکا یونیورسٹی ایک چھوٹا سا ادارہ تھی۔ طلبا کی تعداد ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ تین ہاسٹلوں میں سے ایک رہائشی ہال مسلمانوں کے لیے مختص تھا اور دوسرا ہندوؤں کے لیے۔ تیسرا ہال کسی کے لیے مختص تو نہ تھا، تاہم اس میں ہندو زیادہ تھے۔ مسلمانوں کے لیے سلیم اللہ ہال اور ہندوؤں کے لیے جگن ناتھ ہال مختص تھا۔ کاسموپولیٹن ہال کا نام ڈھاکا ہال پڑ گیا تھا، جسے بعد میں ڈاکٹر شہید اللہ سے موسوم کر دیا گیا۔

۱۹۴۰ء کے بعد مسلم طلبا کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اب ان کے لیے ایک اور ہال مختص کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ جب یہ معاملہ صوبائی کابینہ میں منظوری کے لیے پیش ہوا تو وزیرِ خزانہ نالنی رنجن سین نے اس مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ایک اور کاسموپولیٹن ہال بنایا جائے۔ جبکہ خواجہ ناظم الدین نے ہال کو مسلمانوں کے لیے مختص کرنے پر زور دیا۔ بہرحال یونیورسٹی کی عمارت میں پہلی منزل پر ایک ہال کو عارضی طور پر خالی کر کے، اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ اے کے فضل الحق کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ جسے بعد میں مستقل ہال کے طور پر موجودہ نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کے آغاز تک کا زمانہ داخلی اور خارجی اعتبار سے شدید مشکلات سے پُر تھا۔ ہندوستان کے بڑے حصے پر کانگریس کی حکومت تھی اور اس کے اندازِ حکمرانی نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے سیاسی طور پر ساتھ رہنا کسی

طور ممکن نہیں۔ مسلمانوں کو بار بار باور کرایا جا رہا تھا کہ انگریز کے جانے کے بعد اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو انہیں اپنی جداگانہ تہذیبی شناخت ختم کرنا پڑے گی۔ مسلمانوں کی بنیادی زبان اردو خطرے میں تھی۔ مسلمانوں کے لیے آزادانہ طریقے سے عبادت ناممکن بنادی گئی تھی۔ ودیا مندر ایجوکیشن اسکیم کے تحت مسلم طلبا کو ہندو بنانے کی سازش کی گئی۔ ان تمام مسائل کا حل کیا تھا؟ چند آئینی اصلاحات؟ کوئی اس بات پر کس طرح یقین کر سکتا تھا کہ اقتدار پر مکمل قابض ہونے کے بعد کانگریس مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرے گی، جبکہ فوج پر بھی اُسی کا کنٹرول تھا؟ یہ وہ پس منظر تھا جس میں علیحدگی کی بات کی جانے لگی تھی، مگر ہمیں خود بھی اندازہ نہ تھا کہ آگے چل کر یہ مطالبہ کیا شکل اختیار کرلے گا۔

بین الاقوامی سطح پر یہ وہ دور تھا جب جرمنی میں ہٹلر کا عروج، اسپین میں خانہ جنگی اور وسطی یورپ کا سیاسی و سفارتی بحران دنیا کو ایک بار پھر بھرپور تصادم کی طرف دھکیل رہا تھا۔ ہٹلر کی جانب سے معاہدوں کا عدم احترام، جرمنی کو دوبارہ مسلح کرنا، یہودیوں کو مظالم کا نشانہ بنانا اور نسل پرستی سے متعلق نت نئے نظریات کا پرچار تہذیب اور شائستگی کے لیے، سولہویں صدی کے بعد شاید سب سے بڑا دھچکا تھا۔ اٹلی نے ابی سینا (موجودہ ایتھوپیا اور قرب و جوار) پر لشکر کشی کر کے ثابت کر دیا تھا کہ لیگ آف نیشنز کسی کام کی نہیں اور یہ بین الاقوامی تنازعات روکنے یا ختم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اٹلی کے مسولینی کے مقابلے میں جرمن ایڈولف ہٹلر لیگ آف نیشنز کے لیے زیادہ تیزی سے موت کا باعث بن رہا تھا۔

مشرق بعید کی صورت حال بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ جاپان نے چین کے خلاف جارحیت جاری رکھی ہوئی تھی۔ وہ پورے مشرقی ایشیا پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا۔ جاپانی استعماریت بین الاقوامی سطح پر خرابی پیدا کر رہی تھی۔ ہم اس زمانے میں طالب علم تھے۔ ہمیں جس قدر یورپ کے بارے میں معلوم تھا، اتنا مشرق بعید کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ اخبارات میں بھی یورپ میں ہونے والے واقعات کو زیادہ اور نمایاں طور پر پیش کیا جاتا تھا۔

ہمارے لیے خبروں کا ایک بڑا ذریعہ کلکتہ سے شائع ہونے والا اخبار ''دی اسٹیٹس مین'' (The Statesman) تھا۔ یہ ''ٹائمز آف لندن'' کی طرز پر شائع ہوتا تھا۔ اس کے ادارتی عملے

میں یورپی باشندے شامل تھے۔ اس لیے اس کا معیار بھارت کے دیگر انگریزی اخبارات سے خاصا بہتر تھا۔ مسلمانوں کے قابل ذکر اخبارات برائے نام ہی تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے ۱۹۳۰ء کی دہائی کے اواخر میں ''دی اسٹار آف انڈیا'' کے نام سے شام کو چھپنے والا ایک روزنامہ جاری کیا تھا۔ لیکن اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے کوئی بھی تعلیم یافتہ مسلمان نہ مل سکا تھا۔ تب ہی جنوبی ہندوستان کے ایک عیسائی پوتھن جوزف کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ بنگالی زبان میں مولانا اکرم خان کا اخبار ''آزاد'' ۱۹۳۶ء سے مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہا تھا۔ اس کی سرکولیشن محدود تھی اور اس میں بین الاقوامی خبروں کی اشاعت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ''دی آنند بازار پتریکا''، ''دی امرت بازار پتریکا''، ''فارورڈ''، ''جگانتر'' اور دیگر ہندو روزنامے دن رات مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو دی جانے والی معمولی سی رعایت بھی ان اخبارات سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ اس پر تنقید کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ اگر اسٹیبلشمنٹ میں مسلمانوں کو کوئی بڑا منصب مل جاتا تھا تو اس کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا جاتا تھا اور اسے فرقہ واریت اور اقرباپروری کا نام دے دیا جاتا تھا۔ وزیر اعلیٰ اے کے فضل الحق بیوروکریسی اور حکومتی مشینری کے کل پرزوں میں ہندو مسلم توازن برقرار رکھنے کے لیے چند مسلمانوں کو بطور کلرک بھی بھرتی کر لیتے تھے تو انہیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

بنگال میں ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے بعد مسلم لیگ کی وزارت نے حالات کچھ بہتر بنائے۔ ورنہ اس سے پہلے تو مسلمانوں کو سرکاری ملازمت کے حصول میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مسلم گریجویٹ بے روزگار رہا کرتے تھے۔ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ایک مسلم نوجوان، میرے عزیز، خان بہادر ایم اے مومن سے ملنے آیا، جو ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اعلیٰ حلقوں میں ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اُس نوجوان نے بتایا کہ فرسٹ کلاس ڈگری حاصل کرنے کے باوجود اسے ملازمت نہیں ملی۔ وہ اس بات پر تاسف کا اظہار کر رہا تھا کہ اس نے تعلیم پر خواہ مخواہ وقت اور وسائل ضائع کیے۔

سیاسی اعتبار سے بھی معاملات مایوس کن تھے۔ ہندو بہت اچھی سیاسی پوزیشن میں تھے اور وہ مسلمانوں کو اس میں کوئی حصہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو صوبائی

مقننہ میں اقلیت کی حیثیت سے رہنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ رمزے میکڈونلڈ (Ramsay Macdonald) نے جس کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا تھا، رابندر ناتھ ٹیگور جیسی بلند پایہ ہستی نے بھی اس کی مذمت کی تھی۔ کمیونل ایوارڈ کا بنیادی مقصد بنگال میں اقلیتوں کو بھی سیاسی امور میں آواز اٹھانے کا موقع دینا تھا۔ کانگریس نے اس ایوارڈ کو انگریزوں کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے اصول کا حصہ گردانا۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو اس بات پر زیادہ غصہ تھا کہ نچلی ذات کے ہندوؤں کو بھی ووٹ ڈالنے اور صوبائی مقننہ میں اپنے نمائندے بھیجنے کا اختیار دے دیا گیا تھا۔

۱۹۴۰ء کے عشرے سے کچھ قبل میری اپنی سوچ یہ تھی کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ نمائندگی کا حق یا متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے کوئی آئینی فریم ورک کسی کام کا نہ تھا۔ میں نے اس زمانے میں علیحدگی کے بارے میں سوچنا شروع نہیں کیا تھا، اور نہ مسلم لیگ کی جانب سے الگ وطن کے قیام کا مطالبے کی حمایت شروع کی تھی۔ محمد علی جناح کی شخصیت بھی ہمارے لیے خاصی متاثر کن تھی۔ تاہم آزادی یا علیحدگی کے حوالے سے ہمارے ذہنوں میں بہت سی الجھنیں تھیں اور ہم اس بارے میں ابہام کا شکار تھے۔ مسلمانوں کی علیحدہ شناخت کے حوالے سے پنڈت جواہر لعل نہرو سے محمد علی جناح کی بحث نے ہم میں خاصا ولولہ پیدا کیا تھا۔ نہرو کا موقف تھا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہیں۔ کانگریس اور انگریز۔ محمد علی جناح نے جواب میں کہا کہ فریق تو چار ہیں۔۔ انگریز، ہندو، مسلمان اور آزاد ریاستیں (رجواڑے)۔ پریس میں مسلم اور ہندو حقوق کے حوالے سے گرما گرم بحث ہمارے لیے غیر معمولی دلچسپی کا سامان تھی۔ اُس وقت میں خاصا الجھا ہوا تھا کیونکہ کوئی حتمی حل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری ذہنی الجھن اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک مرحلے پر میں اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ اگر ہم مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان میں رہنا ہے تو ہمیں علیحدہ ثقافتی اور مذہبی شناخت کا تصور ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ انہی دنوں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کی بات کی جانے لگی۔ اس مطالبے نے مجھ میں عجیب جوش و خروش بھر دیا۔ انہی دنوں روزنامہ دی اسٹیٹسمین میں ایک تجزیہ کار الکھ دھاری نے لکھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ ناقابلِ قبول ہے، کیونکہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان اس قدر یکجان ہو چکے ہیں کہ انہیں کسی معمے (Puzzle)

کے حصوں کی طرح تقسیم کیے بغیر الگ کرنا ممکن نہیں۔ میں نے ''دی اسٹیٹس مین'' کے ایڈیٹر کو ایک خط لکھا، جس میں بتایا کہ الکھ دھاری کا تجزیہ کیوں غلط ہے اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیوں درست ہے۔ میں نے اس وقت تک یونیورسٹی کی پہلی ڈگری بھی حاصل نہیں کی تھی۔ میرے لیے یہ احساس ہی غیر معمولی مسرت کا مآخذ تھا کہ میں مسلمانوں کی ترجمانی کا حق ادا کر رہا تھا۔ اس خط کی کاپی میں نے سنبھال کر رکھی تھی جو ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں کی نذر ہوگئی۔ میں نے اس خط میں کشمیر اور حیدر آباد کے علاوہ مسلمانوں کی علیحدہ ریاست میں مسلم اکثریت کے حامل بھوپال، یوپی اور سی پی کے علاقوں کو بھی شامل کرنے کی بات کہی تھی۔ مجھے اس خط کی تاریخ تو اچھی طرح یاد نہیں تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے ذہن میں یہ واضح نہیں تھا کہ ہندوستان سے الگ ہونے کی صورت میں مسلمان آزاد ریاست یا ریاستوں کی حیثیت سے اپنے آپ کو کس طرح منظم کریں گے، زندگی کس طور بسر کریں گے۔ میں اور میرے ساتھی یہ سوچتے تھے کہ ہندوستان سے الگ ہونے والے مسلم اکثریتی علاقے آزاد ریاستوں کی حیثیت سے قائم بھی رہ پائیں گے یا نہیں۔ کیونکہ یہ بھی واضح نہیں تھا کہ وہ آپس میں اتحاد قائم کریں گے یا نہیں۔ جیسے ہی علیحدگی کی بات کھل کر کہی جانے لگی، ہم نے سکون کا سانس لیا کہ ہندوستانی سیاست کی پیچیدگیوں سے نجات کی یہی ایک صورت ہے۔

۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہونا تھا جو چیئرمین بھٹو کے مطالبے پر ملتوی کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں شدید ردعمل ہوا۔ اسی مہینے صدر جنرل یحییٰ خان اور چیئرمین بھٹو ڈھاکہ پہنچے اور شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات شروع ہوئے۔ مذاکرات ناکام ہونے پر ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان میں آرمی آپریشن شروع ہوا۔ فوجی کارروائی سے پہلے ڈھاکہ سے کراچی پہنچنے والی پی آئی اے کی آخری فلائٹ سے چیئرمین بھٹو بھی کراچی واپس پہنچے۔ کراچی ایئرپورٹ پر جناب بھٹو نے بیان دیا ''خدا کا شکر ہے، پاکستان بچ گیا''۔

بارھواں باب

تقسیمِ ہند کا نظریہ

تقسیم ہند مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے نظریے کی ایک ایسی جامع اور واضح تعریف تھی جس میں تمام بنیادی حقائق کا احاطہ کیا گیا تھا۔ مسٹر جناح نے کہا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان مذہب، تاریخ، ثقافت، رہن سہن، فنون لطیفہ، فن تعمیر، قوانین، روایات اور اقدار کے اعتبار سے ہندوؤں سے یکسر مختلف ہیں اور علیحدہ اور آزاد وطن کا اتنا ہی استحقاق رکھتے ہیں جتنا کوئی اور قوم۔ یہ ایک ایسی جامع تعریف تھی جس کے سامنے آنے کے بعد کسی کے ذہن میں مسلمانوں کی علیحدہ شناخت کے حوالے سے کوئی شک باقی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ مجھے ان کا بیان لفظ بہ لفظ تو یاد نہیں مگر ہاں ان کا ٹھوس لہجہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی علیحدہ شناخت کی اس تعریف نے کئی مقاصد کے حصول کی راہ ہموار کی۔ اب تک ہم ہندوستانی مسلمان آئیں بائیں شائیں کر رہے تھے لیکن اب موقع تھا کہ ہم درپیش مسائل کا از سرِ نو جائزہ لیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کا سامنا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی۔ اُن سے پچھتر سال قبل سر سید احمد خان بھی یہی بات کہہ رہے تھے، بس انداز ذرا مختلف تھا۔ ہندو مفکرین اور مصنفین بھی اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان فکری، ثقافتی اور معاشرتی اعتبار سے الگ اقوام ہیں۔ یہ بات انہوں نے جگہ جگہ کھل کر کہی ہے۔ بنگالی ناول نگار بنکم چندر چٹرجی اور بنگال ہی کے مؤرخ آرسی مُجمدار کی تحریریں اس کو بھرپور طریقہ سے ثابت کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں یہ بات زور دے کر بیان کی گئی تھی کہ ہندو اور مسلم الگ اقوام ہیں اور ان کا ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔ ایک ہزار سال قبل مسلم مؤرخ ابوریحان البیرونی نے بھی یہی بات کہی تھی۔

علمی گفتگوؤں میں بھی ہندو دانشور اس حقیقت سے انکار نہیں کر پاتے تھے کہ مسلمان ایک

الگ قوم ہیں جن کی اپنی ثقافتی اور مذہبی شناخت ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ جن علاقوں (مثلاً یوپی اور بنگال) میں مسلمان اور ہندو ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے اور ایک ہی زبان بولتے ہیں ان میں بھی خوراک، لباس، قواعد وضوابط، رسوم وروایات اور اخلاقی اقدار میں اتنا واضح فرق ہے کہ یہ کہنا کہ ہندو اور مسلمان مل کر رہ سکتے ہیں، بجائے خود ایک عجیب بات لگتی ہے۔ یورپ کے لوگ بھی مذہب کے حوالے سے ہندوستان کے مزاج کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی کہ گائے کا گوشت کھانے سے فساد کیوں برپا ہوجاتا ہے۔ ذات پات کا نظام بھی ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ کسی انسان کے چھو لینے سے کوئی دوسرا کیونکر آلودہ ہوسکتا ہے! انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ غیر ملکیوں کو دیکھ کر یا ان کی آمد کے بارے میں سوچ کر لاحق ہونے والا خوف کیا ہوتا ہے۔

گوکہ ہندو اسکالرز اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بود وباش میں فرق بہت ہے اور ان کا ساتھ رہنا مشکل ہے مگر المیہ یہ تھا کہ وہ ان تمام حقائق کو سمجھنے کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی سیاسی اور معاشرتی شکنجے میں کس دینا چاہتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سیاسی اعتبار سے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں البتہ، ثقافتی امور میں وہ دونوں کا علیحدہ وجود تسلیم کرتے تھے۔ مستقبل کے آزاد ہندوستان میں ہندو ایک ایسا سیاسی اور معاشرتی ڈھانچا بنانا چاہتے تھے جس میں سے ہر غیر ہندو عنصر کو نکال دیا گیا ہو۔ اردو ہی کو لے لیجیے۔ یہ ہندو مسلم ثقافتی یکجہتی کی علامت ہونے کے باوجود ان کے لیے نا قابل قبول تھی۔ وہ مُصر تھے کہ دیوناگری رسم الخط میں ہندی ہی کو پورے ہندوستان کی مشترکہ زبان ہونا چاہیے۔ نہرو اور سپرو جیسے لیڈروں نے بھی، جن کی اپنی مادری زبان اردو تھی، ہندو انتہا پسندی کے آگے سر جھکا دیا۔ گاندھی نے ایک الگ ہی بات کہہ دی۔ انہوں نے ہندی کو ہندوستانی کا نام دے کر تجویز کیا کہ اسے اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھا جائے۔ یہ ایک منافقانہ اور ناقابل عمل تجویز تھی۔ سوال یہ تھا کہ ایک ایسی زبان جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں سے ہندوستان ہی میں جنم لیا ہو اور جس کا ذخیرۂ الفاظ فارسی، عربی اور سنسکرت پر مشتمل ہو، کیا اسے بھی ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں ہونا چاہیے۔ ہندوؤں کا جواب ہمیشہ نفی

میں ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ کانگریس آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی ثقافتی شناخت کو برقرار رکھنے کی کوئی ضمانت دینے کو تیار نہیں تھی۔

ہندو شاید یہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ مسلمانوں کی ثقافتی شناخت باقی رہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اور تیج بہادر سپرو جیسے لبرل ہندو بھی آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی ثقافتی اور تہذیبی بقا کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھے تو پھر عام ہندوؤں سے (جو نہ ایسے تعلیم یافتہ تھے اور نہ لبرل) یہ توقع کیسے رکھی جاسکتی تھی کہ وہ مسلمانوں کی بات سنیں گے؟

یہ وہ مجموعی ماحول تھا جس میں ہم سب رفتہ رفتہ ہندوستان سے علیحدگی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مسلم لیگ شمع تھی اور ہم پروانے۔ مسلم اقلیتی علاقوں سے آنے والی ہر خبر سے علیحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ اور زور پکڑ جاتا۔ یہ دعویٰ البتہ نہیں کیا جاسکتا کہ سب کچھ مکمل اتفاق رائے سے ہوا تھا۔ ہندوستان میں ایسی سیاسی اور مذہبی جماعتیں بھی تھیں جو مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے قیام کے مطالبے کو درست نہیں سمجھتی تھیں۔ ان کے نزدیک علیحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ غلط ہی نہیں، خطرناک بھی تھا۔ مگر جب کانگریس کے تحت قائم ہونے والی حکومت نے مسلمانوں پر مظالم ڈھائے اور انہیں بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھنے کی کوشش کی تو قیام پاکستان کے مخالفین کی آواز دب سی گئی۔ ان کے دلائل دم توڑ گئے۔ نام نہاد مسلم قوم پرستوں کے علاوہ چند جماعتیں اور بھی تھیں جو آخر تک پاکستان اور دو قومی نظریے کو غلط قرار دیتی رہیں۔ ان میں جمعیت علمائے ہند نمایاں تھی۔

دوسری جنگ عظیم میں شدت پیدا ہونے سے فریقین کے مفادات داؤ پر لگ گئے۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان میں بھی غیر معمولی سیاسی تبدیلیوں کی راہ ہموار ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں کانگریس نے ہندوستان کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس کا موقف تھا کہ اس اقدام کے لیے اُس سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد کانگریس نے ۱۹۴۲ء تک ''انتظار کرو اور دیکھو'' کی پالیسی اختیار کی۔ جب جاپان جنگ میں کودا اور اتحادیوں کے لیے حقیقی مسائل پیدا ہوئے اور ان کی شکست واضح دکھائی دینے لگی تب گاندھی جی نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ لگایا اور ''ہندوستان چھوڑ و'' (Quit India) تحریک شروع کی۔

ایک قوم پرست لیڈر کی حیثیت سے گاندھی جی کا یہ فیصلہ درست ہو سکتا تھا مگر اخلاقی سطح پر یہ بڑی گھٹیا بات تھی۔ میرے لیے یہ منافقت تھی اور ناقابل برداشت! ۱۹۳۹ء سے گاندھی جی یہ کہتے چلے آئے تھے کہ جمہوری اداروں کو کسی بھی طرح داؤ پر نہیں لگنا چاہیے۔ انہوں نے برطانوی پارلیمنٹ جیسے اداروں پر جرمن حملوں کی مذمت بھی کی تھی۔ وہ سیاسی حالات کو بلیک میلنگ کے لیے استعمال کرنے کے بھی خلاف تھے۔ مگر اب وہ خود برطانوی حکومت کو بلیک میل کرنے پر اتر آئے تھے۔ کیا ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک بنیادی طور پر بلیک میلنگ کے لیے نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں سبھاش چندر بوس نے جنگ میں محوری قوتوں (جاپان، اٹلی اور جرمنی) کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور ہندوستانی قیدیوں پر مشتمل آرمی بھی تیار کی۔ وہ کم از کم اپنے عہد میں تو کھرے تھے۔ سبھاش چندر بوس نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا تھا کہ برطانیہ کی سیاسی مشکلات سے فائدہ اٹھایا جائے مگر گاندھی جی اس معاملے میں منافقانہ رویہ اپناتے رہے تھے۔

''ہندوستان چھوڑو'' تحریک نے طلبا کو بھی ایک واضح سمت دی۔ ہندو طلبا نے کوشش کی کہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ملک بھر میں کلاسوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ہم مسلمان چاہتے تھے کہ ہندوؤں سے الگ دکھائی دیں۔ ہمیں یہ بھی اندازہ تھا کہ تدریسی عمل کے بائیکاٹ سے خود مسلمانوں کے لیے مشکلات بڑھ جائیں گی۔ ہم نے تدریسی عمل کا بائیکاٹ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسلم طلبا کلاسوں میں حاضر ہوتے رہے۔ ہندو اساتذہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہم پر بائیکاٹ میں شرکت کے لیے دباؤ ڈالتے۔ وہ خاصے تذبذب کے ساتھ کلاس لینے آتے تھے۔

''ہندوستان چھوڑو'' تحریک ہی کے زمانے میں نواکھالی کے نذیر احمد نے مسلم طلبا کی مدد سے پندرہ روزہ ''پاکستان'' جاری کیا۔ بنگالی زبان کے اس اخبار میں وہ سب کچھ تھا جو تحریک پاکستان کے لیے ناگزیر تھا۔ وسائل کم تھے مگر ہم اس کمی کو جوش اور ولولے سے پورا کر رہے تھے۔ ہماری آنکھوں میں بلند خواب تھے۔ معاشیات کے لیکچرر مظہر الحق کو ہم نے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے پر آمادہ کر لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کس مرحلے پر اس اخبار میں شامل ہوا تاہم یہ ایک خوشگوار حقیقت ہے کہ میں نے بہت جلد اس اخبار کے مرکزی مقالہ نگار کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب مجھ سے اداریے بھی لکھوائے جانے لگے تھے۔ نذیر احمد کو میرا ذاتیات سے

مبرّا انداز بہت پسند آیا تھا۔ جسیم الدین نے کئی نظمیں ارسال کیں۔ ان کی نظموں میں خاصا جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ علی احسن بھی ہمارے لیے لکھتے رہے۔ ہم نے مسلم مصنفین پر زور دیا کہ وہ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ لکھیں تاکہ جوش وخروش برقرار رکھا جاسکے۔ شعبۂ سیاست کے عبدالرزاق کو لکھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے دو تین مضامین لکھ ہی دیے۔ یہ اخبار تین چار سال چلا۔ علی احسن لکھتے تو تھے مگر سیاست پر لکھنے کے لیے جو منظم انداز درکار تھا وہ ان میں نہیں تھا۔ مگر خیر، ان کے جذبے سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔

نذیر احمد نے قلمی نام سے خوب طنزیہ مضامین لکھے۔ لکھنے کا زیادہ بوجھ مظہر الحق اور مجھ پر تھا۔ انگریزی صحافت کے حوالے سے میرا تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ مگر ''پاکستان'' کے لیے لکھنے میں بہت فرق تھا۔ سیاسی امور پر لکھنے کے لیے پڑھنا بھی پڑھتا ہے۔ اور سیاسی تجزیے میں تجاویز کا شامل ہونا بھی شرط ہے۔ ہم جو کچھ بھی لکھتے تھے وہ ہمارے جذبات کی تشفی کے لیے کافی تھا۔ کسی بھی عظیم مقصد کے لیے لکھتے ہوئے انانیت کا خوف دامن گیر نہیں ہوتا اور بے لوث ہو کر کام کرنے کا اپنا ہی لطف تھا۔

ہم سب نے مل کر ڈھاکا میں ''ایسٹ پاکستان لٹریری سوسائٹی'' قائم کی۔ اس سے قبل کلکتہ میں ''ایسٹ پاکستان رینا ساں سوسائٹی'' قائم کی جاچکی تھی۔ ''آزاد'' کے ایڈیٹر ابوالکلام شمس الدین اس کے صدر تھے۔ ان دونوں تنظیموں کا مقصد ایک تھا یعنی بنگال کے مسلمان مصنفین میں لکھنے کا جذبہ اجاگر کرنا اور انہیں اپنی جداگانہ شناخت کے تحت لکھنے کی تحریک دینا۔ ہم نے اپنا الگ ادارہ اس لیے قائم کیا کہ ہم اپنے آپ کو کلکتہ کی شاخ کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے، مگر یہ کوئی انا کا تصادم نہیں تھا۔ دونوں اداروں میں مختلف سطحوں پر تعاون جاری رہتا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ بنگال کے مسلمان مصنفین ہندوؤں کی نقالی نہ کریں بلکہ اپنا الگ انداز پروان چڑھائیں۔ بنگالی زبان تو ہندو اور مسلمان دونوں بولتے تھے مگر اس میں ایک واضح فرق تھا۔ ہندو اپنے مخصوص مذہبی پس منظر کے تحت خاصے جوش وجذبے سے لکھتے تھے۔ ہندو ادیبوں نے صدیوں میں جو کچھ بنگالی مسلمانوں کے ذہنوں پر مسلط کیا تھا، ہم اس کے اثرات زائل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور ہم نے اپنے منشور میں بھی اس مقصد کو کھل کر بیان کردیا تھا۔

جنوری ۱۹۴۳ء میں ہم نے ڈھاکا یونیورسٹی کے سلیم اللہ ہال میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا جو بہت کامیاب رہی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے دور دور سے طلبہ اور عوام آئے۔ یہاں تک کہ میمن سنگھ جیسے دور افتادہ علاقوں کی بھی نمائندگی موجود تھی۔ کانفرنس کی صدارت ''آزاد'' کے ایڈیٹر ابوالکلام شمس الدین نے کی۔ اس ادبی اجتماع میں جو کچھ بیان کیا گیا اس سے ہمیں اپنے نظریات کو مربوط کرنے میں بہت مدد ملی۔ میں نے بنگالی ادب میں مسلم تحریک کے حوالے سے خطاب کیا۔ اس خطاب کے دوران میں نے بنگالی مسلمانوں کی ادبی تحریک کو ۱۸۹۰ء کے عشرے میں اٹھنے والی آئرلینڈ کی اس تحریک سے تعبیر کیا جس میں ییٹس (Yeats) اور سنج (Synge) نے انگریزی ادب میں آئرش لب ولہجہ اپنانے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ ان دونوں شعرا نے انگریزی ادب میں آئرش دیو مالا اور لوک داستانیں سمونے کی وکالت کی تھی۔ یہ ایسا کام تھا جس کی داد وہ آج تک وصول کر رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک بنگالی زبان کی پختگی تسلیم شدہ تھی، اس لیے لازم تھا کہ اس کی روایات کو ترک کیے بغیر اس میں مسلم اندازِ فکر بھی جھلکے۔ ہم چاہتے تھے کہ مسلم اہلِ فکر بنگالی میں لکھتے وقت اپنی تاریخ، تہذیب اور اقدار کو نہ بھولیں۔ اس کانفرنس کو ''آزاد'' میں نمایاں کوریج ملی۔ ہم ادب کے نام پر جو کچھ کر رہے تھے، وہ اب پاکستان کے لیے قومی تحریک میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہم نے کانفرنس میں صرف سیاسی نہیں بلکہ ثقافتی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا تھا اور یہ بڑا کام تھا۔

انھی دنوں ایک ایسا لمحہ بھی آیا جب ہمیں اندازہ ہوگیا کہ ہماری راہ ایسی آسان بھی نہیں، ابھی بہت سے امتحانوں سے گزرنا ہے۔ ۲ فروری ۱۹۴۳ء کو ڈھاکا یونیورسٹی کی حدود میں ایک ہندو نے نذیر احمد کو خنجر کے وار سے قتل کر دیا۔ یہ کوئی حادثہ نہیں تھا بلکہ یونیورسٹی میں تحریک پاکستان کے لیے پائے جانے والے جوش و خروش کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت نقصان پہنچانا مقصود تھا۔

ہوا یوں کہ ۳۱ جنوری کی رات کو یونیورسٹی کی طالبات نے، جن کا کوئی علیحدہ ہال نہیں تھا، کرزن ہال میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں لڑکوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ گو کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ پروگرام تھا مگر اس میں ہر اس چیز کو نمایاں کیا گیا تھا جو کسی نہ کسی طرح

مسلمانوں کی دل آزاری کا سبب بن سکتی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ یونیورسٹی سے باہر سیاسی ماحول بے حد کشیدہ تھا۔ ڈائس پر چند رنگین برتن بھی رکھے تھے جو ہندو عقائد کے عکاس تھے۔ منتظمین نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تقریب کا آغاز بندے ماترم کے ترانے سے کیا۔ یہ ترانہ بنکم چندر چیٹر جی کے ناول ''آنند مٹھ'' سے لیا گیا ہے جس میں بنگال ماتا کو ہندوؤں کی دیوی دُرگا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس ترانے کی ایک طویل تاریخ ہے اور کانگریس کے جلسوں میں اس کا پیش کیا جانا کئی مرتبہ فسادات کا باعث بنا ہے۔ اس پروگرام کو بندے ماترم سے شروع کرنا کسی بھول چوک کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک پیغام تھا کہ ہندو علیحدہ وطن کا مطالبہ اتنی آسانی سے منظور نہیں ہونے دیں گے۔

جیسے ہی بندے ماترم شروع ہوا مسلم طلبہ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ اس بات سے مشتعل ہو کر ہندو طلبا نے اچانک اُن پر ہاکی اور ڈنڈوں سے حملہ کر دیا۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع تھا کہ مسلم طلبا بھونچکے رہ گئے۔ ان کے پاس پسپائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ نہتے مسلمان طلبہ ہاکی اور ڈنڈوں کے آگے بے بس تھے۔ کشیدگی پھیل گئی مگر یونیورسٹی کی انتظامیہ نے صورت حال کو معمول پر لانے کے لیے کچھ بھی نہ کیا۔ اشتعال انگیز فضا کو ختم کرنے کے لیے کلاسوں کو چند دنوں تک معطل رکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی۔

ایک دن کے وقفے کے بعد جب ۲ فروری کو تدریسی عمل دوبارہ شروع ہوا تو مسلمانوں نے اس توہین کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کلاس رومز میں فساد برپا ہو گیا۔ نذیر احمد کو اس نوعیت کے جھگڑے پسند نہ تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ہندوؤں سے بدلہ لینے کا بہترین طریقہ پاکستان کا قیام ہے۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ ان پر اس وقت خنجر سے حملہ کیا گیا جب وہ دو گروہوں کے درمیان بیچ بچاؤ کی کوشش کر رہے تھے۔

قاتل یقینی طور پر تربیت یافتہ تھا۔ اس نے پیٹھ پر ایسی جگہ وار کیا جہاں سے خنجر کا دل تک اتر جانا یقینی تھا۔ اس نے خنجر گھونپنے کے بعد وار کو کاری کرنے کے لیے اسے بل بھی دیا۔ ابتدا میں خبر یہ ملی تھی کہ نذیر احمد معمولی زخمی ہوئے ہیں مگر چند ہی گھنٹوں میں انہوں نے مظفور ڈ اسپتال میں دم توڑ دیا۔ ہم تو عیادت کے لیے گئے تھے مگر لاش لے کر آئے۔

ہم سب سکتے میں آ گئے تھے۔ شدید غم اور غصے سے ہماری حالت عجیب ہو گئی تھی۔ ہر شخص شدید جذبات سے مغلوب تھا۔ ۳ فروری کو نذیر احمد کی تدفین عمل میں لائی گئی۔ اس موقع پر وہ نوجوان بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے جو نذیر احمد کو ذاتی طور پر نہیں جانتے تھے۔ ہمیں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ ایک عظیم جدوجہد ہمارے سامنے پہاڑ کی طرح کھڑی ہے۔ ہمیں اس بات کا ادراک ہو رہا تھا کہ ہم اب تک جس سیاست پر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بحث کیا کرتے تھے، میدان عمل میں ہمیں خاصی مختلف اور اصلی سیاست کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یونیورسٹی میں نذیر احمد مجھ سے ایک سال جونیئر تھے۔ قتل کے وقت وہ ایم اے (معاشیات) کے آخری سال میں تھے جبکہ میں نے ایم اے کا امتحان ۱۹۴۲ء میں پاس کر کرکے یونیورسٹی ہی میں نوکری تلاش کرنی شروع کر دی تھی۔ نذیر احمد نے سماجی اور سیاسی کارکن کی حیثیت سے ایک منفرد حیثیت حاصل کر لی تھی۔ وہ متاثر کن حد تک انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ طلبا انہیں ایک ایسے ساتھی کی حیثیت سے جانتے تھے جو دوسروں کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھتا ہو اور ان کی مدد کر کے خوش ہوتا ہو۔ مختلف نظریات کے طلبا ان کی سرپرستی میں ایک ایسے کاز کے لیے متحد ہو گئے تھے جو کسی اور ماحول میں یقینی طور پر ان کا کاز نہ بن پاتا۔ نظریۂ پاکستان نے نذیر احمد میں غیر معمولی جوش و جذبہ بھر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس عظیم مقصد کے لیے وقف کر چکے تھے۔ جو بھی ان سے ملتا تھا وہ ان میں کچھ نہ کچھ غیر معمولی بات محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لوگوں کو ان سے بات کر کے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں کچھ تو ہے جو دنیاوی کثافتوں سے مبرّا ہے!

نذیر احمد کے قتل نے ڈھاکا یونیورسٹی میں طلبہ کی طرف سے چلائی جانے والی تحریک پاکستان کو شدید نقصان پہنچایا جسے ہم ہر قیمت پر زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تدفین کے دو یا تین دن بعد ''پاکستان'' کا یادگاری شمارہ شائع کیا گیا۔ جسیم الدین نے ان کی یاد میں بہت پُرتاثیر نظم لکھی۔ علی احسن، عبدالرزاق اور مظہر الحق نے بھی ان کی یاد میں بہت عمدہ مضامین قلم بند کیے۔ میں نے بھی ان سے اپنے ذاتی تعلق کو بیان کیا۔ سلیم اللہ ہال اور فضل الحق مسلم ہال

کے طلبہ نے تعزیتی جلسوں کا اہتمام کیا۔ سلیم اللہ مسلم ہال کی یونین نے اپنے آئین میں تبدیلی کی اور ایک قرارداد کے ذریعے طے کیا کہ ہر سال ۲ فروری کو نذیر ڈے کی حیثیت سے منایا جائے گا۔ نواکھالی اور دوسرے علاقوں میں بھی تعزیتی جلسوں کا اہتمام کیا گیا۔

گو کہ نذیر احمد کا قتل ہمارے لیے شدید دھچکے کا باعث تھا تاہم اس واقعے نے تحریک پاکستان کے حوالے سے ہم میں ایک نیا جذبہ اور ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ انہوں نے شہادت کا درجہ پا کر ہماری نظروں میں ہیرو کی حیثیت اختیار کر لی اور وہ تحریک پاکستان کی علامت بن کر ابھرے۔

نذیر احمد کا قتل اپنی نوعیت کا کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ گزشتہ سال بھی سائنس کے ایک طالب علم کو سہ پہر لیبارٹری سے واپسی پر جگن ناتھ ہال کے باہر چاقو مار کر شہید کر دیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، اس طالب علم کا نام مظاہر تھا۔ میں اسے ذاتی طور پر تو نہیں جانتا تھا مگر اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ محض اس لیے قتل ہوا کہ وہ مسلمان تھا اور ہندو مسلمانوں کے خون کے پیاسے! فرقہ وارانہ فسادات اب تک شہر کے چند گنجان علاقوں تک ہی محدود تھے۔ اسکولوں اور کالجوں کو اس معاملے میں استثنیٰ حاصل تھا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ تعلیمی ادارے دنیا کی ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر بلند تر مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ اسی لیے اساتذہ اور طلبا کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مظاہر کے قتل نے اس خام خیالی کو دور کر دیا تھا۔

نذیر احمد کے قتل سے پیدا ہونے والا خلا وقت کے ساتھ وسعت اختیار کرتا چلا گیا۔ سیاسی جوش و جذبہ بڑھتا جا رہا تھا مگر ابھی تک اُن کی جگہ سنبھالنے والا ایسا کوئی لیڈر سامنے نہیں آیا تھا جو آگے بڑھ کر بھیڑ کو منظم کرتا۔ جبکہ اُس وقت طلبا میں ہم آہنگی پیدا کرنا بہت ضروری تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۴۱ء میں اے کے فضل الحق نے، جن کی سیاسی وفاداری کبھی قابل اعتبار نہیں رہی تھی، مسلم لیگ کو چھوڑ کر ہندو مہا سبھا کے لیڈر شیام پرشاد مکھرجی کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنالی۔ نذیر احمد نے اس کابینہ کے ایک رکن نواب خواجہ حبیب اللہ کے خلاف ایک مظاہرے کا اہتمام کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی اور میں اتنا دم نہیں تھا، اس لیے کہ نواب حبیب اللہ ایک بہت طاقتور مقامی شخصیت تھے۔ ان کے والد نواب سلیم اللہ اور دادا نواب احسن اللہ

نے ڈھاکا کے شہریوں پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے۔ مگر نذیر احمد کو اس بات کی چنداں پروانہ تھی۔ اُس مظاہرے کے مقابلے میں ہمارے خدشات کے مطابق نواب حبیب اللہ کے حامیوں نے بھی ایک جوابی جلسے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ یہ مظاہرے ڈھاکا ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہونے تھے جہاں ہمیں نواب حبیب اللہ کا استقبال کالی جھنڈیوں سے کرنا تھا۔ وزیر کے حامیوں نے ہم پر چاقوؤں اور ڈنڈوں سے حملہ کر دیا۔ ہم میں سے بہت سے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے لیکن نذیر احمد اپنی جگہ ڈٹے رہے اور وزیر کی آمد تک اپنا مظاہرہ جاری رکھا۔ ایسا جوش اور جذبہ دوسروں میں کم کم تھا۔ کاز کے معاملے میں ان میں ذرا بھی لچک نہیں تھی۔

نذیر کو ۱۹۴۳ء میں قتل کیا گیا جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء کے عرصے کے دوران مشکل ترین سال تھا۔ بنگال کے ہولناک قحط کی تباہ کاری جولائی اور اگست میں نقطہ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۴۲ء کے آخر ہی سے غذائی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ شروع ہو گیا تھا۔ جنوری ۱۹۴۳ء میں چاول کی قیمت پانچ روپے سے دس روپے فی من ہوگئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تبدیلی عارضی ہے، کل کو قیمت پھر معمول کی سطح پر آجائے گی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا اور جون تک چاول کی قیمت ۸۰ روپے فی من تک جا پہنچی۔ قیمت زیادہ تھی اور سپلائی بہت کم۔ لوگوں کو خوراک کے حصول میں غیر معمولی دشواری کا سامنا تھا۔ چاول تو بازار سے غائب ہی ہو گیا تھا۔ خوراک کی قلت کی وجہ سے لوگ چلتے پھرتے ڈھانچوں میں تبدیل ہونے لگے۔ لوگوں نے پسماندہ علاقوں سے خوشحال علاقوں کی طرف نقل مکانی شروع کر دی۔ پورے بنگال سے لوگ اُٹھ کر کلکتہ میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ چلتے پھرتے ڈھانچے خوراک کی تلاش میں ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جاتے اور ناکام ہو کر راستوں میں پڑے رہتے تھے۔ ان کے حوصلے دم توڑ چکے تھے۔ یہ لوگ سڑکوں پر اور گلیوں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے رہے۔ مگر فسادات ہوئے نہ سول نافرمانی نام کی کوئی چیز دکھائی دی۔

یہ قحط صرف بنگال تک محدود تھا جو خالصتاً ناکام حکومتی پالیسیوں اور سازش کا نتیجہ تھا۔ انگریز حکومت نے خوراک کے سارے ذخائر فوج کے لیے خرید لیے تھے جس کے باعث عام آدمی کے کھانے کو کچھ نہیں بچا۔ رہی سہی سپلائی تاجروں نے ذخیرہ کر لی۔ مواصلات کے ذرائع

محدود تھے اس لیے حکومت مختلف علاقوں کو ضرورت کے مطابق خوراک فراہم نہ کر سکی جس کے نتیجے میں بازار سے چاول غائب ہوگیا۔ انگریز حکومت جنگ میں اُلجھی ہوئی تھی اور اس نے عوام کے مسائل کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ حالت دن بہ دن بگڑتی چلی گئی۔ صوبے میں اے کے فضل الحق وزیرِاعلیٰ تھے اور حسین شہید سہروردی وزیرِ خوراک، لیکن ان میں سے کوئی بھی بحران کی شدت کا اندازہ اور احساس نہ کر سکا۔ اور انہوں نے اس سے نمٹنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے۔ یہ خبریں بھی زبان زدِعام تھیں کہ چاول کے بڑے ذخائر مارواڑی تاجروں کو فروخت کرنے میں یہ دونوں بھی ملوث ہیں۔ بلکہ ایک ذخیرہ اندوز کے خلاف مقدمے کی سماعت کے دوران ہائی کورٹ نے اے کے فضل الحق کو بھی رگڑ دیا تھا۔ حسین شہید سہروردی اس نوعیت کی تنقید سے تو بچ نکلے تاہم ان کی بے قاعدگیوں سے متعلق بھی کہانیاں گردش کرتی رہیں۔ حالات نے سیاست کے میدان میں انہیں جس امیج کا مالک بنا دیا تھا، وہ اس کے لائق نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں لیڈروں میں بلند کرداری اور دیانت داری نہیں تھی۔ دونوں ہی دولت کی ہوس کے مارے ہوئے تھے۔ ان کی سیاسی کامیابیوں کو کمتر کر کے دکھانا میرے لیے شاید کوئی بہت زیادہ پسندیدہ عمل نہیں ہوگا۔ مگر حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ ان کی کمزوریوں کو بھی ریکارڈ پر لایا جائے۔ ان کمزوریوں کو سمجھ کر ہی مسلمانوں میں بعد میں مختلف سطحوں پر رونما ہونے والی کمزوریوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ برصغیر میں مسلم سیاست کے کمزور پہلوؤں کی تفہیم کے لیے یہ سب کچھ بیان کیے بغیر چارہ نہیں۔ اے کے فضل الحق اور سہروردی دونوں ہی اپنی اپنی انا کے اسیر تھے۔ وہ نظریات سے زیادہ اپنی ذات اور سیاست میں اپنے بلند مقام پر یقین رکھتے تھے۔ ان میں بلاشبہ بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ انہوں نے علم اور قابلیت کو اپنے سر پر سوار کر لیا تھا اور اپنے اردگرد موجود لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ دونوں کا خیال تھا کہ وہ ان لوگوں کے جذبات اور ضرورتوں سے اپنی مرضی کے مطابق کھیل سکتے ہیں اور انہیں انگلی کے اشارے پر نچا سکتے ہیں۔ یہ دونوں لوگوں کی مجبوریوں کو اپنے حق میں استعمال کرنا خوب جانتے تھے۔ دونوں ہی باصلاحیت اداکار تھے۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور حرکات و سکنات کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ بنگالیوں کو متاثر کرنا

انہیں خوب آتا تھا۔ اے کے فضل الحق مقابلتاً زیادہ شاطر تھے اور اس کھیل میں ان کی مہارت بے مثال تھی۔ ان دونوں لیڈروں میں سیاسی بصیرت، دور اندیشی اور اپنے نظریات سے پُختہ وابستگی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ انہوں نے بھی جمہوریت، انسانی حقوق، غریبوں کی بہبود اور ایسے ہی دوسرے بہت سے نعروں کو استعمال کر کے خوب فوائد سمیٹے۔ ان کے پورے سیاسی کیریئر میں کسی مرحلے پر بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے ان تمام اعلیٰ اقدار کو حقیقی اہمیت دی اور وہ ان پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔

سہروردی اور اے کے فضل الحق بہت جلد قائداعظم سے الگ ہو گئے اور اس کا بنیادی سبب بھی یہی تھا کہ ان میں بصیرت کی کمی تھی۔ ان میں قائداعظم کی طرح اپنے مقاصد کے لیے سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ نہیں تھا۔ قائداعظم کے کردار میں جتنی بلندی تھی، ان دونوں کے کردار اتنے ہی پست تھے۔ قائداعظم یکسو تھے کہ مسلمانوں کو ایک الگ وطن مل جائے جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق اور محفوظ زندگی بسر کر سکیں جبکہ سہروردی اور اے کے فضل الحق فوری سیاسی فوائد، وزارتوں اور محکموں کے طلبگار تھے۔ قائداعظم کا انداز واضح اور دوٹوک تھا، ان کے بارے میں کسی قسم کی بدعنوانی میں ملوث ہونے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ انہیں کوئی اپنے اصولوں سے رُوگردانی پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ قائداعظم کی ایمانداری، اخلاص، دور اندیشی اور بصیرت سہروردی اور اے کے فضل الحق جیسے لوگوں کے لیے بجائے خود ایک تازیانہ تھی۔ اُن کی بلند و بالا شخصیت کے سامنے اِن دونوں کی حیثیت بونوں کی سی تھی۔

سہروردی اور اے کے فضل الحق بھی بنگال میں قحط کے ہاتھوں پھیلنے والی تباہ کاریوں کے بڑی حد تک ذمہ دار تھے۔ عوام کی مشکلات دور کرنے کے لیے کچھ نہ کر سکنے پر مستعفی ہونے کے بجائے انہوں نے اپنی بے اختیار وزارتوں سے چمٹے رہنا مناسب سمجھا جس کے نتیجے میں عوام کی مشکلات بڑھتی چلی گئیں۔ اگر یہ دونوں مستعفی ہو جاتے تو قحط کی ذمہ داری پوری طرح برطانوی حکومت پر ڈالی جاسکتی تھی۔ انہوں نے اس نازک صورتحال کا ادراک نہیں کیا اور نہ یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ برطانوی حکومت بڑی خوب صورتی سے اپنی کوتاہی کی ذمہ داری ان پر ڈال رہی ہے! انہوں نے ان حالات کو پیش نظر رکھے بغیر جلسوں میں اپنی انتخابی تقاریر

سلسلہ جاری رکھا۔ ایک اندازے کے مطابق بنگال کے اس وقت کے قحط نے تقریباً بیس لاکھ افراد کی جان لے لی تھی اور انسان کی حیثیت کیڑوں مکوڑوں کے برابر ہوگئی تھی۔ بنگال کے طول و عرض میں لوگ بھوک کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترتے رہے اور سب بے بسی سے تماشا دیکھتے رہے۔ بعد ازاں قحط کے اسباب جاننے کے لیے انکوائری کی رپورٹ سامنے آئی تو عوامی خدشات درست ثابت ہوئے اور مشہور شخصیات اس میں ملوث پائی گئیں۔

بنگال کے قحط نے ملک کی مجموعی سیاسی صورت حال پر زیادہ اثرات مرتب نہیں کیے۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے جنگ عظیم کے خاتمے پر ابھرنے والی سیاسی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے آخری معرکے کی تیاریاں شروع کردیں۔

ڈھاکا میں پاکستان کے قیام کی تحریک کو ہم نے کسی نہ کسی طرح زندہ رکھا۔ نذیر احمد کے قتل نے جس طرح پریس میں گونج پائی اس سے مجھے اور چند دوسرے دوستوں کو نمایاں ہونے کا موقع ملا۔ اس صورت حال میں ہم پر ایک غیر متوقع حملہ عبدالرحمٰن صدیقی کے اخبار ''مارننگ نیوز'' کی جانب سے کیا گیا۔ انہوں نے ایک اداریے میں نذیر احمد کی موت کا ذمہ دار مسلم طلبہ کو ٹھہرایا۔ انہوں نے لکھا کہ مسلمان اگر بزدلی کا مظاہرہ نہ کرتے تو نذیر احمد پیٹھ پر زخم نہ کھاتے۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں نے جواب آں غزل کے طور پر ایک طویل خط لکھا جس میں معاملات کی وضاحت کی گئی تھی اور عبدالرحمٰن صدیقی سے کہا کہ وہ اس خط کو ضرور شائع کریں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خط شائع کیا بلکہ ایک اضافی اداریے میں ڈھاکا یونیورسٹی کے تمام مسلم طلبا سے معافی بھی مانگی۔

ثقافتی اور معاشرتی شناخت کے لیے شروع کی جانے والی مسلمانوں کی تحریک اب ایک علیحدہ وطن کے قیام کی بھرپور جدوجہد میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اس تحریک میں مسلم طلبہ ہراول دستے کا کردار ادا کررہے تھے۔ سہروردی اور اے کے فضل الحق جیسے ''قائدین'' اب بھی شدید تذبذب کا شکار تھے۔ جبکہ نئی نسل ان کے حسد، تکبر اور سازشوں سے نالاں تھی۔ حق تو یہ ہے ا... نوجوان اندازہ لگا چکے تھے کہ قومی سطح پر کیا کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے اور تحریک کس موڑ پر پہنچ چکی ہے ... ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں تحریک پاکستان کی وسعت بالکل عیاں ہوگئی اور سب ... پتا چل گیا

کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے پوری طاقت کے ساتھ قائداعظم کی پشت پر کھڑے ہیں۔
بنگال اور مسلم اقلیتی صوبوں میں تحریکِ پاکستان زیادہ شدت کے ساتھ جاری تھی۔ یہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنے لیے الگ وطن کے قیام کا مطالبہ کیوں کر رہے تھے۔ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد میں گو کہ مسلمان اکثریت میں تھے مگر ان علاقوں میں ہندو غالب طبقے کی حیثیت سے موجود تھے۔ بہرحال یہاں پر مسلمانوں نے واضح طور پر مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ پنجاب کا بھی حال یہی تھا۔ وہاں کے مسلمان یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ وہ ثقافتی طور پر کمزور ہیں اور انہیں ہندوؤں کے زیرِ نگیں رہنا چاہیے۔ بنگال میں مسلمان تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور علمی اعتبار سے خاصے کمزور تھے۔ بنگال کے مسلمان برطانوی حکومت کے سیاسی جبر اور ہندوؤں کے معاشی استحصال کی چکی میں پس رہے تھے۔ وہ زندگی کی دوڑ میں لاکھ آگے نکلنے کی کوشش کرتے مگر خود کو وہیں کا وہیں کھڑا پاتے تھے۔ ان کے تمام راستے ایک بند گلی پر ختم ہوتے تھے۔ ان کے پاس نجات اور بقا کا واحد راستہ یہ تھا کہ اپنی تمام زنجیریں توڑ پھینکیں اور ایک نئے تناظر میں زندگی بسر کریں۔

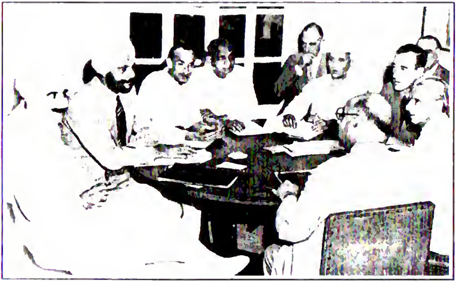

بالآخر تقسیمِ ہند پر اتفاق ہو گیا۔ آخری وائسرائے ہند کے ساتھ سیاسی رہنماؤں کا اجلاس (۱۹۴۷ء)

تیرھواں باب

کلکتہ کے ساتھی اور شب و روز

۱۹۴۴ء کے موسم گرما میں کلکتہ میں ایک کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا جس کے ادبی سیشن کی صدارت مجھے کرنی تھی۔ کچھ ہی دن قبل میری ٹانگ کا آپریشن ہوا تھا، زخم پوری طرح بھرا نہیں تھا، چلنے میں بھی دشواری کا سامنا تھا۔ ایسے میں روز نامہ ''آزاد'' کے ایڈیٹر ابوالکلام شمس الدین نے مجھے رینا ساں سوسائٹی آف کلکتہ کی کانفرنس میں ادبی سیشن کی صدارت کے لیے دعوت نامہ بھیجا۔ یہ کانفرنس یکم جولائی ۱۹۴۴ء کو ہونی تھی۔ جنوری ۱۹۴۳ء میں ہم نے ابوالکلام شمس الدین کو ڈھاکا یونیورسٹی میں مدعو کر کے ان سے ایک کانفرنس کی صدارت کروائی تھی۔ غالباً وہ مجھے اسی کے جواب میں دی ایسٹ بنگال لٹریری سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے بلا رہے تھے۔ اُس وقت میں چوبیس سال کا تھا اور کسی اشاعتی سلسلے میں ایک بار کلکتہ گیا تھا۔ کسی میٹروپولیٹن شہر میں ہونے والی کانفرنس میں شرکت کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ میرا آپریشن ہوا ہے، فوری طور پر نہیں آپاؤں گا۔ اس پر انہوں نے کانفرنس مؤخر کر دی اور لکھا کہ وہ میرے صحت یاب ہونے کا انتظار کر لیں گے۔

میں نے بستر پر لیٹے لیٹے صدارتی خطبہ لکھوایا جس میں مَیں نے مسلم مصنفین کو درپیش مسائل کا بلا جھجک اور آزادانہ طور پر احاطہ کیا تھا۔ ابوالکلام نے میرے اس خطبے کو خوب سراہا اور مسلم مصنفین کے اُن مسائل کو درست قرار دیا جن کی میں نے نشاندہی کی تھی۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں کلکتہ کے اسلامیہ کالج میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ میں اس وقت تک پوری طرح صحت یاب نہیں ہو پایا تھا۔ لنگڑا کر چلتا تھا اور ٹانگوں پر سے پٹیاں بھی نہیں اتری تھیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ انہی دنوں بنگال ایجوکیشن سروس نے لیکچرر شپ کے لیے میرا انٹرویو کیا اور منتخب کر لیا۔ میرا تقرر اسلامیہ کالج کلکتہ ہی میں عمل میں آیا۔

ڈھاکا سے کلکتہ منتقلی میرے لیے بہت بڑی تبدیلی تھی۔ ڈھاکا کے مقابلے میں کلکتہ خاصا بڑا شہر تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ڈھاکا یونیورسٹی میں تحریکِ پاکستان کے حوالے سے خاصی گہما گہمی تھی جبکہ کلکتہ میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس حوالے سے یہاں روزنامہ ''آزاد'' کی عمارت میں روزانہ دانشوروں کی محفل جمتی تھی اور تحریکِ پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے منصوبہ بندی کی جاتی تھی۔ یہ اخبار مولانا اکرم خان کی ملکیت تھا جو ایک دانشور اور سینئر صحافی تھے۔ مذہبی معاملات میں بھی ان کا علم غیر معمولی تھا۔ وہ بنگالی بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔ مجھے بھی یہاں جلد ہی مرکزی مقالہ نگار کی حیثیت سے قبول کرلیا گیا۔ یہ میری صلاحیتوں کے اظہار کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ڈھاکا کے پندرہ روزہ ''پاکستان'' کے مقابلے میں یہاں کام کرنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اس لیے بھی کہ اس کے قارئین کا حلقہ زیادہ وسیع تھا۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے مقابلے میں اسلامیہ کالج، ظاہر ہے ایک چھوٹا ادارہ تھا، اس کا رنگ بین الاقوامی تھا۔ ہندو، مسلم، عیسائی، بنگالی، غیر بنگالی سبھی طرح کے اساتذہ تھے۔ البتہ طلبہ سب مسلمان تھے۔ کالج سے باہر جن اُمور پر بحث چل رہی ہوتی تھی، وہی موضوعات کالج کے سینئر کامن روم میں بھی زیرِ بحث رہتے۔ شعبہ تاریخ کے پروفیسر ظہور الاسلام مسلم نقطہ نظر کے پُرجوش وکیل تھے۔ انہیں مسلم لیگ کے پیش کردہ دوقومی نظریے پر کامل یقین تھا۔ دیگر مسلم اساتذہ مسلم امور کی وکالت کے معاملے میں ان کی طرح پُرجوش تو نہ تھے تاہم ان میں پروفیسر کاظم الدین کے سوا سبھی مسلم لیگ کے حامی تھے۔ کاظم الدین برائے نام مسلمان تھے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی اور مطالعہ بھی غیر معمولی تھا، فلسفے کے پروفیسر تھے۔ بنیادی طور پر دہریے تھے اور اس کا اعلان کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ اسلامیہ کالج میں سعید الرحمٰن فلسفے کے استاد تھے۔ آزاد خیال مفکر تھے اور لگی لپٹی کہے بغیر وہ کوئی بھی بات بیان کردیتے تھے۔ مسلم اداروں کو وہ شدید تنقید کا نشانہ بنایا کرتے تھے مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سیاست کے معاملے میں وہ قدرے روایت پسند تھے اور مسلم طلبہ کی تحریک کو درست قرار دے کر اس کی بھرپور حمایت کرتے تھے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ سیاست میں منطق کے مقابلے میں سماجی تعلقات کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ تحریک پاکستان کے لیے تاریخ کے پروفیسر نذیر احمد بھی خاصے

پر جوش تھے اور یہی حال اسی شعبے کے استاد میر جہاں کا بھی تھا۔

معاشیات کے شعبے کے ایک اور لیکچرر سلطان الاسلام تھے۔ جن کے اجداد کومیلا سے آئے تھے مگر ان کی مادری زبان اردو تھی۔ انگریزی کے پروفیسر طاہر جمیل کا تعلق کلکتہ ہی سے تھا، جہاں ان کا خاندان دو نسلوں سے سکونت پذیر تھا۔ یہ بھی اردو بولنے والے تھے اور بنگالیوں کی شہری آبادی کے اُس طبقے کی نمائندگی کرتے تھے جس نے شعوری طور پر اردو کو اپنا لیا تھا۔ کیونکہ انیسویں صدی میں ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے نے بنگالی کو اپنے کاز کے لیے استعمال کیا اور اس پر ہندومت کا ٹھپہ ثبت کر دیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے پاس اردو کو اپنانے کے سوا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔

طاہر جمیل مجھ سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ سلطان الاسلام عمر میں خاصے بڑے اور سکّہ بند کنوارے تھے۔ ان میں بھرپور جوش و جذبہ تھا اور جو کچھ بھی کہتے تھے، اس میں توانائی اور بے باکی نمایاں ہوتی تھی۔

اسلامیہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر آئی ایچ زبیری کا تعلق یوپی سے تھا۔ وہ میرے آنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی اس عہدہ پر تعینات ہوئے تھے۔ سنا ہے کہ انہوں نے اپنے پیشرو مدراس سے تعلق رکھنے والے عیسائی پروفیسر ''زکیریا'' کو سیاسی داؤ پیچ کے ذریعے نکلوایا تھا۔ پروفیسر زکیریا خاصے علمی آدمی تھے اور لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ کسی بھی سرکاری کالج میں پرنسپل کے خلاف بولنا بہت خطرناک ہوتا تھا۔ کالج کے سینئر اساتذہ میری موجودگی میں کچھ بولنے سے گریز کرتے تھے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ کہیں میں یہ باتیں آگے نہ بڑھا دوں! اپنے پیشرو کو نکلوانے کے لیے جوڑ توڑ کر کے ڈاکٹر آئی ایچ زبیری نے جو بدنامی مول لی تھی، اس کا ازالہ کرنے کے لیے انہوں نے کالج میں تحریکِ پاکستان کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ کالج کے ماحول کو پاکستان نواز بنانے میں ان کے اس رویے کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔

اسلامیہ کالج میں میرے نوجوان ساتھیوں میں انگریزی کے لیکچرار ابو رشد متین الدین اور اسلامی تاریخ و ثقافت کے عبدالمجید نمایاں تھے۔ متین الدین میرے دُور کے کزن تھے۔ یہ لوگ تین نسلوں سے کلکتہ میں مقیم تھے، اس لیے اب دیہی علاقوں اور ان کی ثقافت سے کچھ خاص تعلق نہیں تھا۔ گھر میں اردو بولتے تھے۔ ویسے متین الدین بنگالی میں لکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔

ادبی ذوق تھا اور ان کی ایک دو کتابیں بھی شائع ہو چکی تھیں۔ وہ کہانیاں لکھتے تھے جو فکری اعتبار سے خاصی ناپختہ ہوتی تھیں۔ ان کے کرداروں میں گہرائی اور جوش و جذبہ مفقود تھا۔ ان خامیوں کے باوجود ان کی سرپرستی کرنے والے موجود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں لکھنے والوں کی اس قدر کمی تھی کہ لوگوں کو خامیوں کے ساتھ بھی قبول کر لیا جاتا تھا۔ متین الدین قیامِ پاکستان کی سیاسی تحریک کے حوالے سے نیم دلانہ رویہ رکھتے تھے۔ دو قومی نظریے کے بارے میں ان کا ذہن واضح نہیں تھا۔ وہ بنیادی طور پر مجمع کے ساتھ بچ بچا کر چلنے والے لوگوں میں سے تھے اور کسی طرح کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ۱۹۷۱ء میں واشنگٹن میں پاکستان کے کلچرل اتاشی کی حیثیت سے بغاوت کی۔

عبدالمجید ہندوانہ ذہن کے مالک تھے۔ وہ اسلامی تاریخ اور اسلامی ثقافت پڑھاتے تھے لیکن وہ نہ اسلام کے بارے میں کچھ جانتے تھے اور نہ اسلامی ثقافت کو سمجھتے تھے۔ وہ ان حالات کا رونا روتے رہتے تھے جن کے باعث ہندو اور مسلمان الگ الگ ہو گئے تھے۔ وہ خود کو ہندوؤں کے زیادہ نزدیک سمجھتے تھے باوجودیکہ وہ مسلم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں وہ ڈھاکا یونیورسٹی سے متعلق ہو گئے تھے، جہاں انہوں نے پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو کمزور کرنے کی بھی بہت کوشش کی۔ مگر اس معاملے میں، مَیں انہیں موردِ الزام نہیں ٹھہراتا، اس لیے کہ انہوں نے کبھی اپنے نظریات کو چھپایا نہیں تھا۔ اگر حکومتِ پاکستان کے بزرجمہروں نے ان کے ماضی سے دیدہ دانستہ پردہ پوشی کی اور انہیں حیثیت دی تو اس میں اُن کا کیا قصور۔

متین الدین کا کیس بجائے خود ایک فریب تھا۔ انہوں نے پاکستان کو محض دکھاوے کے لیے قبول کیا تھا۔ پھر اس سے ہر وہ فائدہ بٹورا، جو بٹورا جا سکتا تھا اور بعد میں عوامی لیگ کے پروپیگنڈے سے ''متاثر'' ہو کر لوٹ مار اور استحصال کی بات کرنے لگے۔

اسلامیہ کالج میں ہندو اساتذہ بھی سیاسی بحث میں حصہ لیتے تھے اور اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے۔ تاہم ماحول مجموعی طور پر دوستانہ تھا اور بحث کھل کر ہوتی تھی۔ ۱۹۴۶ء کے ہولناک فسادات تک کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ ہم کتنے بڑے دھماکے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بات چیت زیادہ تر علمی انداز میں ہوتی تھی اور ہم ایک

دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنے کی خاطر کبھی کبھی حقیقی مسائل سے اِغماض برت جاتے تھے۔
اسلامیہ کالج مسلمانوں کے لیے ایک بڑے علمی مرکز کی حیثیت رکھنے کے باوجود سیاسی اعتبار سے ڈھاکا یونیورسٹی کا ہم پلّہ نہ تھا۔ تحریک پاکستان میں ڈھاکا یونیورسٹی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جبکہ اسلامیہ کالج ایک بڑے میٹروپولیٹن شہر کا سرکاری کالج تھا۔ اسی وجہ سے کالج کے اساتذہ قائداعظم کے بارے میں اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی بحث کے دوران کہیں نہ کہیں ایک حدِ فاصل تو قائم کرنی پڑتی ہے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے متحرک پس منظر کے ساتھ میں اسلامیہ کالج میں خود کو زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کرتا تھا!
کلکتہ میں جس جگہ، میں دوسروں سے آسانی سے تبادلۂ خیال کرسکتا تھا وہ صرف روزنامہ ''آزاد'' کا دفتر تھا۔ ابوالکلام شمس الدین کے دفتر میں روز شام کو ابوالمنصور احمد، ڈاکٹر صادق، مجیب الرحمٰن اور ابوالمودود جیسے لوگ آجایا کرتے تھے اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ فرخ احمد، احسن حبیب، ابوالحسین اور غلام قدوس جیسے نئے لکھنے والوں کا بھی وہاں آنا جانا رہتا تھا۔ ابوالکلام شمس الدین سے دوسرے شہر سے آکر ملنے والوں میں مشہور شاعر غلام مصطفیٰ نمایاں تھے۔ ابوالمنصور احمد ایک جہاں دیدہ مصنف اور صحافی تھے۔ ابوالکلام شمس الدین سے ان کی گہری دوستی تھی۔ وہ تحریک پاکستان کے حامی ضرور تھے مگر مسلمان قیادت کی خامیوں کو بخشنے کو تیار نہیں تھے اور کھل کر تنقید کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی نکتہ چینی غیر روایتی آہنگ اختیار کر جاتی تھی۔ ڈاکٹر صادق معاشیات پڑھاتے تھے اور مسلمانوں کے ہندوستان سے علیحدگی کے مطالبے کے حق میں ٹھوس اعداد و شمار پیش کرتے تھے۔ کلکتہ پر مسلمانوں کے دعوے سے متعلق دی رینا ساں سوسائٹی کا پمفلٹ اِنہی کا لکھا ہوا تھا۔ مجیب الرحمٰن روزنامہ ''آزاد'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ نوجوان مصنفین میں فرخ احمد تحریک پاکستان کے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے پاکستان کی حمایت میں ایک پُرجوش ترانہ لکھا تھا جس کے ٹیپ کا مصرع تھا ''لڑ کر لیں گے پاکستان''۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ عنفوانِ شباب میں انہوں نے خاصی بے ڈھنگی زندگی بسر کی تھی۔ پھر انہیں ایک روحانی شخصیت کا ساتھ نصیب ہوا اور اُن کی دنیا ہی بدل گئی۔ فرخ احمد میں بھی اٹھارہویں صدی کے انگریز شعرا کا سا جوش و جذبہ تھا جس کا ذکر ڈبلیو بی

ییٹس (W.B. Yeats) نے کیا ہے۔ وہ لاینول جانسن (Lionel Johnson) اور ارنیسٹ ڈیوسن (Earnest Dewson) کی شخصیتوں کا حسین مرقع تھے۔ احسن حبیب اور ابوالحسین اپنے آپ کو اعتدال پسند قرار دیتے تھے۔ ابوالحسین کے پاس معاشیات میں یونیورسٹی کی ڈگری تھی اور ان کی علمی قابلیت نمایاں تھی۔ قیامِ پاکستان کے مطالبے سے متعلق ان دونوں کا رویہ خاصا مخاصمانہ تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ پاکستان کے مطالبے کو عمل سے زیادہ ردِعمل سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ہندوستان کے مسلمان اپنی شناخت قائم کرنے سے زیادہ معاشی پس ماندگی دور کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ غلام قدوس، جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، اشتراکی تھے۔ ان کا ''آزاد'' کے حلقے میں آنا جانا مسلمانوں کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلمان علیحدگی کا مطالبہ کیوں کر رہے ہیں۔

ایک ہندو مصنف باسودا چکرورتی بھی ہمارے حلقے میں باقاعدگی سے آتے تھے۔ بعد میں وہ آزاد کے اسٹاف میں شامل ہو گئے تھے اور انہوں نے اس کے لکھنے والوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان کی ایک خاص بات، جو بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے، یہ تھی کہ وہ اپنے خیالات سے متصادم نظریات کو بھی اُس کے صحیح تناظر میں سمجھ لیتے تھے اور اُن کا ساتھ دیتے تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی جانب سے علیحدہ وطن کا مطالبہ زندگی کو جہنم میں تبدیل کر دینے والے فرقہ وارانہ فسادات سے بچانے کا ایک بہتر طریقہ تھا۔

ہم بالعموم اس امر پر بحث کیا کرتے تھے کہ نئی مملکت کے پنپنے کے کیا امکانات ہیں، مستقبل میں اس کی پالیسیاں کیا ہوں گی، اُس میں کس طرح کا سیاسی، معاشی اور ثقافتی نظام نافذ ہو سکے گا۔ ہم میں سے کوئی بھی مشرقی بنگال میں علیحدہ وطن کی بات نہیں کرتا تھا۔ ہمیں اندازہ تھا کہ اگر مشرقی بنگال کو علیحدہ ریاست کا درجہ ملا تو وہ ہندوستان کے زیرِ نگیں ہو جائے گا اور اسے آزادانہ چلانا ممکن نہیں رہے گا۔ اور پھر پاکستان کے قیام کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ اور ایک قوم کے لیے دو وطن کس طرح قائم کیے جا سکتے تھے؟

ہمارے لیے یہ بھی ایک سنجیدہ مسئلہ تھا، مشرق اور مغرب کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ان کے درمیان ہندو اکثریتی علاقہ واقع تھا۔ کیا ان کے درمیان کوئی محفوظ

راہداری قائم کی جاسکتی تھی؟ ہم سوچتے تھے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان زمین کی ایک پٹی ہونی چاہیے جو بنگال سے پنجاب تک راہداری کا کام کرے۔ واضح رہے کہ یوپی اور سی پی کے علاقوں میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی اور انہیں راہداری کا درجہ دینے کے لیے مسلمان مطالبہ کر سکتے تھے۔ یا پھر پاکستان اور بھارت آپس کے معاہدے سے اس طرح کی راہداری قائم کر سکتے تھے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان فضائی رابطہ ایسے ہی ایک معاہدے سے ممکن ہو سکا تھا۔ زمینی کوریڈور کے قیام میں البتہ مشکلات ہی حائل رہیں۔

جو لوگ اب یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ متحدہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ قرارداد پاکستان کی روح سے انحراف تھا، وہ تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ابوالہاشم اور ان جیسے چند دوسرے افراد مشرقی بنگال میں علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہے تھے مگر جب تحریکِ پاکستان نے زور پکڑ لیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ سبھی سمجھ رہے تھے کہ مشرقی بنگال میں علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ تحریک پاکستان سے متصادم ہوگا اور اس کا زور توڑ دے گا۔

پاکستان کے مشرقی بازو کے گورنرز

صوبہ مشرقی بنگال کے گورنرز	عرصۂ اقتدار
سر فریڈرک چامرس	۱۵ اگست ۱۹۴۷ء۔ ۳۱ مارچ ۱۹۵۰ء
سر فیروز خان نون	۳۱ مارچ ۱۹۵۰ء۔ ۳۱ مارچ ۱۹۵۳ء
چوہدری خلیق الزماں	۳۱ مارچ ۱۹۵۳ء۔ ۲۹ مئی ۱۹۵۴ء
سید اسکندر علی مرزا	۲۹ مئی ۱۹۵۴ء۔ مئی ۱۹۵۵ء
محمد شہاب الدین (عبوری گورنر)	مئی ۱۹۵۵ء۔ جون ۱۹۵۵ء
امیر الدین احمد	جون ۱۹۵۵ء۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء

۱۵ را کتوبر ۱۹۵۵ء کو ملک میں دو صوبوں کا نظام نافذ ہوا

مشرقی بازو "صوبہ مشرقی بنگال" کے بجائے "صوبہ مشرقی پاکستان" کہلایا

صوبہ مشرقی پاکستان کے گورنرز	سیاسی وابستگی	عرصۂ اقتدار
امیر الدین احمد	مسلم لیگ	۱۴ را کتوبر ۱۹۵۵ء۔ مارچ ۱۹۵۶ء
اے کے فضل الحق	مسلم لیگ	مارچ ۱۹۵۶ء۔ ۱۳ را پریل ۱۹۵۸ء
حامد علی (عبوری گورنر)	مسلم لیگ	۱۳ را پریل ۱۹۵۸ء۔ ۳ مئی ۱۹۵۸ء
سلطان الدین احمد	مسلم لیگ	۳ مئی ۱۹۵۸ء۔ ۱۰ را کتوبر ۱۹۵۸ء
جنرل ایوب خان کا مارشل لا۔ وزیر اعلیٰ کا عہدہ ختم۔ صوبائی گورنر صوبائی انتظامیہ کے بااختیار سربراہ قرار پائے		
ذاکر حسین	مسلم لیگ	۱۰ را کتوبر ۱۹۵۸ء۔ ۱۱ را پریل ۱۹۶۰ء
لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان (پاک آرمی)	فوجی انتظامیہ	۱۱ را پریل ۱۹۶۰ء۔ ۱۱ رمئی ۱۹۶۲ء
غلام فاروق	آزاد	۱۱ رمئی ۱۹۶۲ء۔ ۲۵ را کتوبر ۱۹۶۲ء
عبدالمنعم خان	سول انتظامیہ	۲۵ را کتوبر ۱۹۶۲ء۔ ۲۳ مارچ ۱۹۶۹ء
مرزا نور الہدیٰ	سول انتظامیہ	۲۳ مارچ ۱۹۶۹ء۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء
میجر جنرل مظفر الدین احمد (پاک آرمی)	فوجی انتظامیہ	۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء۔ ۲۳ راگست ۱۹۶۹ء
لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان (پاک آرمی)	فوجی انتظامیہ	۲۳ راگست ۱۹۶۹ء۔ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء
وائس ایڈمرل سید محمد احسن (پاکستان نیوی)	فوجی انتظامیہ	یکم ستمبر ۱۹۶۹ء۔ ۷ مارچ ۱۹۷۱ء
لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان (پاک آرمی)	فوجی انتظامیہ	۷ مارچ ۱۹۷۱ء۔ اپریل ۱۹۷۱ء
لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان (پاک آرمی)	فوجی انتظامیہ	اپریل ۱۹۷۱ء۔ ۳۱ راگست ۱۹۷۱ء
ڈاکٹر عبدالمطلب مالک	آزاد	۳۱ راگست ۱۹۷۱ء۔ ۱۴ ردسمبر ۱۹۷۱ء
لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی (پاک آرمی)	فوجی انتظامیہ	۱۴ ردسمبر ۱۹۷۱ء۔ ۱۶ ردسمبر ۱۹۷۱ء
صوبہ مشرقی پاکستان پر بھارت کا قبضہ ہو گیا		۱۶ ردسمبر ۱۹۷۱ء

چودھواں باب

پاکستان ایک نظریاتی تصور

یہ بات کسی بھی مرحلے پر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پاکستان جغرافیائی سے زیادہ ایک نظریاتی تصور تھا۔ یہ بھارت بھر میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کے حق خود ارادیت پر مبنی مطالبات کا مجموعہ نہ تھا بلکہ اس تصور کا حامل تھا کہ مسلمان خواہ کہیں ہوں، ایک امت ہیں اور ان کی باضابطہ علیحدہ مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی شناخت ہے۔ آج بنگالیوں کی سوچ خواہ کچھ ہو، قیام پاکستان کے وقت ہندوستان بھر کے مسلمانوں کا عمومی تصور یہی تھا کہ وہ ایک علیحدہ اور ناقابل تقسیم قوم ہیں۔ بنگال کے مسلمانوں نے بھی اپنا وزن ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مسلم عوام کے پلڑے میں ڈالا اور دوقومی نظریے کی مکمل حمایت کی۔

ہمارے بحث ومباحثے اور تجزیے کا محور مسلم قوم پرستی کی نوعیت رہتا تھا۔ روزنامہ آزادکی محفل یا ڈھاکا یونیورسٹی میں ہمارے حلقے کا کوئی بھی فرد روایتی مفہوم کے اعتبار سے کٹر مذہبی نہ تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم میں سے بعض افراد عبادات اور دیگر مذہبی رسوم کے معاملے میں باقاعدہ نہ تھے۔ ہم اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی سرعام ہمیں عقائد کے اعتبار سے الجھا ہوا قرار دے۔ ہم سب مذہب کو مانتے تھے اور اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ مذہب قدیم دور کی کوئی فرسودہ چیز ہے۔ اسی طرح بہت سے مسلم اور ہندو قوم پرست بھی مذہب کو تنقید کا نشانہ بنانے کی جرأت نہیں کرپاتے تھے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ خود بھی مذہب پر کسی حد تک ہی کاربند تھے۔ ہمارا اور ان کا اختلاف صرف اس بات پر تھا کہ مذہب ہندوستان میں قومیت کی بنیاد بن سکتا ہے یا نہیں۔

قوم پرستوں کی جانب سے مذہب کو قومیت کی بنیاد کے طور پر قبول کرنے سے انکار کی کئی وجوہ تھیں۔ مذہب اور قومیت کا غلط تصور، ہٹ دھرمی اور منافقت وخود غرضی... یہ سب

ان وجوہ میں شامل تھیں۔ قوم پرستی ہندوستان کے لوگوں کے لیے نیا تصور تھا۔ ہم نے مغرب سے سن رکھا تھا کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں نسل، زبان، مذہب، علاقہ اور روایات شامل ہیں۔ قوم پرستی کے نام پر یورپ ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا مگر یہ ٹکڑے قوم پرستی کی کسی جامع اور متفق علیہ تعریف پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ان میں سے ہر ٹکڑا اپنی مثال آپ تھا۔ مغرب کے اہلِ علم بھی اس بات پر متفق ہیں کہ مغرب میں قوم پرست ریاستوں کا ظہور ایک ایسے طویل عمل کا نتیجہ ہے جس میں زبان، نسل، مذہب اور روایات نے کبھی پس پردہ اور کبھی کھل کر کام کیا ہے۔ ہالینڈ کسی زمانے میں ہسپانوی سلطنت کا حصہ تھا مگر پھر مذہبی، معاشی اور سیاسی وجوہ کی بنیاد پر اس سے الگ ہو گیا۔ سوئٹزرلینڈ غیر معمولی لسانی تنوع کا حامل ہے۔ اسے متحد اور ہم آہنگ رکھنے میں مذہب کا مرکزی کردار ہے۔ یورپ کی بیشتر قومی ریاستوں نے اٹھارہویں صدی کے دوران موجودہ شکل اختیار کی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں نپولین کا تختہ الٹ جانے کے بعد بہت سے ممالک کی سرحدوں کا نئے سرے سے تعین ہوا۔ گو کہ انیسویں صدی کے دوران یورپ بھر میں جنگیں اور انقلابات اس کا نقشہ بدلتے رہے تاہم اس کی بنیادی خصوصیات جوں کی توں برقرار رہیں۔ یورپ میں پروٹسٹنٹ ازم کے عروج کے نتیجے میں مذہب کا کمزور پڑ جانا وہ حقیقت ہے جس کا ہندوستانیوں کو زیادہ ادراک نہیں۔ اس پورے عمل کے نتیجے میں دین اور دنیا کی جو تقسیم عمل میں آئی ہے، وہ بھی ابھی ہندوستانیوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

آر ایچ ٹاؤنے (R.H. Tawney) نے اس حقیقت کو اپنی کتاب ''ریلیجن اینڈ دی رائز آف کیپٹل ازم'' میں عمدگی سے بیان کیا ہے۔ کبھی سود پر ادھار دینا مذہبی لحاظ سے حرام تھا، اب کلیسا کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح کارخانوں میں مزدوروں سے روا رکھا جانے والا سلوک بھی کلیسا کے لیے اہم تھا۔ اب یورپ میں کوئی بھی ان معاملات میں کلیسا کی مداخلت کو پسند نہیں کرتا اور اسے ذرہ برابر اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ یہ ترقی ہے یا تنزلی، اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ البتہ میری ذاتی رائے میں آج کی دنیا مذہب کو انفرادی معاملات تک محدود کر دینا چاہتی ہے۔ اور اسی کو ترقی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے خیال میں بھارت میں مسئلہ اس سے مختلف تھا۔ تاریخی اعتبار سے جدید یورپ میں معاملات کو روحانی اور دنیوی خانوں میں تقسیم کرنے کا عمل صدیوں سے جاری رہا ہے جبکہ ہندوستان کی فضا اس سے آشنا نہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات پر حاوی رہا ہے۔ کوئی بھی ہندو مسلمانوں کے درمیان اپنائیت کے ساتھ نہیں رہ سکتا اور یہی حال مسلمانوں کا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انفرادی یا اجتماعی سطح پر یہ دونوں ہر وقت آپس میں دست و گریباں ہی رہتے تھے لیکن زندگی کے بیشتر معاملات میں ان کے درمیان عقائد اور نظریات کے حوالے سے اختلافات اتنے شدید تھے کہ ان کا آپس میں مکمل ہم آہنگی کے ساتھ گھل مل جانا ناممکن تھا۔ ہندو مذہب میں ذات پات کا نظام اس پر مستزاد تھا۔

آج کی قوم پرستی، آبادی میں پہلے سے موجود اتحاد اور یگانگت کے اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ اسے کسی بھی ایسے ملک پر مسلط نہیں کیا جا سکتا جس کے باشندے گروہ در گروہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف انداز میں زندگی بسر کرتے ہوں اور جن میں باہم کسی ہم آہنگی اور یگانگت کا تصور ناپید ہو۔ جو لوگ ہندوستان کو سیاسی طور پر ایک دیکھنا چاہتے تھے، ہو سکتا ہے وہ ایک اعلیٰ مقصد کی تکمیل چاہتے ہوں، مگر ان کا زندگی کے تلخ حقائق سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ حقائق کو نظر انداز کر کے ایک ایسا سیاسی تانا بانا بُننا چاہتے تھے، جو اُن کی مطلب براری کے لیے موزوں ہو۔

ہندوستان میں علیٰحدگی کا مطالبہ درجہ بہ درجہ پروان چڑھا تھا اور اس کا یہ نقطۂ عروج ایک طویل تاریخی عمل کا نتیجہ تھا۔ کلکتہ میں سب سے بڑا مسئلہ جو ہمارے زیرِ غور رہتا تھا، وہ یہ تھا کہ مستقبل کے پاکستان کو کس طرح چلایا جائے گا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ہندوستان بھر میں بکھری ہوئی تمام مسلم آبادیوں کو توحقِ خود ارادیت مل نہیں سکے گا۔ پھر ان کی خود مختاری سیاسی اور معاشی اعتبار سے قابلِ عمل بھی نہیں تھی۔ اصل توجہ طلب مسئلہ یہ تھا کہ مشرقی اور مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں اور حیدر آباد دکن کی ریاست کو کس طرح مسلمانوں کی قومی ریاست میں ڈھالا جا سکے گا۔ مسلم بنگال ہندو اکثریتی علاقوں میں گھرا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ آسام پر دعویٰ کیے

بغیر بنگال کے مسلمان اپنی علیحدہ ریاست قائم نہیں کر سکتے تھے۔ روزنامہ ''آزاد'' کی محفل کے بعض دانشوروں نے آسام کو ہندوستان میں شامل کرنے کی تجویز مرتب کی جس میں ان کی دلیل یہ تھی کہ درمیان میں مسلم بنگال واقع ہونے کے سبب ہندوستان کے لیے آسام سے زمینی رابطہ ناممکن ہوگا اور آسام میں مسلمان ہی ایک طاقتور ترین گروہ کی حیثیت سے نمایاں تھے۔ ان کے علاوہ اس خطے میں قبائلی آباد تھے یا پھر علاقے کے اصل قدیمی باشندے (Aborigins) اور یہ دونوں گروہ ہندو نہیں تھے۔ انہیں بھی حقِ خود ارادیت ملنا چاہیے تھا، دوسری صورت میں انہیں ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ ویسے انہیں شامل کرنے کا جتنا حق ہندوستان کا تھا، اتنا ہی پاکستان کا بھی تھا۔

آسام کے قبائلیوں کو اگر حقِ خود ارادیت دیا جاتا تو شاید وہ پاکستان ہی کے حق میں ووٹ دیتے اس لیے کہ وہ ہندوؤں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ایک ایسی قابل عمل مشرقی ریاست کا تصور جس میں ہندو اور مسلم ایک مناسب توازن کے ساتھ آباد ہوتے شاید آسام کے ہندوؤں کے لیے بھی قابلِ قبول ہوتا۔ لیکن کانگریس کا رویہ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ ایک طرف تو کانگریس نے تقسیم ہند کی مخالفت میں پورا زور لگا دیا۔ دوسری طرف ہندوؤں کو پروپیگنڈے کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ پاکستان نفرت کی بنیاد پر قائم کیا جانے والا ایک ایسا ملک ہوگا جو نسلی منافرت، مذہبی استحصال اور سیاسی جبر کا آئینہ دار ہوگا۔ کانگریس کے نزدیک ہندوستان کے ہندو اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کا اقلیت کی حیثیت سے رہنا کوئی غیر معقول اور غیر اخلاقی معاملہ نہیں تھا تاہم ایک مسلم اکثریتی ریاست میں ہندوؤں کا اقلیت کی حیثیت سے رہنا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

ہمارے وہ ساتھی جو سمجھتے تھے کہ آسام کو پاکستان کا حصہ بنانا ممکن نہیں ہوگا، ان کا استدلال تھا کہ آسام کے وہ علاقے جو بنگال سے متصل ہیں اور جہاں بنگالی بولنے والے مسلمان اکثریت میں ہیں، انہیں ضرور پاکستان میں شامل کیا جانا چاہیے۔ ان میں سلہٹ، گولپارہ، کاچر اور کوچ بہار شامل تھے۔

جب ہمیں اندازہ ہوگیا کہ آسام کے ہندو پاکستانی شہریت قبول کرنے کے لیے ہرگز

تیار نہیں ہوں گے، تب ہمارے بعض ساتھی اس نتیجے پر پہنچے کہ بنگال اور آسام کے علاقوں میں سے ایسی ریاست تشکیل دی جائے جس میں ممکنہ حد تک مذہبی ہم آہنگی ہو اور جو زیادہ سے زیادہ حقیقی بنیادوں پر استوار ہو۔ دی ایسٹ پاکستان رینا ساں سوسائٹی نے ایک پمفلٹ میں مطالبہ کیا کہ مشرقی بنگال کے بُردوان ڈویژن کو، جہاں ہندو اکثریت میں تھے، مشرقی پاکستان کا حصہ نہیں بنایا جائے۔ لیکن اُسی پمفلٹ میں بہار کے بنگالی بولنے والے اُن علاقوں کو مشرقی پاکستان کا حصہ بنانے کی بات کی گئی تھی جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ ان میں پورنیا کا علاقہ نمایاں تھا۔

یہ وہ مرحلہ تھا جب ہندوؤں نے قیامِ پاکستان کے مطالبے کو سنجیدگی سے جانچنا شروع کر دیا تھا۔ اس موضوع پر مضامین اور کتابوں کی اشاعت شروع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی مطالبہ پاکستان کے تجزیے پر مشتمل کتاب اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی ''ڈوائڈیڈ انڈیا'' دو ایسی کتابیں تھیں جن میں اعداد و شمار کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ پاکستان معاشی اعتبار سے ایک ناقابلِ عمل اور سیاسی اعتبار سے ایک غیر مستحکم ملک ہوگا۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ یہ تمام اعداد و شمار جھوٹے اور متعصبانہ ہیں اور ان کا مقصد تحریک پاکستان کو نقصان پہنچانے کے سوا کچھ نہیں۔ علاوہ ازیں معاشی اور سیاسی اعتبار سے کمزور پاکستان بھی ہمیں قابلِ قبول تھا اور ہم ذہنی طور پر اس کے لیے بھی تیار تھے۔

جواب میں ہمارے اخبار ''آزاد'' نے مختلف حقائق اور اعداد و شمار پیش کرنا شروع کیے۔ ہم روزانہ ایسے اداریے اور مضامین لکھتے جن کا مقصد قیامِ پاکستان کے مطالبے کی مخالفت کرنے والوں کے دلائل کو رد کرنا ہوتا۔ ہمارا گروپ پاکستان کے مطالبے کو نظریاتی اعتبار سے درست ثابت کرنے کی کوشش میں مستقل مصروف رہتا۔ بنگال میں یا بنگال سے باہر، کسی بھی مسلم سیاست دان نے ایسا کوئی مضمون نہیں لکھا تھا جسے امبیڈکر اور راجندر پرشاد کی کتابوں کے جواب میں پیش کیا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ بیشتر مسلم سیاستدان قلم کی مشقت اور دانش ورانہ کاوش کو کارِ لا حاصل گردانتے تھے۔ بنگال میں ابوالہاشم اور سہروردی ایسے سیاستدان تھے جو کتابیں لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ابوالہاشم نے بعد میں سیاست سے ہٹ کر

دیگر موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ بنگال میں زراعت کے موضوع پر لکھی جانے والی کتاب ''دی مین بیہائنڈ دی پلو'' کے مصنف سر عبدالعزیز مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے مگر ہماری بدقسمتی کہ وہ تحریک پاکستان کے اوائل ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب ہمیں اپنے طور پر ہی ساری علمی کاوشیں کرنی پڑیں۔ بنگال میں تحریک پاکستان کے حوالے سے شائع ہونے والی پہلی کتاب مجیب الرحمٰن خان کی تھی جو بنگالی میں تھی اور جس کا نام ''پاکستان'' تھا۔ اس کتاب میں تحریک پاکستان کے حوالے سے بڑے ماہرانہ انداز سے ٹھوس مواد پیش کیا گیا تھا اور بنگال کے مسلمانوں کے معاشی حالات کی بالکل ٹھیک تصویر کھینچی گئی تھی۔ اس میں قیامِ پاکستان کے بعد کی ممکنہ سیاست کا خاکہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ میں ہندوستان کے کسی علاقے سے اس کے مقابلے کی کتاب کی اشاعت سے واقف نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معیار کی کتاب انگریزی میں بھی نہیں لکھی گئی۔ نعمان صاحب کی کتاب ''مسلم انڈیا'' بھی معیاری تھی مگر اس کا موضوع ذرا مختلف تھا۔ اس میں ان تاریخی عوامل کی نشاندہی کی گئی تھی جو بعد میں پاکستان کی بنیاد بنے تاہم اس کتاب میں تحریک پاکستان کا براہ راست کوئی ذکر نہیں تھا۔ میں یہ ساری باتیں یادداشت کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں، امید ہے کہ درست ہی ہوں گی۔

بیشتر سیاسی تحریکیں اسی طرح جنم لیتی ہیں جس طرح قیام پاکستان کی تحریک پروان چڑھی۔ ایک آرزو لاکھوں، کروڑوں افراد کی سانجھی ہوتی ہے۔ پھر ایک مرحلہ پر کوئی مفکر آگے بڑھ کر اس آرزو کو ایک نظریہ کی شکل دیتا ہے، عمومی رجحانات کا جائزہ لے کر حالات کا تجزیہ کرتا ہے اور تحریک کے پروان چڑھنے کی راہ متعین کرتا ہے۔ یہ نظریہ اگر ٹھوس اور حقیقت پسندانہ ہو تو خود بخود ایسی اہمیت اختیار کر جاتا ہے جو تحریک کی بے مثال ترقی اور قبولیت عامہ کا باعث ہو۔

انگلینڈ میں مزدوروں کی تحریک بھی اسی طرح آگے بڑھی تھی۔ انیسویں صدی کے آخری عشروں میں ابھرنے والے فے بین (Fabians) دانشور جنہوں نے مزدور تحریک کا بڑا علمی کام سنبھالا، وہ اس تحریک کے بانی نہیں تھے مگر انہوں نے علمی بنیاد پر تحریک کے محرکات کا جائزہ لیا اور ہم عصر سیاسی افکار کے مطابق اپنے نظریات کو پروان چڑھایا جو مزدور تحریک کی بنیاد

بنے۔ اشتراکیت کی تحریک بھی کچھ اسی طور ابھری اور پروان چڑھی۔ کارل مارکس اور اینجلز نے یہ تحریک شروع نہیں کی تھی۔ البتہ انہوں نے اسے نظریاتی اور فلسفیانہ بنیاد فراہم کی تھی۔ جس کی بدولت مختلف خطوں میں اشتراکی تحریک مقامی حالات اور رجحانات کے مطابق پروان چڑھی۔

کسی بھی تحریک کے لیے علمی اور نظریاتی اساس ناگزیر ہوتی ہے، ورنہ تحریکیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ اس لیے کہ علمی جواز کے بغیر کسی مشترکہ سیاسی مقصد کے لیے لوگوں کے شدید محسوسات آہستہ آہستہ کمزور پڑنے لگتے ہیں۔ اگر رہنماؤں اور مفکروں کی طرف سے دانشورانہ تجزیہ اور تحریک کا علمی جواز سامنے نہ آئے تو لوگ اس کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ کسی بھی تحریک کے لیے دانش ورانہ بنیاد کے حوالے سے یہ توجیہ شاید حد سے زیادہ سادہ محسوس ہو۔ اس پر یہ اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ عوام کی خواہشات اور امنگوں کی کوکھ سے جنم لینے والی تحریک کو دانش ورانہ اور فلسفیانہ جواز کی کیا حاجت؟ ہو سکتا ہے کہ یہ بات کسی حد تک درست ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ بیشتر تحریکوں کی بنیاد تمناؤں پر مبنی اور خاصی کمزور ہوتی ہے، خواہ بظاہر یہ تحریکیں کتنی ہی پُرزور لگتی ہوں۔ جو لوگ ہجوم کی نفسیات سمجھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہجوم میں شامل لوگ کس قدر سطحی اور سیمابی سوچ رکھتے ہیں۔ ان کا جوش اور جذبہ وقتی ہوتا ہے۔ کسی بھی اشتعال انگیز واقعے سے پیدا ہونے والے ہیجان اور جوش و خروش کو تحریک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وقتی جوش و خروش اور اُبال کو تحریک بنانے کے لیے دوررس مقاصد پر مبنی ٹھوس نظریاتی بنیاد فراہم کرنی پڑتی ہے۔

تحریکِ پاکستان کے معاملے میں بھی نظریاتی اور فلسفیانہ اساس ابتدا ہی سے مفقود رہی اور اس حوالے سے بہت کم مواد دستیاب تھا۔ علامہ اقبال کی تحریروں کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو اس موضوع پر مواد نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر علامہ اقبال تو ۱۹۴۰ء میں قراردادِ لاہور کی منظوری سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ یورپ میں قوم پرستی کی جو تعریف متعین کر دی گئی تھی، اس کی بنیاد پر اُٹھائے جانے والے اعتراضات پر ہمارا منہ بند ہو جاتا تھا۔ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کا کیا جواب دیں حالانکہ بات بالکل سادہ تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے دانشوروں نے زحمت ہی نہیں کی تھی کہ اسے علمی انداز میں پیش کریں۔

اُس وقت کے سیاسی ماحول میں دو طرح کے دلائل تھے جن کا ہمیں جواب دینا پڑتا تھا۔

ایک طرف وہ لوگ تھے جو مذہب کی یورپی تعریف کے زیرِ اثر یا سیاسی عناد کی بنیاد پر تکرار کے ساتھ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے جسے سیاست کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ دوسری طرف علمائے کرام کا ایک طبقہ تھا جو تحریکِ پاکستان کی اُسی شد ومد سے مخالفت کرتا جیسے بے دین طبقہ! ان علما کا خیال تھا کہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ کسی احساسِ کمتری کی علامت ہے۔ اُن کے مطابق بھارت سمیت پوری دنیا کو اسلام کا مطیع بنا لینا مسلمانوں کی منزلِ مقصود تھا۔ ایسے میں ہندوستان کے وسیع تر منظر نامے سے علیحدہ ہو کر پاکستان میں پناہ لینا ایک بے معنی سی بات تھی۔ ان کے نزدیک یہ پورا نظریہ ہی اسلام کے تصورِ جہاد کے خلاف تھا۔ علماء کرام تو یہ سب کچھ سادہ لوحی کی بنیاد پر کہہ رہے تھے لیکن کانگریس نے ان باتوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسی نقطے کو بنیاد بنا کر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ابوالکلام آزاد نے قیامِ پاکستان کے مطالبے کے خلاف جو کچھ کہا، وہ خود بھی اس پر یقین رکھتے تھے یا نہیں۔ مگر ہاں، انہوں نے اپنی تقاریر میں اس دلیل کو خوب استعمال کیا۔

سیاست میں مذہب کے مقام سے متعلق مبہم تصورات کو اپنا لینے کا مطلب ہندوستان کو درپیش مشکلات سے آنکھیں پھیر لینے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ہندوستان میں مذہبی تقسیم جڑ پکڑ چکی تھی، جس کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑتے تھے۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو تقسیمِ ہند کے مطالبے پر مجبور کیا۔ حالات اور شواہد نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلمان اور ہندو مل کر نہیں رہ سکتے تھے۔

ہمارے مخالفین اپنی بات منوانے کے لیے ہمیشہ حقائق کو مسخ کر کے پیش کرتے تھے اور اصل مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر معاملات کو تجریدی انداز سے پیش کرتے تھے۔ جو لوگ نظریاتی معاملات کو اولیت دیتے تھے، وہ پاکستان کے قیام کی مخالفت کرنے والوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتے تھے۔ نظریاتی بنیاد پر بات کرنے والے مذہب سے متعلق مغرب کے تصور کی وکالت کرتے تھے، جہاں مذہب کسی فرد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے اور زندگی کے بیشتر معاملات میں یہ پس منظر میں ہی رہتا ہے۔ ہمارا استدلال یہ تھا کہ مغرب کے بہت سے

ممالک بالخصوص برطانیہ میں مذہب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور یہ کہ مذہبی تعلیمات پر حملہ کرنے والے کو سزا سے بچانا ممکن نہیں۔ برطانیہ کی معاشرتی زندگی پر منافقت کے ایسے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں کہ حقائق تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ ۱۶۸۸ء میں جیمز دوم کو اس لیے ملک بدر کر دیا گیا تھا کہ وہ کیتھولک فرقے میں شامل ہو گیا تھا اور اُس وقت کوئی بھی کیتھولک بادشاہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آج کا انگریز بھی مذہب سے بیزاری کا اظہار کرتے نہیں تھکتا لیکن ذرا سوچیے، اگر ان کی ملکہ عیسائیت کو ترک کر کے اسلام، یہودیت، بدھ مت یا کسی اور مذہب کو اپنانے کی بات کرے تو ان کا ردِعمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اسے لازمی طور پر اپنا منصب چھوڑنا پڑے گا۔ نظریاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو انگلینڈ ایک مذہبی ریاست ہی ہے کیونکہ ملک کا بادشاہ چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ بھی ہوتا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں انگریزوں کو اس بات کا قائل کرنا بہت دشوار تھا کہ ہندوستان میں قومیت کی بنیاد مذہب کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ وہ اس پورے معاملے کو صرف اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔

قومیت سے متعلق مسائل کا تجزیہ میں نے ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں ''مارننگ نیوز'' میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں کیا۔ "Tests of Nationhood" کے زیرِ عنوان شائع ہونے والے اس مضمون میں میری کوشش رہی کہ گاندھی کے اس نظریے کو باطل ثابت کیا جائے کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت ہندو مذہب چھوڑ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہوئی ہے، اس لیے اسے علیحدہ قوم کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، یہ تو اسی قوم کا حصہ ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں مذہب کی تبدیلی زندگی کی تبدیلی پر منتج ہوتی ہے۔ ہندو اور مسلمان تمام ہی معاملات میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ ان کا رہن سہن، خوراک، زندگی کے بارے میں نظریہ اور اخلاقی اقدار بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ایسے میں اگر ہندوستانی مسلمان خود کو ایک قوم گردانتے تھے تو اس میں غلط کیا تھا۔ دوسری طرف یورپ میں مذہب کی تبدیلی، بیشتر معاملات میں مذہب کی تبدیلی ہوتی ہی نہیں کیونکہ عیسائیت اور

یہودیت کے بیشتر عقائد میں کچھ خاص تفاوت نہیں پایا جاتا۔ جرمنی، فرانس، انگلینڈ، اسپین اور دیگر یورپی ممالک میں کوئی اگر مذہب تبدیل کرتا بھی ہے تو اُس کی ثقافت تبدیل نہیں ہوتی۔ رہن سہن وہی رہتا ہے، خوراک میں بھی کچھ خاص تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ ایسے میں مذہب کے فرق کو وہاں محسوس ہی نہیں کیا جاسکتا۔ میرا استدلال یہ تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگی میں بنیادی اور جوہری نوعیت کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہندو ازم کو چھوڑ کر اسلام کے دائرے میں آتا ہے تو اسے لازمی طور پر صرف خدا، آخرت اور حساب کتاب سے متعلق عقائد ہی تبدیل نہیں کرنے پڑتے بلکہ ذات پات کے پورے نظام کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے رویے اور کردار میں بنیادی تبدیلی کا رونما ہونا بھی ناگزیر ہے۔ اسلام قبول کرنے والے ہندو کو کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کے طور طریقے بدلنے پڑتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اسے شادی بیاہ اور دیگر سماجی معاملات میں بھی اپنے عقائد اور نظریات میں انقلابی تبدیلی لانی پڑتی تھی۔ مختصر یہ کہ اسلام قبول کرنے پر ہندوؤں کو اپنا ماضی مکمل طور پر ترک کرنا پڑتا تھا۔ زندگی کے ہر معاملے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں نومسلموں کو ماضی سے مزید دور لے جاتی تھیں۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں مذہب کی تبدیلی سے وہ تمام تبدیلیاں رونما نہیں ہوتیں جو ہندوستان میں ہندومت یا اسلام قبول کرنے سے رونما ہوتی ہیں۔

ایک بار پھر وضاحت کرتا چلوں کہ ہم جس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کررہے تھے وہ یہ نہیں تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے قابلِ قبول معیاری سیاسی نظام وضع کیا جاسکتا ہے یا نہیں بلکہ ہم تو ہندو ذہنیت اور تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ جانچ رہے تھے کہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے پاس ہندو اور مسلم بنیاد پر تقسیمِ ہند سے بہتر کوئی راستہ تھا کہ نہیں۔

فریق ثانی کی طرف سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی ختم کرنے کے حوالے سے صرف نظریات، تصورات اور ''اگر یوں ہوتو کیسا ہو'' کی بنیاد پر بات ہورہی تھی۔ صورتحال کا تقاضا تو یہ تھا کہ فوری طور پر کوئی ایسا حل تلاش کیا جاتا جو ہندوستان کو کچرے کے ڈھیر میں تبدیل ہونے سے روکے۔ یہ بنیادی مسئلہ تھا اور اسی کو سب نظرانداز کررہے تھے۔

ہندوؤں کو اندازہ تھا کہ داؤ پر کیا لگا ہوا ہے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ برٹش راج کے ختم ہوتے ہی وہ اپنی مرضی کا سیاسی فارمولا مسلمانوں پر تھوپ دیں۔ اس معاملے میں ہندو مہا سبھا جیسی تنظیموں نے اپنے عزائم کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت کبھی نہیں سمجھی تھی۔ جبکہ کانگریس اپنے عزائم کے اظہار کے معاملے میں نسبتاً محتاط اور وضع دار تھی تاہم چاہتی وہ بھی یہی تھی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں پر ہندوؤں کو برتری حاصل رہے۔ کانگریس میں ایسے عناصر بھی تھے جو اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے مشترکہ قومیت تراشی جاسکتی ہے۔

''مارننگ نیوز'' میں میرا مضمون ان بہت سے مضامین میں سے ایک تھا جو ہم آزاد گروپ کی طرف سے کانگریس اور مہا سبھا کے تصورات کی نفی کے لیے لکھتے رہتے تھے۔ اس دوران معاملات نہ ٹلنے والے تصادم کی راہ پر چل پڑے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو ہمیں اندازہ تھا کہ بحران کو سر اُٹھانے میں اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ انگلینڈ میں ایٹلی (Attlee) کی قیادت میں لیبر پارٹی کی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ اب جبکہ انگریز کے پاس جنگ کے خاتمے کے بعد تعمیر نو کے مسئلوں سے نمٹنے کے لیے وقت بھی تھا، اس نے نیک نیتی کے ساتھ ہندوستان کے مسئلے کے حل کے لیے کوششوں کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۰ء میں جنگ کے دوران کرپس (Cripps) مشن کی طرف سے جو تجاویز پیش کی گئی تھیں، انہیں خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی تھی۔ ان تجاویز کے حوالے سے ہندو اور مسلمان دونوں ہی تحفظات کے حامل تھے۔ بہر حال مسلمانوں کے لیے کرپس مشن کی تجاویز اس اعتبار سے خوش آئند تھیں کہ اس میں پہلی بار سرکاری طور پر ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے وجود کا اعتراف کیا گیا تھا۔ گو کہ کرپس کا تعلق لیبر پارٹی سے تھا مگر اس وقت وزیر اعظم کنزرویٹو پارٹی کے ونسٹن چرچل (Winston Churchill) تھے اور جنگ کے خاتمے پر یہ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ لیبر پارٹی آزادئ ہند کے حوالے سے کرپس تجاویز پر قائم رہے گی یا نہیں۔ بہر حال مستقبل کے حوالے سے ہمیں ایک ہیجان انگیز اور غیر یقینی صورتحال کا سامنا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب مشرقی ہندوستان میں پاکستان کے قیام کے حوالے سے تقریباً اتفاق

رائے ہو چکا تھا۔ دوسری طرف ہندو اکثریت والے صوبوں بہار، یوپی، سی پی اور بمبئی وغیرہ میں بھی مسلمان قیامِ پاکستان کے مطالبہ پر ہم آواز ہو چکے تھے۔ تاہم مولانا ابوالکلام آزاد اور آصف علی جیسی نام نہاد قوم پرست شخصیات پاکستان کے قیام کی مخالفت اور ہندوستانی قومیت کی وکالت کرتی رہیں۔ البتہ ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء میں قیامِ پاکستان کے ان مخالفین کی آواز یکسر دب کر رہ گئی۔ لیکن مسلم اکثریتی صوبوں کی حکومتوں نے ہمارے لیے ٹھیک ٹھاک مشکلات کھڑی کیں۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے، صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان کی قیادت میں خدائی خدمات گار تحریک نے اور سندھ میں مختلف گروپوں نے عوام کی امنگوں کو نظر انداز کر کے تحریکِ پاکستان کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے پنجاب اور سندھ میں تو کامیابی حاصل کر لی مگر صوبہ سرحد میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ خان عبدالغفار خان اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب لوہے کے چنے ثابت ہوئے۔ یہ ناکامی ہمارے لیے خاصی مایوس کن تھی۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات نے بنگال میں اے کے فضل الحق کو سیاسی منظر سے غائب کر دیا۔ ۱۹۴۱ء میں وائسرائے کی وار کونسل میں اپنی رکنیت کے مسئلے پر قائداعظم سے اختلافات کے بعد اے کے فضل الحق نے خود کو مسلم لیگ سے الگ کر لیا تھا۔ وہ گاہے گاہے قائداعظم کے خلاف گستاخانہ بیانات جاری کرتے رہتے تھے۔ اس سے قائداعظم کا تو کیا بگڑتا البتہ خود وہ مسلم عوام کی نظروں سے گرتے چلے گئے۔ بنگال کے مسلمان قیامِ پاکستان کے مطالبے پر کس حد تک پرعزم تھے، اس کا اندازہ یہاں کے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کے نتائج سے لگایا جا سکتا تھا۔ اے کے فضل الحق گزشتہ نصف صدی سے بنگال کے بے تاج بادشاہ رہے تھے۔ سیاسی جماعتوں کی تشکیل ان کے گرد گھومتی تھی۔ ہر نئی پارٹی پر وہ اپنی پسند کا لیبل اور نظریہ چسپاں کر لیتے تھے۔ کسی بھی عہدہ کو اپنا پسندیدہ نام دے کر اس پر مسلط ہو جاتے تھے۔ یہ سلسلہ عشروں سے جاری تھا۔ جب مسلم لیگ ایک طے شدہ آئیڈیل اور پروگرام کے ساتھ نمودار ہوئی تو اے کے فضل الحق کا سنگھاسن ڈول گیا۔ عوام نے محسوس کر لیا کہ ان کی سیاست ان کی ذات کے گرد گھومتی ہے۔ ایسے میں مسلم لیگ کی شمع کے گرد پروانوں کا جمع ہو جانا حیرت کی بات نہ تھی۔

لوگوں نے اے کے فضل الحق کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ ان کی بڑی شکست تھی۔

اے کے فضل الحق کی شکست کا ذمہ دار بنگال کا کوئی سیاست دان نہیں تھا۔ سیاسی اہلیت میں کوئی ان کے مقابل نہ تھا۔ اگر مسلم لیگ اور قائداعظم نہ ہوتے تو ان کا سیاسی کھیل کامیابی سے جاری رہتا۔ قائداعظم کی وفات اور لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ہی اے کے فضل الحق کو دوبارہ ابھرنے کا موقع مل سکا، اس لیے کہ مسلم لیگ میں ان کا ہم پلہ کوئی سیاست دان نہیں تھا اور خود پارٹی سنگین اختلافات کا شکار تھی۔ اے کے فضل الحق کا زوال اور دوبارہ عروج، بنگال کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا زوال اُس عبوری دور کی نشاندہی کرتا ہے، جب بنگالی مسلمان خود کو روایتی سیاست کے منحوس بندھن سے آزاد کر سکے تھے جبکہ ان کا دوبارہ عروج اس امر کا غماز تھا کہ مسلمان شرکی قدیم قوتوں سے درحقیقت جان نہیں چھڑا سکے!

اس طرح سیاسی پلیٹ فارم مسلم قوم پرستوں سے پاک ہو گیا۔ اب آل انڈیا مسلم لیگ بلاشرکت غیرے مسلمانوں کی نمائندگی کی دعویدار تھی۔ اس نے اب قیامِ پاکستان کا مطالبہ دوٹوک انداز سے پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے کہ بھارت کے مسلمانوں کی اکثریت اس مطالبے کی پشت پر تھی۔ اس مطالبے کو نظرانداز کرنا آسان نہیں رہا تھا۔ انگریز بھی اس امر کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ پاکستان کے قیام کے مطالبے کی راہ میں کھڑی کی گئی دیواریں گرتی جارہی تھیں اور قیامِ پاکستان کے خلاف دیے جانے والے دلائل غیرموثر ہوتے جارہے تھے۔ ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ اب ہم اپنی جدوجہد کے نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس دوران ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ برطانیہ کی لیبر حکومت نے لارڈ ویول (Lord Wavel) کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mount Batten) کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا جو نسبتاً کم عمر اور خاصے متحرک تھے۔ برطانیہ کے شاہی خاندان سے بھی ان کے اچھے مراسم تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن کی ناکامی لارڈ ویول کی برطرفی کا سبب بنی تھی۔

ہندوستان میں برٹش راج کی تاریخ میں کیبنٹ مشن ایک نمایاں مگر شرمناک باب ہے۔ یہ برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کو ایک انتظامی اکائی کے طور پر برقرار رکھنے کی آخری سنجیدہ

کوشش تھی جو کانگریس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ کانگریس نے ہر اس تجویز کو مسترد کیا جس میں ذرہ برابر بھی مسلمانوں کو منانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ خود کیبنٹ مشن نے بھی مسلم لیگ کے ساتھ معاملات کرنے میں دھوکا اور فریب سے کام لیا۔ اگر کیبنٹ مشن کا رویہ مخلصانہ ہوتا تو چند مسلم رہنما یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ کر کے مسلمان اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہے ہیں۔ کیبنٹ مشن کے رویے نے مسلمانوں کو یقین دلا دیا تھا کہ انگریز اور ہندو ان کے خلاف متحد ہو چکے ہیں۔ اس طرح مسلم لیگ کے موقف کے حوالے سے بعض مسلمانوں کے ذہن میں جو تھوڑے بہت شکوک وشبہات تھے، وہ بھی رفع ہو گئے۔

سب سے پہلے تو وائسرائے کونسل کی تشکیل کا قضیہ کھڑا ہوا۔ لارڈ ویول نے اعلان کیا تھا کہ وہ اُن جماعتوں کے ساتھ مل کر اپنی کونسل تشکیل دیں گے جنہوں نے ۱۶ رمئی ۱۹۴۶ء کے کیبنٹ مشن کے منصوبے کو قبول کر لیا تھا۔ گو کہ انہوں نے ساری جماعتوں سے تعاون طلب کیا تھا تاہم انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنے منصوبے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے، چاہے چند جماعتیں کونسل میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ بھی کر لیں۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کانگریس ہی ان سے تعاون نہیں کر رہی تو وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ انہوں نے اپنا منصوبہ ترک کر کے مسلم لیگ اور دوسری چھوٹی جماعتوں کو شدید مایوسی سے دوچار کیا۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے انگریزوں کے اپنے اخبار ''اسٹیٹس مین'' نے بھی لارڈ ویول کے اس یوٹرن پر شدید احتجاج کیا اور وائس رائے کے اس طرح زبان سے پھر جانے کو بدعہدی سے تعبیر کیا۔

دوسرے کیبنٹ مشن نے ۱۶ رمئی کو جس منصوبے کا اعلان کیا تھا، اس میں گروپنگ کلاز کے حوالے سے تنازع پیدا کر دیا گیا تھا۔ کیبنٹ مشن کے اصل منصوبے کے مطابق اے، بی اور سی گروپ سے تعلق رکھنے والے صوبوں میں سے کوئی بھی یونین سے علیحدگی کا اختیار استعمال کر سکتا تھا۔ ابتداً کانگریس نے یہ تجویز منظور کر لی تھی لیکن جیسے ہی مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کا منصوبہ قبول کیا، کانگریس نے کہنا شروع کر دیا کہ جو صوبہ ایک بار گروپ میں شامل ہو جائے گا، وہ علیحدہ ہونے کا اختیار استعمال نہیں کر سکے گا۔ یہ تعبیر کیبنٹ مشن کی تجویز کی زبان اور خود مشن،

کی طرف سے کی جانے والی تشریح کے خلاف تھی۔ کانگریس اپنی رائے پر مُصر رہی اور ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ انگریزوں نے آخری کوشش کے طور پر دسمبر ۱۹۴۶ء میں لندن میں کانفرنس طلب کی جس میں محمد علی جناح اور جواہر لعل نہرو کے علاوہ سکھوں کی جانب سے سردار بلدیو سنگھ نے بھی شرکت کی۔ برطانوی حکومت نے مسلم لیگ کا نقطۂ نظر تسلیم کر لیا مگر کانگریس نے اپنی ہٹ دھرمی برقرار رکھی۔ یوں یہ کانفرنس بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

طے شدہ منصوبہ پر عمل کرنے کے بجائے حکومت نے اسے ترک کر کے مسلمانوں کو ایک بار پھر دھوکا دیا۔ لیکن یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لیے اخلاقی فتح ثابت ہوا۔ اب ملک کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی ذمہ دار صرف کانگریس تھی۔ مسلم لیگ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ پرامن تصفیے کے لیے پاکستان کے مطالبے کو بھی پس پشت ڈالنے کے لیے تیار ہے مگر اس پیشکش کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

کانگریس نے کیبنٹ مشن کے گروپنگ کے منصوبے کو قبول کرنے سے شاید اس لیے انکار کیا کہ اگر بنگال اور آسام نے علیحدگی کا اختیار استعمال کرتے ہوئے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا تو بھارت کا پورا مشرقی بازو ہی اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ان صوبوں میں مسلمانوں کو آبادی میں نمایاں برتری حاصل تھی۔ کانگریس نے ملک کو داؤ پر لگانے کے بجائے مسلمانوں کی جانب سے ملک کی تقسیم کا مطالبہ تسلیم کر کے ایک ''چھوٹی برائی'' کو گلے لگایا۔ اس صورت میں صرف مسلم اکثریتی علاقوں کو ہی الگ ہونا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کانگریس نے اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا ہوگا کہ اگر برطانوی حکومت نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ تسلیم کر لیا تو بنگال کی تقسیم کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ کانگریس کا رویہ بنگال کے مسلمانوں کے لیے خاصا تعجب خیز تھا۔ اب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ کانگریس کو بھارت کی علاقائی وحدت و سالمیت کی اتنی فکر نہیں تھی، جتنی فکر مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی طور پر غیر مستحکم کرنے کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ مشرقی بھارت میں صوبوں کا گروپ الگ ہونے کا فیصلہ کرتا یا شاید نہ بھی کرتا۔ مگر مسلمانوں پر کانگریس کو اس قدر بے اعتمادی تھی کہ اس نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔

یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ آنے والے سالوں میں ہمارے دشمنوں

نے مسلم لیگ پر ہٹ دھرم اور ضدی ہونے کا الزام لگایا حالانکہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے ذرا پہلے کانگریس نے جو کردار ادا کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اس کے باوجود عوامی لیگ اور اس کے حامیوں نے بنگال کے مسلمانوں پر الزام لگایا کہ انہوں نے بنگالیوں کو تقسیم کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔

بہر حال، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی بحیثیت وائسرائے آمد نے معاملات میں تیزی پیدا کر دی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے بحران سے کسی نہ کسی طرح جان چھڑانا چاہتی ہے اور کوئی قابلِ قبول حل نہ نکلنے کی صورت میں وہ اقلیتوں کو بھیڑیوں کے سپرد کر کے نکل جائے گی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے ہندو اور مسلم قائدین سے بات چیت کی۔ انہوں نے پرامن حل کی ضرورت پر زور دیا اور ہندوستان کو متحد رکھتے ہوئے کسی حل تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ لیبر پارٹی کی حکومت ہندوستان میں برطانوی راج جلد از جلد ختم کرنا چاہتی ہے۔ بات چیت کے اس دور کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی حکومت کو رپورٹ پیش کرنے وطن چلے گئے۔ جبکہ ہم دم سادھے ہندوستان کی آزادی کے ڈرامے کے اگلے سین کا انتظار کرتے رہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی
تحریک پاکستان کے نامور رہنما

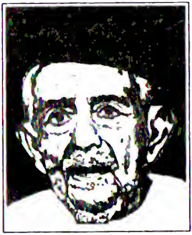

(مولانا) محمد اکرم خان
مشرقی بنگال میں تحریک پاکستان کے نامور رہنما

قیامِ پاکستان کے اسباب

۱۹۴۶ء کے دوران، مہینہ مجھے یاد نہیں، مولانا محمد اکرم خان نے مولانا محمد علی جوہر کے مشہور انگریزی اخبار ''کامریڈ'' کے حقوق خرید کر اسے دوبارہ شائع کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ مجھ سے کہا گیا کہ اسلامیہ کالج کی ملازمت سے استعفٰی دے کر ''آزاد'' کے اسٹاف میں شامل ہو جاؤں اور ''کامریڈ'' کو چلانے کی ذمہ داری سنبھالوں۔ پیشکش خاصی پرکشش تھی۔ تاہم میں نے سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ صحافت کو فری لانسر کے طور پر ہی برقرار رکھ کر اسلامیہ کالج میں ملازمت جاری رکھی جائے۔ میں اُس وقت تک طے نہیں کر پایا تھا کہ مجھے بالآخر کرنا کیا ہے، تاہم علمی زندگی کو مکمل طور پر ترک کرنے میں مجھے کوئی کشش نظر نہیں آ رہی تھی۔ کسی بھی نوجوان کے لیے صحافت کا شعبہ غیر معمولی کشش کا حامل ہوتا ہے جبکہ سرکاری ملازمت بہت سی پابندیوں کا نام ہے۔ صحافی نسبتاً آزاد بلکہ خاصی مراعات یافتہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود میں نے علم کی دنیا میں آگے بڑھنے کی خواہش اور لگن اپنے دل میں موجود پائی اور اسے ترک کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہ ہو سکا۔

میں نے اسلامیہ کالج کی ملازمت تو نہیں چھوڑی تاہم اس بات کے لیے ضرور آمادہ ہو گیا کہ جو کچھ بھی میں اس اخبار کے لیے کر سکوں گا، کروں گا۔ اس کے اجرا کے بعد سے ستمبر ۱۹۴۷ء میں کلکتہ چھوڑنے تک میں ''کامریڈ'' کی درپردہ ادارت کرتا رہا۔ کلکتہ اس لیے چھوڑنا پڑا کہ پاکستان کے قیام کے بعد میرا تبادلہ ایم سی کالج، سلہٹ ہو گیا تھا۔

یہ بات بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ کامریڈ کی پالیسی تین بنیادی نکات پر مشتمل تھی۔ اول، پاکستان کے قیام کی تحریک میں بھرپور معاونت کرنا۔ دوم، انگریزی بولنے اور پڑھنے والوں کو غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات سے آگاہ کرنا اور سوم، برصغیر کے مسلمانوں کے حالات بیان کر کے اسلامی دنیا میں ان کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا کرنا۔ اداریہ میں لکھتا

تھا۔ جبکہ ثانوی اداریہ مجیب الرحمٰن خان لکھتے تھے جن کا نام مدیر کی حیثیت سے شائع ہوا کرتا تھا۔ ان کی انگریزی بہت اچھی تو نہیں تھی مگر قواعد و انشا کی غلطیاں اُن کی سیاسی پختگی کے پردے میں آسانی سے چھپ جایا کرتی تھیں۔ اسلامیہ کالج کے پرنسپل آئی ایچ زبیری نے قلمی نام سے کالم لکھنے کی پیشکش کی۔ انہیں کالم لکھنے کی تحریک یقینی طور پر الطاف حسین صاحب سے ملی ہوگی جو اسٹیٹس مین (کلکتہ) میں "Through Muslim Eyes" کے عنوان سے شاہد کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔ انگریزی پڑھنے والے طبقے میں یہ کالم بہت پسند کیا جاتا تھا۔ انگریزی داں دانشوروں کے لیے یہ کالم ٹانک کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر لکھتے تھے۔ نظریہ پاکستان اور قائداعظم کے قائدانہ کردار پر ان کا یقین غیر متزلزل تھا۔ ان کی تحریر بہت سے ابہام دور کر دیتی تھی اور پاکستان کے آدرش پر یقین رکھنے والوں کو یہ کالم پڑھ کر نیا حوصلہ ملتا تھا۔ ڈاکٹر آئی ایچ زبیری نے ''شمشیر'' کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ تجربہ علمی اور دانشورانہ اعتبار سے ناکام رہا۔ آئی ایچ زبیری کی انگریزی ناپختہ تھی۔ ان کے خیالات ٹھوس اور متاثر کن نہیں تھے۔ ثقافتی موضوعات پر ہمیں کبھی کبھی ابو رشد متین الدین کی جانب سے بھی مضامین موصول ہوا کرتے تھے۔ شفیع حسین میرے پڑوسی اور کالج کے طالب علم تھے۔ انہوں نے سائنس کے موضوع پر باقاعدگی سے کالم لکھنا شروع کیا۔

''کامریڈ'' کو بھرپور لگن کے حامل اور خدمت کے جذبے سے سرشار کارکن میسر تھے۔ جس کی وجہ سے یہ ہفت روزہ بہت جلد اُس دور میں پروان چڑھنے والے رجحانات کا ترجمان بن گیا۔ سیاسی واقعات کی تعبیر و تشریح کا بوجھ زیادہ تر مجھ ہی پر آن پڑا جبکہ میں ''آزاد'' کے لیے بھی مرکزی کالم نگار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ میں اس وقت چونکہ غیر معمولی توانائی اور جذبے سے سرشار اور نوجوان تھا، اس لیے کام کی زیادتی سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ کام میں بیزاری یا تھکن اس لیے محسوس نہیں ہوتی تھی کہ سیاسی ماحول میں غیر معمولی تیزی تھی، ہر گزرتا ہوا دن کوئی نہ کوئی تبدیلی لے کر نمودار ہوتا تھا۔ قیامِ پاکستان کی تحریک رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ ہم بھی آگے بڑھ رہے تھے۔ کام کرنے کی لگن تو تھی ہی، دوسری طرف ماحول بھی ہمیں مہمیز دیتا تھا۔ بقول ولیم وڈز ورتھ (William Wordsworth) جوانی کی ہر صبح ہمارے لیے جنت کا پیغام لے کر نمودار ہوتی تھی۔ وڈز ورتھ نے انقلابِ فرانس کو نوجوان کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ ہمارے

لیے بھی ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے واقعات انقلاب سے کم نہ تھے۔ خواب ہماری زندگی میں ہی تعبیر بننے والا تھا اور ہمارے لیے یہ سب کچھ ایسا سنسنی خیز تھا کہ سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم گویا ایک لہر پر سوار تھے۔ یہ خدشہ ذہنوں میں ضرور تھا کہ کہیں جہاز کسی چٹان سے نہ ٹکرا جائے۔ مگر پھر جب ہندوستان کے آخری وائس رائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ برطانوی سلطنت کسی بھی طور ۱۹۴۸ء کے بعد ہندوستان میں نہیں رہے گی، تب ہم سب کو یقین ہو گیا کہ اب منزل دور نہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے الفاظ نے قیام پاکستان کی راہ سے آخری کانٹے بھی دور کر دیے تھے۔

نامناسب ہوگا اگر اُن سلسلۂ واقعات کا ذکر نہ کروں جو حقیقت میں قیامِ پاکستان کا سبب بنے؟ ۱۹۴۶ء میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوا جس نے مسلمانوں کو باور کرا دیا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں بچے گا۔ ۱۶ راگست ۱۹۴۶ء کو کلکتہ میں فسادات شروع ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ پورے مشرقی ہندوستان پر محیط ہو گیا۔ انہیں صرف فساد کہنا درست نہ ہوگا، یہ تو خانہ جنگی تھی۔ مختلف مقامات پر ہزاروں افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔ ہزاروں مکانات نذرِ آتش ہو گئے۔ درجنوں دیہات صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ بہار سے کلکتہ تک قتل و غارت کا جو بازار گرم ہوا، اس نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پر کیا کہے۔

انیسویں صدی کے اوائل سے فرقہ وارانہ فسادات برصغیر کی زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ ہاں ۱۹۴۶ء میں جو کچھ ہوا، اس نے تو سب کو حیران اور پریشان کر دیا۔ اتنے وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کبھی نہیں ہوئے تھے۔

۱۶ راگست ۱۹۴۶ء کو کلکتہ میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان کے ردعمل کے طور پر پورے مشرقی ہندوستان میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا اور اگست ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں، قیام پاکستان کے وقت، ہولناک ترین فسادات ہوئے۔ مسلم لیگ نے لارڈ ویول کی جانب سے ایلیز یا کونسل کے قیام کے وعدے سے مکر جانے پر احتجاج کے لیے ۱۶ راگست کا دن مقرر لیا۔ اس موقع پر ملک بھر میں جلسوں کا اہتمام کیا گیا، جن کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ آئینی بالادستی کے تصور پر عمل پیرا رہنے کا اب کوئی فائدہ نہیں اور اب راست اقدام کا وقت آ چکا ہے۔ گو یہ دن سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کے لیے تو نہیں چنا گیا تھا مگر مسلم لیگ کی طرف سے آئینی جدوجہد ترک کر کے راست اقدام شروع کرنے کا کھلم کھلا اعلان کا دن تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی میں اس واضح تبدیلی کو ہندوؤں نے قدرے خوف زدگی کی نظر سے دیکھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ پاکستان کا قیام اب ناگزیر ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو علیحدہ ریاست کے قیام کے مطالبے سے باز رکھنے کے لیے ہندو جو کچھ بھی کر سکتے تھے، وہ انہوں نے کرنا شروع کیا۔ مسلمانوں کی جانب سے ۱۶ اراگست کو ہڑتال کا اعلان اور ہندو، سکھ اور دیگر غیر مسلموں پر اس ہڑتال میں شریک ہونے کے لیے دباؤ ڈالنا غلطی تھی۔ یہ کلکتہ کے رہنماؤں کا فیصلہ تھا اور مرکز میں مسلم لیگ کے پالیسی بنانے والوں کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۱۶ اراگست کو ہڑتال کے موقع پر جلسے میں شرکت کے لیے میں پیدل کلکتہ ''میدان'' گیا کیونکہ اُس دن ٹرامیں بند تھیں۔ سڑکوں پر ٹریفک بھی برائے نام تھی۔ پارک اسٹریٹ عبور کرنے تک مجھے کہیں کوئی گڑبڑ دکھائی نہیں دی۔ گلیاں سنسان ضرور تھیں تاہم کہیں تشدد کے کسی واقعے کا کوئی نشان نہ ملا۔ جب میں چورنگی کے علاقے میں پہنچا تو دیکھا کہ ہڑتال کو ناکام بنانے کے لیے سکھوں نے دکانیں کھول رکھی ہیں۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بوبازار، ہیریسن روڈ اور دھرم تلہ میں پرتشدد واقعات رونما ہو چکے تھے اور کئی ہلاکتیں بھی واقع ہوئی تھیں۔ ہلاک ہونے والوں کی تعداد کسی کو معلوم نہ تھی۔ فضا میں خوف نمایاں تھا۔ دور افتادہ علاقوں سے لوگ جلسے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ تشدد کا دائرہ وسعت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ جلسے میں زیادہ حاضری کی توقع نہ تھی۔ چند تقاریر ہوئیں جو واجبی سی تھیں۔ اس کے بعد جلسہ ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے ہمیں ہدایت کی گئی کہ غیر مسلموں کے حملوں سے بچنے کا اہتمام کریں۔

میں نے لوئر سرکلر روڈ کے راستے براڈ اسٹریٹ پر واقع اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ٹولہ شراب کی دکان کو تاراج کر رہا ہے۔ کچھ لوگ لوٹ مار کرتے بھی دکھائی دیے۔ جس کے جو ہاتھ لگا، لے بھاگا۔ میں نے سوچا کہ ایسے کسی بھی ٹولے کا حصہ بننے یا ان ٹولوں میں گھر جانے سے بہتر ہے کہ جلد از جلد اپنی جگہ تک پہنچا جائے۔

پارک سرکس کا علاقہ مجھے کچھ پُرسکون دکھائی دیا۔ وہاں تشدد برائے نام تھا اور یقین تھا کہ بہت جلد صورت حال مکمل طور پر معمول پر آ جائے گی۔

اگلے چار دن تک مختلف علاقوں سے تشدد، قتل و غارت اور لوٹ مار کی اطلاعات پہنچتی رہیں۔ ۱۷ اراگست کو کوئی اخبار شائع نہیں ہو سکا، بلکہ اس کے بعد بھی تین دن تک کوئی اخبار منظر عام پر

نہیں آیا۔ ۲۱ راگست کو ایک صاحب کاغذ کے ایک جانب چھپا ہوا اخبار لائے۔ یہ "اسٹیٹس مین" تھا۔ اخبار کی انتظامیہ بمشکل اِس شکل میں اخبار شائع کر سکی تھی۔ اس میں جو خبریں شامل کی گئی تھیں، وہ پڑھ کر ہم سب میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ چار دنوں میں کم وبیش دس ہزار افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ اخبار کے مطابق یہ محض ایک محتاط اندازہ تھا، درحقیقت کتنے افراد کو قتل کیا گیا تھا، یہ جاننا بہت مشکل تھا۔ پورا کلکتہ شہر پاگل پن کی حدیں عبور کر چکا تھا۔ تہذیب اور شائستگی نے چار دن تک شہر اور شہریوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ سب کچھ بھول کر لوگوں نے قدیم دَور کے غیر مہذب اور سفاک رویوں کو اپنا لیا تھا۔ مرد، خواتین، بچے۔۔۔ کسی کو بھی نہیں بخشا گیا تھا۔ ہندو اکثریت کے علاقوں میں پڑھے لکھے نوجوانوں پر مبنی ٹولوں نے پڑوسیوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور املاک کو آگ لگانے کے بعد بچوں کو اس میں پھینک دیا! یہ سب کچھ ناقابلِ یقین اور ناقابلِ تصور تھا مگر افسوسناک حد تک حقیقت پر مبنی تھا۔ خوف، نفرت، انتقام اور سیاسی رقابت نے کلکتہ کے رہنے والوں کو عارضی طور پر حیوانات میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کی بہت بھیانک فصل ہمیں کاٹنی پڑی۔ پولیس نہ صرف یہ کہ اس صورت حال پر قابو پانے میں ناکام رہی بلکہ قتل وغارت میں شریک ہوئی۔ پولیس کے ہندو اور مسلم اہلکاروں نے اپنی اپنی کمیونٹی کا ساتھ دیا۔

چار دن کی قتل وغارت اور ہنگامہ آرائی کے بعد کلکتہ واضح طور پر ہندو اور مسلم علاقوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور دونوں کی ایک دوسرے تک رسائی خاصی مشکل ہو گئی تھی۔ قتل وغارت کے کئی ہفتوں بعد تک کسی نہ کسی سطح پر سفاکی کا مظاہرہ جاری رہا۔ جو لوگ غلطی یا مجبوری سے کسی انجانی سڑک پر چلے جاتے تھے، کسی "غیر" گلی میں قدم رکھتے تھے، وہ اپنی منزل کھو بیٹھتے تھے۔ ان کی لاشیں دو تین دن بعد کسی نالے یا مین ہول سے ملتیں۔

ہندو پریس مکمل ہم آہنگی کے ساتھ تمام واقعات کا ذمہ دار صرف مسلم لیگ کو ٹھہرانے پر تُلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کا قصور صرف یہ تھا کہ بنگال پر مسلمانوں کی اکثریت والی حکومت تھی۔ یہ ایک ایسا جرم تھا جسے کسی بھی حالت میں معاف نہیں کیا جا سکتا تھا!

ابھی بنگال میں فسادات کی آگ سرد نہیں پڑی تھی کہ بہار میں مسلمانوں کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دیہی علاقوں میں مسلح ہندو ٹولے مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں مصروف ہو گئے۔ ناقابلِ بیان حد تک سفاکی کا مظاہرہ کیا گیا۔ بہت سے علاقوں میں لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ

اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر والوں کو قتل ہوتے دیکھیں۔ والدین تلقین کرتے تھے کہ اُن کے قتل ہو جانے کی صورت میں بچے خودکشی کرلیں! مختلف اندازوں کے مطابق کم و بیش پچاس ہزار افراد قتل کیے گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ تھی۔

قتل و غارت کے اس سلسلے کو روکنے کی کوشش کرنے کے بجائے کانگریس نے دوقومی نظریے کی تبلیغ اور پاکستان کے قیام کے مطالبے کے حوالے سے مسلم لیگ پر تنقید کا سلسلہ جاری رکھا اور جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اس کے لیے مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ گاندھی جی نواکھالی گئے جہاں بہار کے مسلم کش فسادات کے بعد چھوٹا سا فساد ہوا تھا۔ بہار کے مسلمانوں کی چیخیں اور سسکیاں ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔ بہار میں مارے جانے والے تمام کے تمام مسلمان تھے اور قاتل ہندو۔ بہار میں فسادات کی نذر ہونے والوں کی تعداد پچاس ہزار تک بتائی گئی۔ نواکھالی میں سو دو سو افراد مارے گئے۔ پچاس ہزار کی موت گاندھی جی کو متاثر نہ کرسکی۔ محض سو دو سو ہندوؤں کی ہلاکت پر وہ خبرگیری کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ معاملات کو جانچنے کا ان کا اپنا پیمانہ تھا!!

فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ دراصل برسوں سے پنپنے والی سول نافرمانی کی تحریک کا ''ہراول دستہ'' ثابت ہوا۔ حالات کی روش نے ایک عجیب تضاد اور مخمصے کو جنم دیا۔ معاملات جس قدر بگڑتے گئے، کانگریس سمجھوتے کے بجائے تصادم کی راہ پر گامزن ہوتی چلی گئی۔ ملک ٹوٹتا جا رہا تھا جبکہ کانگریس بضد رہی کہ ملک ناقابلِ تقسیم ہے۔ گاندھی جی نے کہا کہ ملک کی تقسیم ایک ایسا گناہ ہوگا جسے وہ کبھی فراموش یا معاف نہیں کر پائیں گے۔

کانگریس کی قیادت جو بیانات دے رہی تھی، اس سے ہم پریشان تو ہوئے مگر کچھ زیادہ نہیں۔ یہ سب ہمارے لیے مکمل طور پر غیر متوقع نہیں تھا۔ ہمیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ جو کچھ ناگزیر تھا، اسے واقع ہونے سے روکنے کے لیے کانگریس بس ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ کانگریس جو کچھ کر رہی تھی، اس کے نتائج کے بارے میں لاتعلق نہیں رہا جا سکتا تھا۔ ہمیں اندازہ تھا کہ اگر تشدد اور فسادات کی روک تھام نہ کی گئی تو پورا ملک قتل و غارت کی نذر ہو جائے گا۔ مگر کانگریس کو بظاہر اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ ہم آنے والے سال دو سال کے بارے میں پرامید بھی تھے اور تشویش میں مبتلا بھی۔ اِسی ماحول میں ۱۹۴۶ء ختم ہوا۔

سولہواں باب

وہ صبح ایک نعمت تھی جس میں ہم زندہ تھے!

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے عندیہ دیا کہ وہ تاجِ برطانیہ کو مشورہ دینے جا رہے ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو ہندوستان سے نکل جانا چاہیے۔ اس طرح انہوں نے فریقین پر واضح کر دیا کہ وہ عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ آزادیٔ ہند اب ناگزیر ہو گئی ہے اور اس میں تاخیر ممکن نہیں۔ انہوں نے معاملات کو تیزی سے نمٹانا شروع کر دیا۔ گو کہ اُن کے کام کرنے کی لگن اور توانائی متاثر کن تھی، مگر ان کی بے صبری خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی۔

برطانیہ میں مسٹر ایٹلی کی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ برطانیہ ہندوستان سے ۱۹۴۸ء تک نکل جائے گا۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے حیرت انگیز طور پر ایک سال پہلے ہی بوریا بستر لپیٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسٹر ایٹلی کے گماشتۂ خاص ہونے کی حیثیت سے ماؤنٹ بیٹن نے آزادی سے متعلق امور کو تیزی سے نمٹانا شروع کیا۔ ان کی ذہنی قوت اور تیزی متاثر کن تھی، مگر یہ تیزی تشویش ناک بھی تھی۔ انتظامی معاملات میں بلاوجہ کی تیز رفتاری عملاً بے نتیجہ اکھاڑ پچھاڑ ہی ثابت ہوتی ہے۔ کسی بھی فیصلے پر عمل سے قبل، اس کے ممکنہ مضمرات کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی، نہ یہ اندازہ ہو پاتا ہے کہ انتظامی امور میں پیدا ہونے والی کوئی خرابی کتنے دنوں میں دور کی جا سکے گی۔

بعد میں پنجاب اور ارد گرد کی چھوٹی ریاستوں میں ہونے والی نسل کشی اور قتلِ عام کے واقعات کے تسلسل نے ثابت کر دیا تھا کہ لاکھوں جانوں کے زیاں کا سبب انگریزی حکومت کی ظالمانہ بے حسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دوسری فروگزاشتیں اپنی جگہ، اس بلاوجہ کی تیزی اور اکھاڑ پچھاڑ نے انتظامیہ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں اور نظمِ عامہ تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سلسلے میں ہونے والی تنقید سے جان چھڑانے کے لیے حکومت کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ تم نے آزادی اور تقسیم کا مطالبہ کیا ہے، اب اس کے نتائج تم ہی بھگتو۔ ہم تو تمہارے مطالبے پر آزادی کے معاملات کو تیزی سے پایۂ

تکمیل تک پہنچا رہے ہیں۔ (حکومت نے آزادی کا جو نظام الاوقات مقرر کیا، اس پر اس خیال سے تنقید ہوتی ہی نہیں تھی کہ کہیں تنقید کرنے والے پر اینٹی انڈیا ہونے کا لیبل چسپاں نہ کر دیا جائے)۔

اس تاریخی موڑ پر (آخری برطانوی وائسرائے ہند) لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ برطانیہ ہر حال میں ۱۵/اگست تک ہندوستان چھوڑ دے گا اور اس کی جانشینی دو خود مختار ریاستیں یعنی پاکستان اور ہندوستان کریں گی۔ پاکستان اب ہماری پہنچ بلکہ گرفت میں تھا۔ مگر وائسرائے کی جاری کردہ تفصیلات نے ہمیں صدمے سے دوچار کر دیا۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ کر لیا گیا تھا، صوبہ سرحد اور سلہٹ میں ریفرنڈم طے پا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قائداعظم نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو اپنی نشری تقریر میں اس نئی مجوزہ ریاست کے لیے Moth Eaten and Truncated Pakistan (دیمک زدہ اور کٹے پھٹے پاکستان) کا استعارہ استعمال کیا تھا۔ تاہم قائداعظم نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ مایوس نہ ہوں اور اپنی جانفشانی سے اس نقصان کو نفع میں بدل دیں۔

پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کانگریس اور ہندو مہا سبھا نے آخری لمحات میں پاکستان کے منصوبے کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کے لیے پیش کیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تجویز مسلمانوں کو سراسیمہ کر دے گی اور وہ اس سے بچنے کے لیے پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو کر کوئی سمجھوتہ کر لیں گے۔ بنگال میں اس تجویز کو پیش کرنے والے ہندو مہا سبھا کے لیڈر شیام پرشاد مکھرجی تھے جبکہ کانگریس کھلے اور چھپے ان کی حمایت کر رہی تھی۔

بنگال کے مسلمانوں کو آج بھی یاد تھا کہ انہی ہندوؤں نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ۱۹۰۵ء کی تقسیمِ بنگال کو منسوخ کرانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے تھے۔ اب ۱۹۴۷ء میں بنگال کو تقسیم کرنے کے لیے ہندوؤں کا احتجاج مسلمانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھا۔

مولانا اکرم خان نے بنگال کو تقسیم کرنے کے مطالبے کی مخالفت میں ایک زوردار بیان دیا مگر ان کی مخالفت سے کچھ فرق نہیں پڑا۔ حسین شہید سہروردی اور ابوالہاشم نے خود مختار بنگال کی تجویز پیش کی۔ ابتدا میں تو ایسا لگا کہ کانگریس اس کی حمایت کر رہی ہے، مگر جلد ہی وہ اس حمایت سے دست کش ہو گئی۔ خود مختار بنگال کا تصور چاہے کسی بھی نیت سے پیش کیا جا رہا تھا، ہمارے آزاد گروپ کے نزدیک یہ دو قومی نظریے کی تکذیب کے مترادف تھا۔ میں نے کا مرید

میں اس تجویز کے خلاف سخت اداریہ لکھا جس میں سہروردی اور ابوالہاشم صاحبان کی شدید مذمت کی گئی تھی۔ ہمارے حساب سے خودمختار بنگال کا تصور در حقیقت مسلمانوں کے حق خود ارادیت کے بنیادی اصول کا انکار اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قومیت کے تصور کو قبول کرنے پر اصرار تھا۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ مسلمان نہ علیحدہ قوم ہیں نہ علیحدہ وطن کے حق دار، پاکستان کے لیے ہندوستان کو تقسیم کرنے کی بنیاد ہی ڈھے جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ سہروردی اور ابوالہاشم نے قائداعظم کو قائل کر لیا تھا کہ وہ خودمختار بنگال کی اسکیم پر اعتراض نہ کریں۔ ان بنگالی لیڈروں کی نظر میں خودمختار بنگال جغرافیائی طور پر منقسم پاکستان کا بہتر متبادل ہو سکتا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ قائد نے کن حالات میں اپنے اعتراض سے صرفِ نظر کیا ہوگا۔ مگر قیاس ہے کہ مسٹر سہروردی نے وکالت کی ہوگی کہ خودمختار بنگال ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور میں مذکور خودمختار ریاستوں سے مختلف کوئی چیز نہیں ہوگی، اور یہ کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ بنگال ہو یا پاکستان! اصل اہمیت اس بات کی تھی کہ مسلم اکثریت کا یہ خودمختار علاقہ انڈین یونین کا حصہ نہ ہو۔

مجھے اب اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ اس تجویز نے جہاں مسٹر سہروردی کی سوچ کی ٹیڑھ کو ظاہر کیا تھا، تو وہیں اس نے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا بیج بھی رکھ دیا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس نے کبھی بھی لسانی بنیاد پر قومیتوں کی وکالت نہیں کی تھی۔ پھر بھی مسٹر سہروردی کا خیال تھا کہ بنگال کو ایک لسانی اکائی ہونے کی وجہ سے بطور استثنا انڈین یونین سے علیحدگی کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا جب کانگریس ہائی کمان نے اس اسکیم کو رد کر دیا۔ اگر مسٹر سہروردی کا خیال تھا کہ مشرقی ہندوستان کی آزاد ریاست، جس کا نام خواہ کچھ ہو، فی الحقیقت پاکستان ہوگی۔ تو یہ بات کانگریس کو اس کے اپنے نقطۂ نگاہ سے بھی کیسے قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ ان کے خدشات بے سبب نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ لسانی بنیاد پر بننے والی قومیتیں، مرکز گریز رجحانات کی وجہ سے، مذہبی قومیت کے مقابلے میں زیادہ انتشار کا سبب بن سکتی ہیں۔ پاکستان کی تخلیق ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ دو حصوں میں تقسیم کرتی، جبکہ زبان کی بنیاد پر بننے والی قومیں ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتیں اور ملک چوں چوں کا مربہ بن کر رہ جاتا۔

خودمختار بنگال کی تجویز ہمارے نقطۂ نگاہ سے اس لیے بھی قابلِ اعتراض تھی کہ اسے تسلیم

کرنے کے بعد مسلم لیگ کی صفوں میں اوپر سے نیچے تک یہ سمجھا جاتا کہ مطالبۂ پاکستان تو بس سودے بازی کے لیے تھا اور مسلمانوں کی علیحدہ ثقافتی اور تہذیبی شناخت کے لیے چلائی جانے والی تحریک محض دکھاوا تھی۔ یہی وہ نقطۂ نگاہ تھا جس کا پروپیگنڈا کر کے آنے والے سالوں میں عوامی لیگ اور پاکستان مخالف عناصر نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اگر خود مختار بنگال کی اسکیم سرے سے پیش ہی نہ ہوئی ہوتی تو ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۱ء کے درمیانی عرصے میں بنگالی قومیت کے جس بھوت نے پاکستان کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں، وہ کبھی بھی اتنی تباہ کن حیثیت اختیار نہ کرتا۔ مذہب اور ثقافت سے زبان کی طرف چھلانگ مسلمانوں کی پوزیشن میں ایک ایسی بنیادی تبدیلی تھی جس نے اندر ہی اندر پلنے والے کینسر کی طرح اُن کی اخلاقی قوت ختم کر کے انہیں بے شمار خطرات کے سامنے لا کھڑا کر دیا تھا۔

۱۹۴۸ء میں ریاست حیدر آباد کا انجام دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود مختار بنگال اگر وجود میں آ بھی جاتا تو بھارت اس کا کیا حشر کرتا۔ ساری دنیا سے کٹا ہوا، انڈین یونین کے علاقوں سے گھرا ہوا بنگال، بھارت کے لیے تر نوالہ ثابت ہوتا۔ اسے ہضم کرنے کے لیے یہی بہانہ کافی تھا کہ بھارت عین اپنے درمیان کسی ایسے غیر مستحکم سیاسی وجود کو کیسے برداشت کر سکتا ہے جس میں ہندوؤں کی بڑی آبادی مسلمانوں کے رحم و کرم پر کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ خود مختار بنگال چھ مہینوں سے زیادہ جی سکتا تھا۔

اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ خود مختار بنگالی ریاست ہندوؤں کی قبولیت کے بعد ہی قائم ہوتی، تب بھی صورت حال بہتر تو ہر گز نہ ہوتی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو جاتا۔ نئی مسابقت شروع ہو جاتی اور ریاست انہی جھگڑوں کو نمٹانے میں اُلجھی رہتی۔ ہندو تعلیم یافتہ اور خوشحال تھے۔ جبکہ مسلمان معاشی اور سیاسی لحاظ سے پسماندہ تھے۔ مسلمان، ظاہر ہے عددی برتری کی بنیاد پر ترقی اور خوش حالی میں بڑا حصہ لینے کی کوشش کرتے اور یہیں سے مفادات کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو جاتے۔ نئی کشمکش مختلف حوالوں سے ہوتی، مسلم کسان بمقابلہ ہندو زمیندار، مسلم بزنس مین بمقابلہ ہندو صنعتی ٹائکون، مسلم کلرک بمقابلہ ہندو افسران، غرض یہ کہ ہر طرف

مسابقت، کشیدگی اور کھینچا تانی کا دور دورہ ہوتا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی ۴۵ برسوں کا منظر نامہ یہی تو تھا۔ خود مختار بنگالی ریاست کوئی جادو کی چھڑی تو تھی نہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جنم جنم سے پائے جانے والے مسائل کو ختم کر دیتی۔

سرت چندر بوس اور کرن شنکر رائے دونوں کا تعلق کانگریس سے تھا۔ انہوں نے خود مختار بنگال کے تصور کی حمایت کی۔ مگر ایک ہی ہفتے میں اعلان ہو گیا کہ کانگریس کی ہائی کمان نے اس اسکیم کو مسترد کر دیا ہے۔ آزاد بنگالی ریاست کا تصور جتنی تیزی سے ابھرا اتنی ہی تیزی سے ختم بھی ہو گیا۔ ہم نے سکون کا سانس لیا، مگر یہ خدشہ ذہن میں جاگزیں رہا کہ لسانی قوم پرستی کا جو بیج بو دیا گیا ہے، وہ کہیں پاکستان کی نوزائیدہ ریاست کے لیے حقیقی خطرہ بن کر نمودار نہ ہو جائے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ پریس میں چھپنے والے کالموں سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ یہ خدشہ غلط نہیں تھا۔ پاکستان کا قیام زیادہ دور نہیں تھا۔ پریس میں مستقبل کی صورت گری سے متعلق مضامین بڑی تعداد میں شائع ہو رہے تھے۔ انگریز کے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ اس موضوع پر ہندی اور اردو پریس میں کھل کر رائے کا اظہار ہو رہا تھا۔ اب تک اس بارے میں دو آرا نہیں تھیں کہ انگریز کی طرف سے اقتدار آزاد ریاستوں کے سپرد کرنے کے بعد ہندوستان میں سرکاری زبان ہندی ہوگی اور پاکستان میں اردو۔ لیکن اب چند بنگالی دانشوروں نے، جن میں ابوُرشد متین الدین بھی شامل تھے، اپنے کالموں میں مشورہ دینا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان کے مغربی بازو میں اردو کو اور مشرقی بازو میں بنگالی کو سرکاری زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہی بنگالی دانشور ہندوستان تقسیم نہ ہونے کی صورت میں ہندی کو واحد سرکاری زبان بنانے پر ہرگز اعتراض نہ کرتے تھے۔ ابوُرشد متین الدین نے کامریڈ میں چھپنے والے اپنے مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور انتظام غیر حقیقی ہوگا۔

بنگالی اخبارات و جرائد میں اس حوالے سے شائع ہونے والے مضامین اور تبصروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی سوچ میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔

ہم تو یہ سمجھتے رہے کہ یہ تجاویز پاکستان کو پیش آسکنے والے ممکنہ مسائل کو سمجھنے اور ان کے مناسب حل تلاش کرنے کی ایک مثبت کوشش ہے۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ یہ سب کچھ

ایک بڑے منصوبے کا حصہ تھا۔ ابوالہاشم کے بیٹے بدرالدین عمر نے لسانی تحریک پر اپنی کتاب میں اعتراف کیا ہے کہ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد کلکتہ کے ایک مسلم ہوٹل میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے پاکستان کے بارے میں اپنی حکمت عملی طے کرنے کے لیے ایک اجلاس منعقد کیا تھا۔ بعض لوگ (بدرالدین عمر نہیں) دعویٰ کرتے ہیں کہ اس اجلاس میں شیخ مجیب الرحمٰن بھی شریک ہوئے تھے۔ حقیقت چاہے کچھ بھی ہو، یہ طے ہے کہ ہمارا دشمن پہلے دن سے اس سوچ بچار میں لگا ہوا تھا کہ ہم سے تقسیم ہند کا بدلہ کیسے لیا جائے۔ مسٹر عمر کی کتاب میں کیے جانے والے انکشافات ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونے چاہئیں جو ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ عوامی لیگ کی طرف سے چلائی جانے والی تحریک محض مرکزی حکومت کی طرف سے مشرقی پاکستان کو نظرانداز کرنے کا ردعمل تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کمیونسٹوں نے کمال ہوشیاری سے مستقبل میں پیش آسکنے والے مسائل کا اندازہ کر رکھا تھا۔ جیسے جیسے مسئلے سامنے آتے رہے، وہ ایک ایک مسئلے کو قومیتوں اور ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان تفرقے کا بیج بنا کر بوتے رہے۔ اس پر مستزاد مسلم لیگی قیادت کی کوتاہ نظری تھی جو قائداعظم اور لیاقت علی خان کے بعد پاکستان کی مرکزی حکومت کا طرۂ امتیاز رہی۔ کراچی میں دارالحکومت کے قیام کو شکایت کا موضوع بنا دیا گیا۔ ملک کی سرکاری زبان کیا ہو، ایک بلاوجہ کی بحث چھیڑ کر جذبات کو بھڑکایا گیا۔ مشرقی پاکستان ترقیاتی فنڈز کو استعمال نہ کر سکا، یہ مشرقی پاکستان کو پسماندہ رکھنے کے لیے مرکزی حکومت کی سازش قرار دی گئی۔ پٹ سن سے ملنے والے زرمبادلہ کی آمدنی کو وفاقی منصوبوں پر خرچ کرنے کے عمل کو ڈاکہ قرار دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔ ہر دفعہ جب بھی اس قسم کا کوئی نیا شوشہ چھوڑا جاتا، مرکزی حکومت کسی نہ کسی لایعنی ردعمل کا اظہار کرتی، جس سے پتا چلتا تھا کہ انہیں مشرقی پاکستانیوں کے پس پشت کام کرنے والے ذہن کا پتا ہے، نہ اصل سازش کا ادراک۔

۱۹۴۷ء میں ان عناصر کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو لسانی بنیاد پر کوئی نہ کوئی خرابی پیدا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی واضح اکثریت اپنی پوری طاقت کے ساتھ مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع تھی۔ ۱۹۴۶ء میں عام انتخابات ہوئے تو اے کے فضل الحق جیسے کہنہ مشق سیاست دانوں کا بھی صفایا ہو گیا۔ سلہٹ کے ریفرنڈم نے تو مسلم لیگ کی عوامی حمایت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

جمعیت علمائے ہند کے رہنما مولانا حسین احمد مدنی کا سلہٹ میں غیر معمولی اثر تھا۔ وہ محض عالم دین ہونے کے ناطے قابل احترام نہ تھے بلکہ ان کی نجی زندگی بھی لوگوں کے لیے ایک اچھا نمونہ تھی۔ سیاست میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتب فکر سے قریب تھے، تاہم وہ سیکولر سیاست میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ سلہٹ میں غیر معمولی اثر رکھنے کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی لوگوں کو پاکستان کے خلاف ووٹ دینے پر آمادہ نہ کر سکے۔ زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ سلہٹ کے ریفرنڈم میں مولانا بھاشانی جیسے لوگوں نے پاکستان کے لیے حمایت کے حصول میں اہم کردار ادا کیا جو کہ بعد میں ملک توڑنے والے عناصر کے حامی ہو گئے تھے۔

سلہٹ کے ریفرنڈم میں فتح نے پوری قوم میں جشن کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اسی دوران سرحد کے ریفرنڈم میں بھی مسلم لیگ نے زبردست فتح حاصل کر لی۔ تاہم پنجاب اور ملحقہ ریاستوں میں مسلم کش فسادات نے ساری خوشی خاک میں ملا دی تھی۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اہل اقتدار اور سیاسی لیڈروں کی زیر سرپرستی بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی نسل کشی کی مہم چلائی گئی۔ لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ مگر مرکزی حکومت نے اس ظلم کو روکنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا اور قائداعظم کی پُر زور اپیلوں کے باوجود ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ بے یار و مددگار دیہاتیوں کے خلاف تو ظلم و تشدد کی انتہا کر دی گئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان بڑے پیمانے پر آبادی کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ قافلہ در قافلہ پنجاب کے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق ہجرت کر رہے تھے۔

۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کے وسیع نسل کش فسادات کے بعد اب کلکتہ دوبارہ پھٹ پڑا تھا۔ وقفے وقفے سے پھوٹنے والے فسادات ہفتوں جاری رہے۔ زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اور لوگوں کی آزادانہ نقل و حرکت ممکن نہیں رہی تھی۔ شہر واضح طور پر ہندو اور مسلم علاقوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا تھا، جو ایک دوسرے کے خلاف مورچے لگائے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی دونئی مملکتوں، بھارت اور پاکستان کے قیام کی تیاری شروع ہوئی، دونوں فریقوں میں مخاصمت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے بعد واضح ہو گیا تھا کہ کلکتہ پاکستان کے حصے میں نہیں آئے گا۔ یہ ہمارے لیے ایک بڑا دھچکا تھا لیکن ہم مسلمانوں نے قائداعظم کی

نصیحت کے مطابق اس نقصان کو نفع میں بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک شرارت، جس نے آنے والے برسوں میں بہت سی خرابیوں کو جنم دیا، بنگال کی تصوراتی تقسیم تھی جس کا اعلان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو آزادی کے موقع پر کیا گیا تھا۔ ریڈ کلف کمیشن کی طرف سے تقسیم بنگال کے بعد سرحدوں کا حتمی تعین کرنا باقی تھا کہ ۱۵ اگست سر پر پہنچ گئی۔ آزادی کے عمل میں کسی رکاوٹ سے بچنے کے لیے بنگال کی تصوراتی تقسیم عمل میں لائی گئی۔ بعض علاقے جن میں کھلنا، مرشد آباد اور چٹا گانگ وغیرہ شامل تھے، عبوری طور پر دونوں مملکتوں میں سے کسی ایک کے نام کر دیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کھلنا نے، جو اِکاون فیصد ہندو آبادی کا شہر تھا، بھارتی پرچم کے ساتھ یوم آزادی منایا۔ جبکہ مرشد آباد نے، جو کہ چھپّن فیصد مسلم آبادی کا شہر تھا، پاکستانی پرچم لہرا کر آزادی کا جشن منایا۔ کچھ دنوں بعد جب تقسیم کا حتمی فیصلہ ہوا، صورتحال اُلٹ کر رہ گئی۔ کھلنا پاکستان کو مل گیا جبکہ مرشد آباد بھارت کے حصے میں چلا گیا۔ یہ سب کچھ ایک بلا وجہ کی مشق تھی جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی آگ کو دہکانے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

کلکتہ کے بہت سے مسلم تاجر اور سرکاری افسر جن کے مکانات اور خاندان پاکستان بن جانے والے علاقوں میں پڑتے تھے، افرتفری کے عالم میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ''آزاد'' اور ''کامریڈ'' کے مالک مولانا اکرم خان نے حالات کے درست ہونے تک انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ وہ اپنا پورا اخباری سیٹ اپ ڈھاکا لے جانا چاہتے تھے۔ مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ بدھان رائے ان کے دوست تھے اور ان کا خیال تھا کہ معاملات کو نمٹانے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن مولانا کو اس وقت شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب بدھان رائے نے کسی اخباری پلانٹ کو کلکتہ سے باہر منتقل کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ مولانا اکرم خان کو اپنے تمام اثاثے کلکتہ میں چھوڑ کر ڈھاکا میں نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کرنی پڑی۔

کلکتہ میں آزادی کی صبح اپنے دامن میں بعض ناقابلِ فراموش واقعات لے کر طلوع ہوئی۔ آزادی کے جشن کے نام پر ہونے والی تقریبات میں حقیقی خوشی و مسرت معدوم تھی۔ ہاں البتہ خوشی اور مسرت کی ایک مصنوعی فضا ضرور چھائی ہوئی تھی۔ اپنے آنے والے کل سے خوفزدہ مسلم آبادی جے ہند کے مظاہروں میں حصہ لے رہی تھی۔ چھوٹی مسلمان بچیاں جو ایک ہفتہ پہلے تک پاکستان زندہ باد کے

نعرے لگاتے نہیں تھکتی تھیں، اب اپنے ننھے ہاتھوں میں بھارتی پرچم لہرا کر ہندوؤں اور سکھوں سے حقارت آمیز داد وصول کر رہی تھیں۔ البتہ دل شکستگی اور ہزیمت کی یہ کیفیت اُس وقت معدوم ہو جاتی تھی جب یہ خیال آتا کہ اُن کے مسلمان بھائی پاکستان میں...... کراچی میں، لاہور میں اور ڈھاکا میں ایک مسلم ریاست کی آزادی کا جشن منا رہے ہیں، جو اب برصغیر کے مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن چکی تھی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستان کے سارے مسلم اقلیتی صوبوں نے اسی احساس کے سہارے تحریکِ پاکستان کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالا اور اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔

کلکتہ کے سیالدہ ریلوے اسٹیشن سے جانے والی ٹرینیں مسلمان مسافروں کو مشرقی پاکستان لے جا رہی تھیں۔ یہی ٹرینیں جب واپس آتیں تو اُن ہندو افسروں سے بھری ہوئی ہوتیں جنھوں نے اپنا تبادلہ مغربی بنگال کروا لیا تھا۔ اسلامیہ کالج کلکتہ، جہاں میں کام کرتا تھا، کے سارے مسلمان اساتذہ پندرہ اگست سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ میں خود گومگو کی کیفیت کا شکار تھا۔ اس لیے کہ اس سے پہلے میں کرشن نگر جانے سے انکار کر چکا تھا جسے بنگال کی تصوراتی تقسیم کے دوران پاکستان کے حصے میں دکھایا گیا تھا۔ تازہ احکامات آنے تک مجھے بہرحال انتظار تو کرنا ہی تھا۔ میرا زیادہ وقت اب کلکتہ کی گلیوں میں مٹرگشت کرتے اور تازہ صورتحال میں لوگوں کے ردِعمل سے محظوظ ہوتے گزرتا۔ پھر ''کام رِیڈ'' اور ''آزاد'' کا کام بھی تو تھا جو مجھ ہی کو کرنا تھا۔

بالآخر ستمبر میں مجھے چٹاگانگ میں واقع ڈائریکٹوریٹ آف پبلک انسٹرکشن کا خط مل ہی گیا جس میں سلہٹ کے ایم سی کالج میں رپورٹ کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ مگر اس میں ایک اڑچن بھی تھی۔ خط میں بتایا گیا تھا کہ میرا تقرر نئے سرے سے کیا جا رہا ہے اور کلکتہ کے اسلامیہ کالج میں گزارا ہوا وقت میری مدت ملازمت میں شامل نہیں ہوگا۔ یہ تو ناانصافی تھی جس کے ازالے کے لیے میں نے، سلہٹ جانے سے پہلے، چٹاگانگ جا کر ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔

میں بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ یہ میرے لیے کوئی عام سفر نہ تھا۔ میں کلکتہ سے جا رہا تھا، شاید ہمیشہ کے لیے، زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کرنے! ایک نئے ملک میں، جہاں سب کچھ نیا تھا۔ سلہٹ ۱۹۰۵ء کی تقسیم سے پہلے کبھی بھی مشرقی بنگال کا حصہ نہیں رہا تھا، اس لیے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہاں

کے لوگ ایک اجنبی کا خیر مقدم کیسے کرتے ہیں۔ پھر کچھ سُرور ایک آزاد ملک میں بس جانے کا بھی تھا۔ ہر دوسرے آدمی کی طرح میری آنکھوں میں بھی پاکستان کے مستقبل، اس کی معیشت، معاشرت، ثقافت اور ادب کے بارے میں سُہانے خواب تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پاکستان ایک مثالی ریاست ہوگا جس کی حکومت اُس گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کرے گی جواب تک کانگریس کی حکومت کا وتیرہ رہی تھی۔ میرے خیال میں ہندو اقلیت کے ساتھ ہمارا سلوک اتنا اچھا ہونا چاہیے کہ بھارت اس ضمن میں اپنی کوتاہیوں پر شرمسار ہو کر اپنی مسلم اقلیت کی حفاظت پر دھیان دینا شروع کر دے۔

بلاشبہ ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر 'اسلامی' کا مطلب ٹھیٹھ ملائیت پر مبنی نظام نہیں تھا۔ ہمارا ایمان تھا پاکستان قرآن کے قانون اور جدید قانونی نظام کا حسین امتزاج ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ اس سوچ کے عملی نفاذ کی تفصیلات پر ہماری آرا میں اختلاف پایا جاتا تھا۔

میں مُڑ کر گردشِ ایام کے آئینے میں دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت ہماری سوچ واضح اور متوازن نہیں تھی، بلکہ شاید اُلجھن کا شکار تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے مسلمانوں کے موڈ کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی اور اس بات پر زور دیتے رہے تھے کہ پاکستانی ریاست کو مسلم ثقافت کا غماز ہونا چاہیے اور اسے ایک ایسی جگہ ہونا چاہیے جہاں غیر مسلم اس خوف سے آزاد ہوں کہ وہ محض غیر مسلم ہونے کی وجہ سے ذبح کر دیے جائیں گے۔ مسلم عوام کی سوچ تو واضح تھی، وہ پاکستان کو سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے جنت کا ایک ایسا ٹکڑا دیکھنا چاہتے تھے جس کا خاکہ قرآن سے اُبھرتا ہو۔ وہ تو بس قرآنی احکامات کا سیدھا سادا نفاذ چاہتے تھے، چاہے اس کے لیے دورِ جدید کی آسائشوں کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ لیکن تعلیم یافتہ متوسط اور اعلیٰ طبقے ذہن کے اس خلجان کو دور نہیں کر سکے کہ وہ دورِ جدید کی ترقی اور آسائشوں کو قرآنی تعلیمات سے کیسے ہم آہنگ کریں۔ اس لیے بھی کہ وہ عصرِ حاضر کی آسائشوں اور عیاشیوں کو قربان کرنے کو تیار نہیں تھے۔ آنے والے برسوں میں پیش آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ نفاذِ دین کے سلسلے میں اعلیٰ طبقوں کی ہچکچاہٹ اور قیادت کی طرف سے واضح سمت کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے ہی پاکستان کو شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا۔

سترہواں باب

بد بودار پھول، جھاڑ جھنکار سے بھی زیادہ خراب ہوتا ہے!

(شیکسپیئر)

اگر میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ لکھنے بیٹھ ہی گیا ہوں تو پھر لازم ہے کہ میں ان مراحل کی بھی نشاندہی کروں جن سے گزر کر پاکستان کی نوزائیدہ مملکت شکست و ریخت سے دوچار ہوئی۔ اس کام کے لیے ہمیں اس کی سیاست، معیشت اور معاشرتی ارتقا کا باریک بینی سے جائزہ لینا ہوگا۔ آئین کی تشکیل میں تاخیر اور اناڑی پن کا مظاہرہ، مکارانہ سیاست اور اس کے نتیجے میں اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں پر عوام کے اعتماد کا فقدان اور ان کی نیتوں پر شبہ۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کو سقوطِ پاکستان کی تاریخ رقم کرتے وقت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم میری کوشش تو اُس خرابی کو سمجھنے کی ہے جس نے پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کیا اور مشرقی پاکستان کے لوگوں کی سوچ کو یکسر مخالف سمت کی طرف موڑ دیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اعلیٰ سطح پر بہت سی غلطیاں ہوئیں اور حکومت نے بعض اوقات عوامی رجحانات کے مقابلے میں سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ اسے زیادہ سے زیادہ مایوس کن کہا جاسکتا ہے، مگر یہ سب کچھ ۱۹۷۱ء میں پیش آنے والے اندوہناک واقعات کی معقول توجیہ نہیں ہوسکتا جس نے پاکستان کے پرخچے اڑا دیے۔ ہاں اگر ہم کسی سازش کے امکان کو پیش نظر رکھیں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ ریاست پہلے دن سے ایسے اندرونی اور بیرونی ایجنٹوں کی آماجگاہ بنی رہی تھی جو پاکستان کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے اور جنھوں نے لیڈروں کی ہر غلطی اور ہر فروگزاشت سے ماہرانہ انداز میں فائدہ اٹھا کر عوام کو بھڑکایا۔

پاکستان کو ثقافتی، سیاسی اور معاشی تینوں اطراف سے نشانہ بنایا گیا۔ ہر محاذ پر ایک غیر محسوس حکمتِ عملی اپنائی گئی۔ دشمن کا پہلا کام تو یہ تھا کہ مملکت کی خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ کر ہر

کام میں شکوک وشبہات پیدا کیے جائیں، غلط فہمیوں کو فروغ دیا جائے اور مسائل کو تنازعہ بنا کر کھڑا کر دیا جائے۔ اگر کوشش کامیاب ہوگئی تو پیدا ہونے والی غلط فہمی کو پال پوس کر بڑا کر کے اس میں حقیقت کا رنگ بھر دیا جائے۔ یہی موقع ہوتا تھا جب کچھ اور مسائل کھڑے کر کے قومی منظر نامے پر ایک سیاہ تصویر پینٹ کر دی جاتی تھی۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر عوام کی توجہ ان مسائل پر کم ہو جاتی تو کمال ہوشیاری سے اسی طرح کے چند اور مسائل ایک نئے انداز میں اٹھا کر طوفان کھڑا کر دیا جاتا۔ ہدف ایک ہی ہوتا تھا کہ معاشی اعتبار سے مشرقی پاکستان کے عوام کا خون چوسا جا رہا ہے، سیاسی اعتبار سے اُن کو غلام بنایا جا رہا ہے، اُن کی ثقافت کو مٹایا جا رہا ہے۔

اور اس پورے ہنگامے میں دشمن کا ساتھ کون دیتا تھا؟ ہماری اپنی خوش فہمیاں، ناتجربے کاریاں، حماقتیں، بے حسی اور صحیح وقت پر فیصلہ کن اقدام کی کمی! اگر ہم دشمن کو یہ سارے 'اتحادی' فراہم نہ کرتے تو وہ کبھی بھی اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ ہمیں بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری تباہی کی ذمہ دار تنہا دشمن کی چالبازیاں نہیں۔ ہماری بے بصیرتی بھی اس میں برابر کی شریک ہے۔ آنے والے صفحات میں ہم دشمن کی مہم اور حکمت عملی کا تجزیہ کریں گے اور سیاسی، معاشی اور ثقافتی، تینوں پہلوؤں سے پہنچنے والے نقصان کا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔ ہم اپنے تجزیے کا آغاز ثقافتی محاذ سے کرتے ہیں۔

بحیثیت مسلمان بنگالیوں کی موجودہ نسل (یا کم از کم گزشتہ دو نسلوں) کی ثقافتی لحاظ سے ایک کمزوری، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اُن کی عربی اور فارسی سے عدم واقفیت ہے۔ جس کے نتیجے میں بنگال کے مسلمان باقی مسلم دنیا سے کٹ کر رہ گئے اور وہ نادیدہ رشتہ اور غیر محسوس تعلق ختم ہو کر رہ گیا جو انہیں روحانی طور پر امت مسلمہ سے جوڑ کر رکھ سکتا تھا۔ عربی اور فارسی سے نابلد مسلمان آہستہ آہستہ یہ احساس کھو بیٹھتا ہے کہ وہ ایک بڑے وجود کا حصہ ہے۔ وہ اسلامی تاریخ سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور اپنے ملک سے باہر مسلمانوں کے کارنامے اس کے اندر کوئی احساس فخر پیدا نہیں کرتے۔ جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۵ء میں شائع ہونے والی اپنی خود نوشت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان، اپنے ماضی کے کارناموں پر مشترکہ احساسِ فخر سے پیدا ہونے والا تعلق ہی مضبوط رشتہ کا باعث ہوتا ہے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد تعلیم کے

شعبے میں نئے رجحانات، بالخصوص عربی اور فارسی کی اہمیت کو پسِ پشت ڈالنے سے مشترکہ احساسِ تفاخر آہستہ آہستہ مٹتا چلا گیا۔ گو کہ یہ رجحانات پورے ہندوستان کے تعلیمی نظام میں پروان چڑھ رہے تھے، مگر بنگال سے باہر ان کے اثرات اتنے شدید نہیں تھے۔

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے پاس اردو کی صورت میں ایک ایسا متبادل ذریعہ موجود تھا جس نے انہیں مسلمانوں کے علمی سرمائے سے کسی نہ کسی درجے میں جوڑے رکھا۔ جبکہ بنگالیوں کی زنبیل میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو بذاتِ خود مسلمانوں کی کامیابی کی مظہر تھی۔ اس کے بڑے بڑے مصنفین، سب مسلمان تھے۔ جنہوں نے ایک ایسا علمی ماحول تخلیق کر دیا تھا جس کی جڑیں گہری اور اسلامی اقدار میں پیوستہ تھیں۔ عربی اور فارسی کی بیشتر مستند کتابیں اردو میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ (بالخصوص چیزوں کے نام اور ان کی صفات)، زیادہ تر عربی اور فارسی کے الفاظ پر مبنی تھا۔ اردو کے شاعروں کا تخیل عربی اور فارسی سے مستعار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اردو بولنے والا مسلمان عربی اور فارسی سے کٹ جانے کے باوجود باقی دنیا کے مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی ورثہ سے جُڑا رہا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں بنگال کے لوگوں نے اپنے اردگرد ہندوؤں کی کامیابیوں کے جھنڈے ہی لہراتے دیکھے۔ گو کہ مسلمانوں نے سولہویں صدی میں ہی بنگالی زبان کی آبیاری شروع کر دی تھی اور یہ بھی صحیح ہے کہ مسلم حکمرانوں کی پشت پناہی کے بغیر بنگالی پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بنگالی زبان کے چوٹی کے لکھنے والوں میں مسلمانوں کا نام خال خال ہی آتا ہے۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انیسویں صدی میں بنگالی زبان کی نشاۃ ثانیہ میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل بنگال میں جس نسل نے ہوش سنبھالا، ان کے لیے بنگال میں مسلمانوں کی کامیابیوں کی علامات ثبت ہونے یا نہ ہونے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے کہ ان کا تعلیم یافتہ طبقہ نہ صرف عربی اور فارسی سے آشنا تھا بلکہ اردو بھی جانتا تھا۔ اُن میں سے بہت سے لوگوں نے تو اردو کو اپنی زبان کے طور پر اختیار کر لیا تھا۔ ایسی صورت میں ہندوؤں کے مقابلے میں اگر مسلمان مصنفوں نے بنگالی زبان میں شاہکار تخلیق نہیں کیے تو اس

سے ان کی عزتِ نفس پر کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ برصغیر میں علمی میدان میں اگر کوئی کارنامہ انجام دینا ہے تو اسے اردو ہی میں ہونا چاہیے۔ انیسویں صدی میں اٹھنے والی بنگالی زبان کی نشاۃِ ثانیہ کی تحریک، اردو میں مسلمان مصنفین کے اُس دستے سے مختلف نہیں تھی جس کی قیادت مولانا حالی کر رہے تھے۔ حالی مسلمانوں کو جس طرح اُٹھ کھڑے ہونے کا پیغام اردو میں دے رہے تھے، ٹھیک اُسی طرح بنگالی زبان میں بنکم چندر چٹر جی ہندوؤں کے لیے تحریک کا باعث بن رہے تھے۔ مسدس حالی نے جس طرح مسلمانوں کو جمود توڑ کر کچھ کر گزرنے کی دعوت دی، ٹھیک اُسی طرح چٹر جی کا ناول 'آنند مٹھ' ہندوؤں کے لیے مہمیز بنا۔ غالب، میر، سودا اور شبلی نعمانی کے شہ پارے جس طرح مسلمانوں کے لیے باعث فخر ہیں اسی طرح بنکم چندر چٹر جی اور مائیکل دت کی تخلیقات ہندوؤں میں احساسِ تفاخر پیدا کرتی ہیں۔

اس کے مقابلے میں بنگالی مسلمانوں کی نئی نسل عربی و فارسی سے ناواقف تھی اور اردو بھی اس کے لیے اجنبی تھی۔ اس کا کل دارومدار بنگالی پر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نسل ان زبانوں میں محفوظ، مسلمانوں کے عظیم علمی ورثے سے کٹ کر رہ گئی۔ اگر شمالی ہندوستان کی طرح بنگال میں بھی مستند اسلامی کتب مقامی زبان میں منتقل ہو جاتیں تو اُن کا احساسِ بیگانگی اتنا شدید نہ ہوتا (جس کا مظاہرہ ۱۹۷۱ء میں کیا گیا)۔ بنگالی زبان کا کل علمی سرمایہ ہندوؤں کی تخلیقات پر مبنی تھا، جو فطری طور پر ہندو ثقافت کو پروان چڑھاتا تھا اور جس کی بنیاد ہندو دیو مالا کے اساطیر اور عقائد تھے۔ مسلمانوں کے لیے لے دے کر چند منظوم خطبات تھے، وہ بھی ایسی زبان میں جس کا محاورہ نئی نسل کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے بنگالی ادب اور ثقافت کو اپنانے کا مطلب، اپنی ثقافت سے ناطہ توڑنا تھا۔ لیکن ان کی اکثریت کو احساس ہی نہیں تھا کہ عربی، فارسی اور اردو سے تعلق ٹوٹنے کے بعد وہ کس نقصان سے دوچار ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ہم نے ۱۹۴۰ء کے عشرے میں ڈھاکا یونیورسٹی میں ایسٹ پاکستان لٹریری سوسائٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ اس سوسائٹی کے قیام کا بنیادی مقصد بنگالی زبان و ادب میں مسلم لہجے کو پروان چڑھانا تھا۔ ہم کوئی انقلاب برپا کرنے نہیں نکلے تھے۔ البتہ ہمارے پیشِ نظر قاضی نذر الاسلام اور ابوالمنصور احمد جیسے لوگوں کی کوششوں کو آگے بڑھانا

تھا جو بنگالی زبان اور ادب میں کسی حد تک اسلامی تناظر کو اجاگر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان دونوں شخصیات کی تربیت میں اسلامی ماحول نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ گو کہ یہ خود عربی، فارسی اور اردو نہیں جانتے تھے مگر ان کا بچپن جس اسلامی ماحول میں گزرا تھا، اس کی وجہ سے ان کے تحت الشعور میں عربی، فارسی اور اردو موجود تھی۔ فارسی کی غزلیات اور عربی کے قصائد سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان کی تخلیقات میں کسی حد تک اسلامی رنگ بھی موجود تھا اور ان کی سوچ اسلامی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اگر مسلم بنگال میں نذرالاسلام جیسی چند اور شخصیات یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی رہتیں تو مسئلہ شاید خود ہی حل ہو جاتا۔ ایک طرف ہندو مصنفین کی پوری کہکشاں تھی، دوسری طرف اکیلا نذرالاسلام! ظاہر ہے مسابقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر نذرالاسلام پر بھی پورا بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ انفرادیت پسند تھے۔ اپنی مرضی کے مطابق لکھتے تھے۔ اگر ان کی تحریریں بنگالی میں مسلم لہجے کو فروغ دیتی تھیں تو وہیں ان کی بعض دوسری تحریریں اس کے برعکس سوچ کو تقویت دیتی تھیں۔

میں ثقافتی زوال کے جس عمل کی بات کر رہا ہوں، وہ اجتماعی نفسیات کے مطالعے اور تحقیق کے لیے ایک اچھا موضوع بن سکتا ہے۔ بنگال کا مسلم معاشرہ ایک خاموش، مگر گہری تبدیلی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ نئے تعلیمی انتظامات کے نتیجے میں ایک ثقافت کو ترک کر کے آہستہ آہستہ دوسری اور مخالف ثقافت کو اپنانے کا عمل جاری تھا۔ افراد غیر محسوس طریقے سے اپنا ثقافتی ورثہ چھوڑ کر مخالف تہذیبی اقدار اختیار کر رہے تھے۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو تحریک پاکستان دراصل بنگال کے مسلمانوں کو ہندوازم کی طرف جانے سے روکنے کی تحریک تھی۔ مگر یہاں زبان نے کچھ اور پیچیدگیوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمیں مسئلے کا ادراک نہیں تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں فضل الحق اور سہروردی جیسے لوگوں نے، جو ٹھیٹ اسلامی ماحول سے نکل کر آئے تھے، اس طرف دھیان نہیں دیا۔ ان کی نسل کے نمایاں مسلمان رہنما مثلاً خان بہادر عبدالمومن، بُردوان کے جناب ابوالقاسم، سر عبدالرحیم اور سر عبدالحلیم غزنوی وغیرہ سب روایتی مذہبی تعلیم سے آراستہ تھے، جس کا سارا زور اردو اور فارسی پر ہوتا تھا۔ سر عبدالرحیم کے گھر میں اردو بولی جاتی تھی، حالانکہ ان کا تعلق مدناپور کے ایک بنگالی گھرانے سے تھا۔ اسی طرح بقیہ تین

نام بھی بنگالی بولنے والوں کے ہیں مگر وہ ایسے ماحول سے وابستہ تھے جس میں اردو رچی بسی تھی۔ یقیناً وہ انیسویں صدی کے ہند قلم کاروں کو اپنی تہذیبی اقدار کا نمائندہ نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے مقابلے میں ابوالہاشم (ابوالقاسم کے صاحبزادے) کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ وہ اس طبقے کے ترجمان سمجھے جاتے تھے جو خود کو مسلمان سے زیادہ، بنگالی کہلوانا پسند کرتا تھا۔ اسی طرح وہ غالب کے مقابلے میں ٹیگور کو اور حالی کے مقابلے میں چٹرجی کو اپنے عوام کی آواز سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک غیر بنگالی مسلمان کی حیثیت ایک ایسے اجنبی سے زیادہ نہیں تھی جس میں اور بنگالیوں میں کوئی قدر مشترک نہ ہو۔

اپنے ماضی اور روایات کے ساتھ رویوں کی یہی تبدیلی تھی جس نے پچاس کی دہائی میں لسانی تحریک کو زور وشور سے پروان چڑھایا۔ اب وہ نسل صاحب اختیار تھی جس نے صرف بنگالی کلاسیکی شہ پاروں کے زیر اثر ہوش سنبھالا تھا۔ دوسری طرف مجموعی ثقافتی ماحول بھی نیا روپ دھار چکا تھا۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ایک سازش کے تحت بڑی ہوشیاری سے سرکاری زبان کا مسئلہ کھڑا کیا گیا۔ اردو کے مخالفین کا دعویٰ تھا کہ اس کا سرکاری زبان کی حیثیت سے نفاذ ثقافتی اور معاشی لحاظ سے بنگالی مسلمانوں کو محکوم بنادے گا۔ اُن کا استدلال تھا کہ ساری اہم سرکاری نوکریاں انہیں مل جائیں گی جن کی مادری زبان اردو ہے اور بنگالی مسلمان آہستہ آہستہ اہم عہدوں سے محروم ہو جائیں گے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ بڑی تیزی سے اس پروپیگنڈے کا شکار ہورہے تھے۔

ہم، جو کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ سارا تنازع ایک سازش کے تحت کھڑا کیا جارہا ہے، اس وقت ششدر رہ گئے جب مٹھی بھر (رپورٹ کے مطابق صرف چار) طلبہ نے مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کے کانووکیشن کے دوران اس وقت ہنگامہ کھڑا کرنے کی کوشش کی جب قائداعظم نے اپنی تقریر کے دوران اعلان کیا کہ صرف اردو ہی پاکستان میں رابطے کی سرکاری زبان ہوگی۔ ہمارے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی، یعنی مارچ ۱۹۴۸ء میں، وہ بھی پاکستان کے اندر، کوئی قائداعظم کے سامنے کھلے بندوں توہین آمیز لہجہ اختیار

کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ بہر حال سانحہ ہو گزرا جو مستقبل میں پاکستان کی شکست و ریخت کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ اس حادثے کے نتیجے میں ہر شخص لرزہ براندام تھا، مگر گڑبڑ کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ نہ صرف یہ کہ یونیورسٹی میں ان کا داخلہ برقرار رکھا گیا، بلکہ انہیں تنبیہ تک نہیں کی گئی۔ خواجہ ناظم الدین کی صوبائی حکومت نے اسے محض جوش جوانی قرار دے کر نظر انداز کر دیا۔ جبکہ صوبائی حکومت کو پتا ہونا چاہیے تھا کہ قائداعظم کے ساتھ بدتمیزی کے واقعہ نے پورے مشرقی پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور شرپسندوں کے خلاف تادیبی کارروائی کو تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا۔ حکومت کی اس بے عملی پر لوگ بجا طور پر الجھن کا شکار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کی رواداری کو حکومت کی کمزوری سمجھا جائے گا اور اس سے شرپسندی کی مزید کارروائیوں کو فروغ ملے گا۔

یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کشمیر کے مسئلے پر بھارت کے ساتھ زندگی یا موت کی کشمکش میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی انتظامیہ اب تک صحیح معنوں میں اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکی تھی۔ مغربی پاکستان میں مہاجرین کی آبادکاری ایک دیوہیکل مسئلے کی شکل اختیار کر گئی تھی اور حکومت تمام وسائل اس مسئلے کے حل کے لیے جھونکنے پر مجبور تھی۔ بھارت نے پاکستان کے حصے میں آنے والے امپیریل بنک آف انڈیا کے اثاثے روک لیے تھے۔ اسی طرح پاکستان کے حصے میں آنے والے فوجی اثاثے بھی بھارتی خورد بُرد کا شکار ہو گئے تھے۔ پنڈت نہرو آئے دن بیان دیتے نہیں چوکتے تھے کہ پارٹیشن سے پیدا ہونے والے مسائل بندوق کے زور پر حل کیے جائیں گے۔ یہی وہ وقت تھا جب پاکستان کو یکجہتی اور اتحاد کی فی الحقیقت شدید ضرورت تھی۔ لیکن سازشی عناصر ان تلخ حقیقتوں کو خاطر میں لائے بغیر، زبان کی بنیاد پر مرحلہ بہ مرحلہ فساد برپا کرنے کی سعی کر رہے تھے۔

یہ سب کچھ بنگالی زبان کی محبت میں نہیں ہو رہا تھا۔ ان کی زنبیل میں سب سے مؤثر ہتھیار اس خوف کا پرچار تھا کہ اردو بولنے والے معاشی اعتبار سے بنگالیوں سے آگے نکل جائیں گے۔ میں ذاتی طور پر واقف ہوں کہ بنگالیوں کا ایک بہت بڑا طبقہ اردو کے حق میں تھا۔ مگر یہ لوگ صرف اس پروپیگنڈے کی وجہ سے خاموش تھے کہ اردو کا نفاذ بنگالی مسلمانوں میں

احساسِ محرومی، بیروزگاری اور دوسرے درجے کے شہری ہونے کا احساس پروان چڑھائے گا۔
پھر جس طریقے سے حکومت نے مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کی، وہ بجائے خود غیر دانشمندانہ تھا اور لگتا تھا کہ حکومت کو سرے سے مسئلے کی سُدھ بُدھ ہی نہیں ہے۔ حکومت کی حکمتِ عملی کا کل دارومدار حب الوطنی کی مالا جپنے پر تھا۔ وہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ دشمن کے وار کا جواب بس یہی ہے کہ عوام کو بلالحاظ، اس بات کا یقین دلایا جائے کہ پاکستان کا وجود خطرے میں ہے۔ میرا خیال ہے، اور اس کا ذکر میں نے کئی دفعہ اپنے حلقۂ احباب میں بھی کیا ہے، کہ زبان کے مسئلے پر حکومت کی پالیسی اور بیانات لایعنی اور بلا جواز تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی، بنگلہ دیش ہو یا پاکستان، دونوں ملکوں میں سرکاری زبان انگریزی ہی ہے اور یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہم جیسے لوگ، جو ایک حقیقت پسندانہ سوچ رکھتے ہوئے انگریزی کو برقرار رکھنے کی بات کرتے تھے، انہیں رجعت پسندی کا الزام سہنا پڑا۔ میں وہ وقت کیسے بھول سکتا ہوں جب میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں جگہ ناپسندیدہ شخصیت قرار دے دیا گیا تھا۔ میرے محترم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی انگریزی کی وکالت کرنے پر میرے بارے میں برملا کہنے لگے تھے کہ شاید میں اپنی ذاتی پیشہ ورانہ ضرورت کے تحت معاملات کو جوں کا توں برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ جبکہ میں سوچتا ہوں ایک ایسے وقت میں جب پاکستان گوناگوں مسائل میں گھرا ہوا تھا اور قیادت پاکستان کی بقا کے امور میں الجھی ہوئی تھی، کیا ضروری تھا کہ زبان کا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا جاتا۔ کیا حرج تھا کہ اگر حکومت کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جاتا (بالخصوص کانووکیشن کے واقعے کے بعد) کہ انگریزی فوراً ختم نہیں کی جارہی، نہ اردو فوری نافذ کی جارہی ہے۔ زبان کا مسئلہ مناسب وقت پر رائے عامہ کو پیشِ نظر رکھ کر ہی طے کیا جائے گا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ زبان کے مسئلے پر جذبات کو کیوں بھڑکایا گیا۔ جبکہ اردو اور بنگالی کے حامیوں کو بھی پتا تھا کہ یہ کوئی فوری مسئلہ نہیں تھا اور عملی مجبوریوں کی وجہ سے انگریزی کو برسہا برس کے لیے برداشت کرنا ہماری ضرورت تھی۔
میرے نزدیک تو یہ ساری بحث ہی فضول تھی۔ اپنے حال کو مستقبل کی موہوم آرزوؤں کی بھینٹ چڑھا دینا کہاں کی عقلمندی تھی۔ اُس وقت تو ہمارا مسئلہ یہ تھا پاکستان کو تشکیل دینے والی

مختلف قومیتوں کو لڑی میں پرو کر ایک متحد اور یکسو قوم ہونے کا احساس تازہ کیا جائے۔ انگریزی گو کہ ایک غیر ملکی زبان تھی، مگر (چاہے شومئی قسمت کہیے) اسے ایسا مقام حاصل ہو گیا تھا جو ہمارے قومی اتحاد کو برقرار رکھنے میں مددگار ہو سکتی تھی۔ اردو یا بنگالی کی اہمیت پاکستان کے حوالے سے ہی تھی۔ ظاہر ہے یہ سوال کہ پاکستان کی قومی زبان کیا ہو، اُسی وقت کوئی اہمیت رکھتا ہے جب پاکستان قائم ہو۔ ابتداً ہماری کوششوں کا محور ایسے اقدامات ہونا چاہیے تھے جو اتحاد کو پروان چڑھانے والے اور انتشار سے بچانے والے ہوتے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم نے ملک کے دونوں بازوؤں میں پاگل پن کی حد تک ایسے مسائل کو زندہ کرنا شروع کر دیا جو خود اتحاد کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ سیاستدان اور ماہرینِ تعلیم انگریزی کی مخالفت کر کے اپنے ہی وجود پر کلہاڑا چلاتے رہے۔ انگریزی کی مخالفت میں اٹھنے والا ہر قدم ہماری یکجہتی اور ہم آہنگی کا شیرازہ بکھیرتا چلا گیا اور دشمن حاوی ہوتا چلا گیا۔

مشرقی پاکستان سیکریٹریٹ میں تعینات غیر بنگالی افسروں کی رعونت نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا اور اس سے دشمن کا کام اور آسان ہو گیا۔ یہ رعونت، احساسِ برتری اور بیوقوفی کا مجموعہ تھی۔ احساسِ برتری اس سوچ کا مظہر تھی کہ صرف اردو ہی مسلم ثقافت کے اظہار کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ جو کبھی علمی وثقافتی ورثہ رکھتے تھے، اسے بلا لحاظ بنگال کے مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ مقامی آبادی کی پس ماندگی، ان کے لیے نسلی کمتری کا استعارہ بن گئی تھی۔ بنگالی اور غیر بنگالی مسلمانوں میں چھوٹی موٹی ''تو تو میں میں'' بھی، جو بالعموم کاروباری و پیشہ ورانہ چشمک کا نتیجہ ہوتی تھی، دشمن کی طرف سے اردو بولنے والوں کے مذموم مقاصد کے طور پر پیش کی جانے لگیں۔ انہیں خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے تنازعات تو پورے ہندوستان میں جگہ جگہ کھڑے ہوتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے جہاں ایک سے زیادہ زبان بولنے والے رہتے ہوں، وہاں ایسے جھگڑوں کا ہونا ایک عام سی بات تھی، مگر مشرقی پاکستان کے علاوہ، انہیں کہیں بھی اتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ اردو بولنے والے افسروں کا رویہ ہی تھا جس کی وجہ سے ان چھوٹے موٹے جھگڑوں کے بارے میں دشمن کے شرانگیز پروپیگنڈے کو پذیرائی ملنے لگی اور لوگ اس کو اہمیت دینے لگے۔ صوبائی محکمہ تعلیم کے ایک سیکرٹری جناب فضل

کریم فضلی بڑے جارحانہ انداز میں بنگالی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی وکالت کرتے تھے، جس کے نتیجے میں رائے عامہ کا ایک بہت بڑا حصہ ٹوٹ کر مخالف صفوں میں جا کھڑا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کے سوا، بہت سے لوگ اس تجویز کے بارے میں مثبت سوچ رکھتے ہوں گے، مگر اس تجویز کا ایسے لوگوں کی طرف سے بڑے زور وشور سے آنا جو بنگالی کی ابجد سے بھی واقف نہ ہوں، بجائے خود ایک وجۂ اشتعال بن گئی۔ جناب فضلی کا جذبہ یقیناً حب الوطنی پر مبنی ہوگا۔ ان کا یہ خیال شاید غلط نہیں تھا کہ رسم الخط کی یکسانیت ثقافتی میدان میں یکجہتی کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوتی۔ مگر کیا کیجیے کہ یہ تجویز ایسے وقت سامنے آئی جب سازشی عناصر غیر بنگالیوں کے خلاف نفرت کی آگ دہکا چکے تھے اور اس تجویز نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

میں سازشی عناصر کا بار بار ذکر بہت سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا اور اب بھی میرے ذہن میں اس بارے میں کوئی اشتباہ نہیں کہ ہمارے خلاف سازش پہلے دن سے موجود تھی اور اپنا کام کر رہی تھی۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر آپ ڈاکٹر شہید اللہ کی اس صدارتی تقریر کی کیا توجیہہ پیش کریں گے جو انہوں نے ۱۹۴۹ء میں کرزن ہال میں لٹریری کانفرنس کے موقع پر کی تھی اور جس میں انہوں نے بنگالی قوم پرستی کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اس لٹریری کانفرنس کے جوائنٹ سیکرٹری اجیت گوہا اور سید علی اشرف (علی احسن کے چھوٹے بھائی) تھے، جو اس وقت ڈھاکا یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی میں لیکچرر تھے۔ میں اس کانفرنس میں خود موجود تھا، اس لیے کہ میں کچھ ماہ پہلے، ستمبر ۱۹۴۸ء میں ایم سی کالج سلہٹ سے مستعفی ہو کر، ڈھاکا یونیورسٹی جوائن کر چکا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر شہید اللہ کی تقریر نے مجھے فکرمند کر دیا تھا اور میں نے اس کا جواب اپنے دستخطوں سے ''آزاد'' میں شائع کروایا تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ ڈاکٹر شہید اللہ کے خیالات دوقومی نظریے کے برعکس ہیں اور ان کا مقصد پاکستان کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میرا استدلال تھا کہ اگر ہم سب سے پہلے بنگالی ہیں تو پھر ہم پاکستان کے بنیادی نظریے کو کیسے اپنا سکتے ہیں؟ میرے لیے یہ ایک بڑی عجیب بات تھی کہ اتنی قربانی، خون ریزی اور جدوجہد کے بعد ملنے والے ملک کے قیام کے بعد اتنی جلدی شہید اللہ جیسے لوگ اس کے بنیادی نظریے پر کھلم کھلا انگلیاں اٹھانا شروع کر دیں گے۔

میرا سوال یہ تھا کہ قیامِ پاکستان سے پہلے طے پا جانے والے اختلافی معاملات کو زندہ کرنے والے آخر کیا چاہتے ہیں؟ ان کی نیت اور ارادہ کیا ہے؟

ڈاکٹر شہید اللہ نے وہ سب کچھ کہہ تو دیا، مگر شاید انہوں نے اس کے نتائج وعواقب پر غور نہیں کیا کہ ان کے خیالات پاکستان کے بنیادی نظریے پر براہ راست حملہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ ''آزاد'' میں چھپنے والی میری تنقید سے وہ مزید ڈر گئے۔ وہ سمجھے کہ میں انہیں گرفتار کرانا چاہتا ہوں۔ اس تقریب کے دو سال بعد تک وہ مجھ سے ملنے سے کتراتے رہے تھے۔

کرزن ہال میں ہونے والی اس لٹریری کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں ایک مندوب ڈاکٹر عبدالودود تھے، جو کلکتہ سے آئے تھے۔ یہ پاکستان کی تخلیق کے مخالف تھے اور ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد دوسرے مسلمانوں کی طرح ڈھاکا منتقل نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے کلکتہ میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ میرے دل میں ان کے لیے خاصا احترام تھا۔ اس لیے کہ وہ منافق نہیں تھے۔ ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے نظریات کو چھپایا نہیں۔ وہ زبان سے وہی بات نکالتے تھے جس پر وہ دل سے یقین رکھتے تھے۔ ہم سے ملاقات پر انہوں نے اس بات پر بڑی مسرت کا اظہار کیا کہ قیامِ پاکستان کے بعد، اتنی جلدی اس نوعیت کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ انہوں نے برملا کہا کہ لگتا ہے کہ مسلمان، پاکستان کا ساتھ دینے کے فیصلے پر نظرِ ثانی کر رہے ہیں اور انہیں احساس ہو گیا ہے کہ ان کی ثقافت کے تانے بانے بقیہ بنگال سے ملتے ہیں۔

مجھے اب یہ تو یاد نہیں کہ کلکتہ سے اور کون کون آیا تھا، مگر اس کانفرنس کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اس کے منعقد کرنے والے بنگالی مسلمانوں کے ایک حصے کے لسانی جذبات بھڑکا کر پاکستان کو توڑنے کی مہم کا پہلا گولا داغنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بظاہر پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے خلاف کوئی بات نہیں کی گئی۔ سیاسی معاملات پر لب کشائی سے بھی گریز کیا گیا۔ اسے محض ایک ادبی تقریب کا نام دیا گیا اور شرکا نے صرف بنگالی زبان اور ادب کی اہمیت پر زور دیا۔ بہت سے ایسے لوگوں کو بھی بڑی ترکیب سے اس کانفرنس میں شریک کرایا گیا، جو اگر اس لٹریری کانفرنس کا حقیقی مقصد سمجھ لیتے تو یقیناً اس کے خلاف آواز اٹھاتے۔ اُن شرکا کے خیال میں

بنگالی ادب کے حُسن و قبح پر بحث و مباحثہ میں کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن میں اور آزاد گروپ کے میرے پرانے ساتھی سمجھ چکے تھے کہ پاکستان کے خلاف نفرت کی مہم کا آغاز ہو چکا ہے۔

باوجود اس کے کہ ''آزاد'' میں اپنے ایک مضمون اور ادارتی تبصروں میں، میں نے اس کانفرنس کے حقیقی مقصد کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا، مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ حکومت نے اسے اہمیت نہیں دی اور نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ اُس وقت کے مشرقی پاکستان سیکریٹریٹ میں تعینات تقریباً تمام ہی افسران غیر بنگالی تھے۔ حکومت کی اس بے حسی کی دو ہی توجیہات ممکن ہیں۔ پہلی یہ کہ (مشرقی پاکستان کی) نورالامین کابینہ یہ اندازہ ہی نہیں کر سکی کہ کیا کچھ ہو گزرا ہے اور اسی وجہ سے وہ کوئی قدم اُٹھانے سے بے نیاز تھے۔ دوسری یہ کہ وہاں تعینات سیکرٹری بنگالی سمجھتے ہی نہیں تھے، اس لیے اُن کی بلا سے، بنگالی میں کچھ بھی کہہ دیا گیا ہو۔ انہوں نے اس وقت تک کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی ہوگی جب تک اقتدار کی باگیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔

ماضی میں جھانک کر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کانفرنس بڑے دور رس نتائج کی حامل تھی۔ میرے خیال میں اگر اس کے منتظمین کو اُسی وقت صحیح طریقے سے ٹوک دیا جاتا اور بتلا دیا جاتا کہ تمہارے عزائم بے نقاب ہو چکے ہیں، تو شاید ان کی پیش قدمی رُک جاتی۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ پاکستان کے خلاف ان کی یہ سازش بلا روک ٹوک کامیاب ہوگئی تو ان کے حوصلے اور بلند ہو گئے۔ اب وہ کھلم کھلا اقدام کے لیے تیار تھے۔ انہیں بہر حال اندازہ تھا کہ انہیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہے اور کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے رائے عامہ کو اپنے مطلب کے لیے تیار کرنا ہے۔ انہوں نے اس کیفیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا جو ایک نئی قائم ہونے والی مملکت پر اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتے وقت طاری ہوتی ہے۔

اس کے بعد ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کے سال خیریت سے گزر گئے اور اس دوران کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں خود ستمبر ۱۹۵۰ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد آنے والے دو برسوں میں ہونے والے واقعات کا مجھے براہِ راست علم نہیں۔ فروری ۱۹۵۲ء کو ایک دن روزنامہ ''ٹائمز آف لندن'' میں، مَیں نے ان واقعات کے بارے میں ایک مختصر رپورٹ پڑھی جو بالآخر ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کے فسادات پر منتج ہوئے۔ میں

فکرمند ضرور ہوا، مگر سچی بات یہ ہے کہ میں اس پورے معاملے کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکا۔ تاہم اُسی سال اکتوبر میں جب میں وطن واپس آیا تو تفصیلات کا علم ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ آج تک اُن واقعات کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی جو ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو طلبہ کے ہجوم پر پولیس فائرنگ کا سبب بنے۔ اُس وقت عوام کی طرف سے کوئی ایسی چیخ و پکار تو تھی نہیں کہ اردو کے خلاف یا اس کے حق میں بیان دینا ضروری ہوتا، یہ کوئی فوری مسئلہ بھی نہیں تھا۔ پھر آخر وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو ایسی کیا آفت آ پڑی تھی کہ وہ اردو کے حق میں ایک بیان جاری کرتے۔ کیا وزیراعظم کے مشیر سمجھ رہے تھے کہ سرکاری زبان کے بارے میں وزیراعظم کا بس ایک واضح، غیر مبہم اور زوردار اعلان سرکاری زبان کے مسئلے کو ہمیشہ کے لیے حل کر دے گا؟ جبکہ نتیجہ بالکل اُلٹ نکلا۔ احتجاج کا ایک ایسا ریلا بہہ نکلا جس میں مغربی پاکستان کے بارے میں انتہائی خراب اور غلط جذبات پروان چڑھے اور انگریزی اخباروں سمیت پورے پریس نے اردو کے حامیوں کو غاصب، استحصال پسند اور ظالم قرار دیا۔

میں یہ سب کچھ اُن معلومات کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں جو میں نے اکتوبر ۱۹۵۲ء میں وطن واپسی پر سُن کر یا پڑھ کر حاصل کیں۔ گو کہ اس وقت تک فروری کے مقابلے میں جذبات خاصے ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۲۱ فروری کے واقعات، پاکستان کے خلاف سازش کا مواد جمع کرنے والوں کے لیے، ایک کبھی ختم نہ ہونے والی سونے کی کان ثابت ہوئے۔ اس وقت شہر شہر اور گاؤں گاؤں ایک ہی نعرہ گونج رہا تھا، ''ہمیں نورالامین کا خون چاہیے''۔ نورالامین، اُس وقت کے صوبائی وزیرِ اعلیٰ، جن کی انتظامیہ طلبہ پر فائرنگ کی ذمہ دار تھی، طلبہ کی نظروں میں بدی، استبداد اور نفرت کا نشان بن کر رہ گئے تھے۔ برصغیر میں طلبہ اس واقعہ سے پہلے بھی مرتے رہے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کی قیادت میں چلنے والی سول نافرمانی کی تحریک میں یہ ہزاروں کی تعداد میں گرفتار بھی ہوئے ہیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں دہشت گردی بھی کئی لوگوں کی موت کا سبب بنی ہے۔ ۱۹۴۲ء کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' مہم کے دوران بھی لوگ تشدد سے مرے ہیں۔ مگر فروری ۱۹۵۲ء میں مرنے والے ان تین چار طلبہ کی طرح اُن کی لاشوں سے کبھی ایسا سیاسی فائدہ نہیں اُٹھایا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ پاکستان

کے دشمنوں کے لیے ''رحمت خداوندی'' ثابت ہوا۔ وہ اب اس کی ''برکتوں'' سے تادیر فیضیاب ہوتے رہیں گے، اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے رہیں گے اور ہمیشہ کے لیے اسے بنگالی زبان اور بنگالی عوام کے لیے پاکستان کی طرف سے ''نشانِ نفرت'' بنا کر پیش کریں گے۔

دوسری طرف حکومت نے نہ اِس واقعہ کے دوررس اثرات کو جاننے کی کوئی کوشش کی اور نہ کوئی ایسا قدم اُٹھایا جس سے تمام حقائق سامنے آجاتے۔ مجھے انتہائی باوثوق ذرائع سے پتا چلا ہے کہ ۲۱ فروری کا واقعہ بنیادی طور پر ایک بے قابو ہجوم کو کنٹرول کرنے اور امن وامان کی بحالی کا مسئلہ تھا۔ اس کا بنگالی زبان کی تحریک سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ ہجوم صوبائی اسمبلی کی بلڈنگ کے سامنے بنگالی زبان کے حق میں مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ پرتشدد رویہ اس لیے نہیں اختیار کیا گیا کہ حکومت بنگالی کو کچلنا چاہتی تھی، بلکہ یہ سب کچھ تو ان کو ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی سے روکنے اور غیر قانونی رکاوٹوں کو توڑنے کے لیے کیا گیا تھا۔ اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، اس فائرنگ کو ایک ثقافت پر حملے کے مترادف سمجھا گیا اور اس نے پاکستان کے دشمنوں کو ثقافتی محاذ پر بے پناہ گولہ بارود فراہم کر دیا۔

جی ایم سید اور شیخ مجیب الرحمٰن

شیخ مجیب الرحمٰن پریس سے مخاطب ہیں
(ڈھاکہ۔ ۳ مارچ ۱۹۷۱ء)

بنگلہ زبان تحریک ۔۔۔ بگاڑ کا نقطۂ آغاز

بنگلہ زبان کی حمایت میں چلنے والی تحریک اتنی موثر اور پُرکشش ثابت ہوئی کہ جماعت اسلامی جیسی دائیں بازو کی جماعت بھی اس کے دام میں آ گئی۔ اُن کا اور اُن جیسے بعض دوسرے لوگوں کا خیال تھا بنگالی کو سرکاری زبان بنانے میں حرج ہی کیا ہے۔ ہر زبان کی طرح بنگالی بھی ایک ثقافتی ورثہ ہے اور جو لوگ بنگالی بولتے ہیں، اُن کی مادری زبان کو پاکستان کی سیاسی زندگی میں وہ مقام ملنا چاہیے جس کی وہ مستحق ہے۔ لیکن بات اتنی سادہ نہیں تھی۔

ایک وقت ایسا بھی تھا جب وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنے والے محسوس کرنے لگے تھے کہ بنگالی کے حق میں بھڑک اٹھنے والے جذبات کے پیش نظر اگر زبان کے معاملے میں ذرا رعایت برت لی جائے تو شاید بگاڑ کو لگام دی جا سکے۔ مگر یہ سوچ صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں ملنے والی ہر رعایت کو سازشیوں نے اپنی فتح جانا اور مذموم مقاصد کے اگلے مرحلے کی طرف بڑھنے والا ایک قدم سمجھا۔ بلا لحاظ اس کے کہ طلبہ کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کیا کچھ کیا گیا، دشمن کی پیش قدمی جاری رہی۔

نورالامین حکومت کی طرف سے بنگالی کے نفاذ کی مہم کو محض کنٹرول کرنے کی نیم دلانہ کوششوں کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ ۲۱ فروری کو پولیس فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کے نام پر عوامی مقامات پر شہید مینار اور یادگاریں تعمیر ہونے لگیں۔ تعلیمی اداروں پر خاص توجہ دی گئی۔ ہر اسکول اور کالج کے اپنے اپنے شہید مینار تھے جن کو ہر سال ۲۱ فروری اور دیگر خاص موقعوں پر مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ تعظیم پیش کی جاتی تھی۔ حکومت کی مدد سے چلنے والے تعلیمی ادارے بھی اس کھیل میں شامل کر لیے گئے۔ یہ تقریبات مافوق الفطرت اور دیومالائی طرز کی پُراسرار جوگیانہ رسوم کی شکل اختیار کرتی چلی گئیں۔ ان تقریبات میں حصہ لینے

والے نوجوانوں کو اہمیت ملنے لگی اور ان کے نام اس طرح مشہور ہونے لگے جو کسی اور طریقے سے ممکن نہیں تھا۔ ان میں سے وہ جو ذرا تخلیقی ذہن رکھتے تھے، اپنی زندگی با معنی بنانے کے لیے ان رسومات سے جذباتی اور نفسیاتی تسکین حاصل کرنے لگے۔ زبان کے نام پر بننے والی ہر یادگار بلالحاظ اس کے کہ اس کی شکل کتنی فحش اور عریاں علامتوں کو نمایاں کرنے والی ہو، نوجوانوں کے نزدیک ایک ایسے نشان کی حیثیت اختیار کر گئی جو پراسرار مگر مقدس اور زبردست امکانات کا حامل ہو۔

پاکستان کی یکجہتی کو خطرے میں ڈالنے والی اس تحریک کے خلاف کوئی مؤثر اقدام نہ اٹھانے کی ایک وجہ خود صاحبانِ اختیار بھی تھے۔ انتظامیہ کے ذمہ دار افسران اور وزرا سمیت مسلم لیگ کی نمایاں شخصیات سب کسی نہ کسی طرح لسانی تحریک کے جراثیم سے آلودہ ہو چکی تھیں۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے اساتذہ پوری طرح طلبہ کے ساتھ تھے۔ اُن میں سے بعض اساتذہ نے اعتراف بھی کیا کہ ۲۱ فروری کی تحریک کو منظم کرنے میں انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے طلبہ کی ہمت افزائی جاری رکھی، اسے فلسفیانہ بنیاد فراہم کی اور بنگالی قوم پرستی کو عقیدے کی حیثیت سے پروان چڑھایا۔ نوجوان سی ایس پی افسران بھی اسی چشمۂ فیض سے سیراب ہو رہے تھے۔

شومیٔ قسمت، بنگالی زبان کی تحریک میں حصہ لینے والے نوجوان بطور سی ایس پی افسران بھرتی کیے جانے لگے۔ اس لیے کہ حکومت مشرقی پاکستان نے اپنے سیکرٹریوں کے مشورے پر طے کر لیا تھا کہ اس تحریک میں حصہ لینے کا مطلب پاکستان سے غداری نہیں سمجھا جائے گا۔ سازشیوں کو اور کیا چاہیے تھا۔ ریاست کے خلاف سازشوں میں بھرپور شرکت، طالب علم کی حیثیت سے پاکستان کے خلاف جذبات کا اظہار، لیکن پھر بھی ریاست کے معاملات میں شریک! وہی ریاست جس کو آپ تباہ کرنے کے درپے تھے۔ آپ کی ساری خطائیں معاف، جو کچھ کیا محض جوشِ جوانی تھا! مسٹر اے کے ایم احسان، اُن چار میں سے ایک تھے جنہوں نے ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کی توہین کی تھی، نہ صرف سی ایس پی افسر تعینات کیے گئے بلکہ ۱۹۷۰ء میں جنرل یحییٰ خان نے وفاقی سیکرٹری مقرر کیا۔ ملک دشمن کارروائیوں کا کیا خوبصورت انعام تھا!

مسٹر ب جو نظریۂ پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والے کی حیثیت سے جانے مانے تھے، وہ بھی اسی طرح وفاقی سیکرٹری مقرر کر دیے گئے۔

پتا نہیں کیوں، مگر بہرحال حقیقت یہی ہے کہ صدر ایوب خان پر جب سے الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب جیسے بائیں بازو کے رجحانات رکھنے والے دو سی ایس پی افسران کا جادو چلا تھا، بائیں بازو کے لوگوں کی ہمت افزائی اور دائیں بازو کے افراد کو نظرانداز کرنے کی پیہم اور منظم کوششیں شروع ہوگئی تھیں۔ دائیں بازو والے تو انتظامیہ کے نزدیک گھڑے گھڑائے احمق لوگ تھے جن کی نظریۂ پاکستان سے تکلیف دہ حد تک وفاداری مسائل کو حل کرنے کے بجائے بڑھا رہی تھی۔ ایک صاحب، منیر چودھری، الطاف گوہر کے رازداں اور خاص گماشتے تھے اور انہی کے ذریعے مشرقی پاکستان کے سارے سُرخوں کا الطاف گوہر کے ساتھ رابطہ تھا اور انہی کے توسط سے حکومت کو یقین دلایا گیا ہوگا کہ بائیں بازو والوں کے خلاف پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات بے بنیاد ہیں۔ یا شاید یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ الطاف گوہر خود اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ انجامِ کار پاکستان کو بالآخر ٹوٹ ہی جانا ہے۔ الطاف گوہر نے ایوب خان کے ساتھ یقیناً وفاداری سے کام کیا ہوگا مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ بائیں بازو کے ایک دانشور کی حیثیت سے انہوں نے پاکستان مخالف نظریات کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی ہوگی۔ الطاف گوہر کے ریکارڈ پر ایسی کوئی شہادت نہیں ہے جس سے نظریۂ پاکستان یا اسلام سے اُن کی عقیدت اور وابستگی کا اظہار ہوتا ہو۔ ذاتی طور پر وہ ایک پڑھے لکھے، باصلاحیت اور نفیس مگر اخلاقیات سے عاری انسان تھے۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی دنوں میں جب وہ مشرقی پاکستان میں ڈپٹی سیکرٹری تعینات تھے، رسیائے شباب کی حیثیت سے بڑا نام کمایا۔ تھائی لینڈ کے ایک ثقافتی طائفے کی رکن خاتون کے ساتھ ملوث ہونے پر تو اُن کو جان چھڑانا مشکل ہوگئی تھی۔ زبان زدِ عام ہے کہ حکومت کو ان کی جان بخشی کے صلے میں ٹھیک ٹھاک معاوضہ دینا پڑ گیا تھا۔

اخلاقی معاملات میں کمزوری سی ایس پی حلقوں میں کبھی بھی بُری بات نہیں سمجھی گئی۔ اس لیے اس تلخ واقعہ کے بعد بھی الطاف گوہر ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔ مرکزی حکومت میں

تبادلے کے بعد وہ اپنے مداحوں کی خاطر خواہ تعداد مشرقی پاکستان میں چھوڑ گئے جن میں زیادہ تر افراد شراب وشباب کے رسیا اور بائیں بازو سے وابستہ تھے۔ الطاف گوہر نے ان کو مایوس بھی نہیں کیا۔ وہ اپنے ''دوستوں'' کو بھولتے نہیں تھے۔ جب ایوب حکومت میں ان کو ایک بااختیار حیثیت حاصل ہوگئی اور وہ عملاً پاکستان پر حکمرانی کرنے لگے تو اُن کے یاروں کے مزے آ گئے۔ صدرِ مملکت کی تھالی میں کھانا اور اُسی میں چھید کرنے کے اپنے مذموم مقاصد کو بروئے کار لانا اُن کا وتیرہ ٹھہرا۔ حکومت پاکستان کے قائم کردہ پریس ٹرسٹ آف پاکستان نے بنگالی روزنامہ ''دینک پاکستان'' کا اجرا کیا جس میں چن چن کر سرخوں کو بھرتی کیا گیا۔ ہر وہ شخص جو بنگالی زبان پر عبور رکھتا ہے، اُن استعاروں، حوالوں، تجویزوں اور کہہ مکرنیوں کو دیکھ کر اندازہ کرسکتا ہے کہ کس طرح ایک سرکاری اخبار کے ذریعے خود حکومت کی ناک کے نیچے پاکستان کے خلاف مہم چلائی گئی۔

یہ ساری باتیں حکومتی مشینری اور انتظامیہ کے علم میں لانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ پریس اور انتظامیہ سب دشمنوں کے کنٹرول میں تھے۔ کسی باہر کے آدمی کو یہ ساری باتیں متضاد لگتی ہوں گی۔ کتنی ستم ظریفی کی بات تھی کہ اسلام اور نظریۂ پاکستان سے وابستگی رکھنے والی حکومت جو ایک طرف تو اپنے بنیادی نظریے کے خلاف ہونے والی سازشوں کا مقابلہ کر رہی تھی تو دوسری طرف وہی حکومت ایسی سرگرمیوں کو پروان چڑھا رہی تھی جس کے نتائج خود اس کے لیے ناقابلِ قبول تھے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے روزنامہ ''دینک پاکستان'' اور پریس ٹرسٹ کے دوسرے اخبار ''مارننگ نیوز'' کی فائلوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔ جہاں تک ''مارننگ نیوز'' کا تعلق ہے، وہ غیر بنگالی (یعنی پاکستانی) قوم پرستی کا پرچارک تھا مگر صرف ادارتی صفحات تک۔ جہاں تک خبروں اور کالموں کا تعلق ہے، انہیں بنگالی رپورٹروں نے زہر سے بھر دیا تھا۔ غیر محسوس طریقے سے، جھوٹ بول کر، مغربی بازو کے ظلم اور استحصال کی کہانیاں سنا کر مغربی پاکستان کو سامراج کے طور پر نمایاں کیا تھا۔

دوسرے صاحب، جن کا میں نے ذکر کیا (وہ بھی بائیں بازو والوں کے لیے اتنے ہی مفید ثابت ہوئے جتنے الطاف گوہر!) قدرت اللہ شہاب تھے۔ اردو کے ایک افسانہ نویس! جو ہر

وقت اپنے گرد واہ واہ کرنے والوں اور خوشامدیوں کا جھمگٹا چاہتے تھے۔ یہ کسی بھی ایسے شخص کو بااختیار پوزیشن پر برداشت نہیں کر سکتے تھے جو اُن سے آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کرے۔ وہ اُسے ہٹوا کر ہی دم لیتے تھے۔ انہوں نے ہی ایوب خان کو، دانشوروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے رائٹرز گلڈ کا آئیڈیا دیا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ پاکستان جیسے ملک میں جہاں لکھاریوں کی اکثریت غریب ہے، ادیبوں کی سرپرستی کے لیے بننے والی سرکاری انجمن نیک مقاصد حاصل کر سکتی تھی مگر یہاں کھیل ہی کچھ اور تھا۔ مسٹر شہاب کے ذاتی نظریات کی وجہ سے رائٹرز گلڈ بہت جلد سرخوں کا گڑھ بن گئی۔

مجھے وہ کانفرنس اچھی طرح یاد ہے جس میں پہلی دفعہ گلڈ بنانے کا باقاعدہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ جنوری ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے۔ میں مشرقی پاکستان کی نمائندگی کرنے والوں میں شامل تھا اور دیگر دو مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ گلڈ کی دستور ساز کمیٹی کا ممبر نامزد ہوا تھا۔ مسٹر جسیم الدین اور مرحوم غلام مصطفیٰ مشرقی بازو سے میرے دوسرے ساتھی تھے جبکہ مسٹر ابوالحسن بطور مبصر شریک تھے۔ قدرت اللہ شہاب نے تجویز کیا کہ گلڈ کی سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی اردو اور بنگالی کے پانچ یا سات نمائندوں اور علاقائی زبانوں کے تین تین نمائندوں پر مشتمل ہو۔ تجویز بظاہر بڑی بے ضرر سی تھی مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس تجویز کے منظور ہوتے ہی بائیں بازو والے شور مچا دیں گے کہ مشرقی پاکستان کو اس کے حق کے مطابق نمائندگی نہیں ملی۔ اس لیے کہ اردو اور علاقائی زبانوں کا مطلب تھا مغربی پاکستان! جو مشرقی پاکستان کے پانچ یا سات ووٹوں کے مقابلے میں کل ملا کر چودہ یا سولہ ووٹ ہو جاتے۔ مسٹر جسیم الدین اور مسٹر غلام مصطفیٰ تو یہ نکتہ اُٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، مجھے ہی زبان کھولنی پڑی۔ میں نے بڑی آہستگی سے مسٹر شہاب کو بتایا کہ اگر ان کی تجویز منظور ہو گئی تو مشرقی پاکستان میں مخالفانہ ردِعمل سامنے آئے گا۔ میرے اس اعتراض پر وہ بھونچکے رہ گئے اور انہوں نے اپنی تجویز کا متبادل جاننا چاہا۔ میں نے گزارش کی کہ رائٹرز گلڈ کو بہر حال ایک نیم سیاسی تنظیم کی حیثیت حاصل ہو گی، اس لیے ہمارے لیے بہترین راستہ یہ ہے کہ ہم دونوں صوبوں کے درمیان مساوات (Parity) کے اصول کو اختیار کریں۔ اس طرح کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان کم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور

انتظام گلڈ کے امیج کو داغدار کر دے گا اور اس کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔
میرے منہ سے ابھی الفاظ ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ مسٹر شہاب ایک دم کھڑے ہو گئے۔ وہ مارے غصّے کے کپکپا رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف انگلی اٹھائی اور دھاڑے، ''میاں، آئندہ پیریٹی کی بات نہیں کرنا۔ پچھلے دس برسوں میں جو کچھ بھی غلط ہوا ہے، پیریٹی کے نام پر ہی ہوا ہے''۔
جملۂ معترضہ کے طور پر عرض کر دوں کہ قدرت اللہ شہاب اس وقت صدر ایوب خان کے سیکرٹری جنرل تھے اور ان کی طاقت اور اثر ورسوخ کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔
اُن کے دوبدو آنا ''آ بیل مجھے مار'' کے مترادف تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے الفاظ نے اُن کو برانگیختہ کر دیا ہے لیکن پسپائی کا مطلب انصاف کا ''جھٹکا'' تھا جو مجھے منظور نہیں تھا۔ میں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جب تک وہ اپنی تجویز میں مناسب ترمیم نہیں کرتے، مَیں اس پورے عمل میں فریق بننے کو تیار نہیں ہوں۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ غصّے میں بھڑک اُٹھے اور واک آؤٹ کرنے کی دھمکی دی۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ وہ جو چاہیں کریں مگر ان کی تجویز مجھے منظور نہیں ہے۔ اس سے مشرقی پاکستان کی صورتحال مزید خراب ہوگی اور ان لوگوں کے ہاتھ میں ایک ہتھیار آجائے گا جو مشرقی پاکستان کے ساتھ مسلسل امتیاز برتنے کی بات کرتے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں تو انہوں نے جھنجلا کر مشرقی پاکستان کو ایگزیکٹو کمیٹی میں اکثریت کی پیشکش کی اور کہا کہ برابری کی بات نہیں کرو۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ مسٹر شہاب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اکیلے پڑ گئے ہیں۔ بالآخر انہیں مساوات (Parity) کے اصول کو ماننا پڑا اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے گیارہ گیارہ ممبروں کا فیصلہ ہو گیا۔
میں اس موقع کو اس لیے نہیں بھلا سکتا کہ مسٹر جسیم الدین اور مسٹر غلام مصطفیٰ کی طرف سے مجھے حمایت نہیں ملی، حالانکہ مجھے پتا تھا کہ کمیٹی کے اجلاس سے باہر آتے ہی خاص طور پر مسٹر جسیم الدین وہ پہلے شخص ہوں گے جو قدرت اللہ شہاب کی تجویز پر واویلا مچائیں گے اور اسے مغربی پاکستان کے نوآبادیاتی مزاج کے ثبوت کے طور پر پیش کریں گے۔ جبکہ اندر انہوں نے زبان

تک نہیں کھولی۔ اس کے برعکس جب جسیم الدین کا نقطۂ نظر پوچھا گیا تو انہوں نے شہاب کی تجویز کی تائید کی حالانکہ وہ خود کو بنگالی نیشنلزم کا چیمپئن گردانتے تھے۔ ظاہر ہے میں سوائے اظہار افسوس کے کر بھی کیا سکتا تھا۔

یہ واقعہ اس طرح کے عمومی واقعات کی نمائندہ مثال تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے تعلقات کو آہستہ آہستہ کیسے زہر آلود کیا گیا۔ بنگالیوں کی عادت تھی کہ وہ اس وقت آواز بلند نہیں کرتے تھے، جب کوئی غلط کام ہو رہا ہوتا تھا۔ بلکہ پیچھے پیچھے آپس میں کانا پھوسی زیادہ کرتے تھے۔ پھر سازش، امتیاز اور ناانصافی کا شور بلند کر دیتے تھے۔ موجودہ واقعہ میں بھی، اگر قدرت اللہ شہاب کی تجویز منظور ہو جاتی تو بڑی معصومیت سے اپنی مظلومیت کا رونا روتے لیکن اب جبکہ میں نے ان کی تکلیف پر آواز اُٹھانے کی ذمہ داری لے لی تو یہ اپنے مخصوص انداز میں مسٹر شہاب کی خوشامد میں لگ گئے اور اس طرح ظاہر کرنے لگے کہ جیسے میں نے منصفانہ نمائندگی کی بات کر کے شاید اپنی حد سے تجاوز کیا تھا۔

قدرت اللہ شہاب نے پہلے تین سال گزرنے پر مجھے ایگزیکٹو کمیٹی کی رکنیت سے ہٹا کر اپنا بدلہ لے لیا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے مجھے آدمجی ادبی انعامات کے ججوں کے پینل سے بھی ہٹا دیا۔ میری جگہ ڈاکٹر سرور مرشد کو نامزد کیا گیا جو اس وقت (۱۹۷۳ء میں) راجشاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور وہاں پر عوامی لیگ کے کرتا دھرتا تھے۔

میں نے مذکورہ واقعہ جان بوجھ کر ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ پاکستان میں کیوں معاملات ایک ایک کر کے ہاتھ سے نکلتے چلے گئے اور کس طرح خود مغربی پاکستانیوں کے تعاون سے بائیں بازو کے عناصر ایوانِ اقتدار میں داخل ہو گئے۔ اس واقعہ سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ زبان کی تحریک کیوں زور پکڑتی چلی گئی۔ اس لیے کہ اسے غذا تو خود مرکزی حکومت سے فراہم کی جا رہی تھی۔

مجھے ان معاملات کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا، جس کے لیے ہمیں بنگالی تحریک کے ابتدائی دور میں جانا پڑے گا۔

۲۱ فروری کے واقعے کی پہلی سالگرہ نسبتاً خاموشی سے گزر گئی تھی اور اس کا چشم دید میں خود

تھا۔ حکومت کی طرف سے جلوسوں کو روکنے کے لیے مکمل انتظام تھا اور لگتا تھا کہ کسی بھی گڑبڑ کو کچلنے کے لیے حکومت پوری طرح تیار ہے۔ لیکن ۲۱ فروری ۱۹۵۴ء تک سب کچھ بدل چکا تھا۔ بہت بڑے پیمانے پر تقاریب کا انتظام کیا گیا تھا۔ حکومت نے ان کو روکنے کے لیے یونیورسٹی پر دھاوا بول کر طلبہ کی ایک بڑی تعداد کو کلاس روم سے گرفتار کرلیا۔

اس موقع پر پولیس افسران کے جذبات کا تضاد محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ایک طرف تو وہ سرکاری ڈیوٹی سمجھ کر طلبہ کی بے دردی سے پٹائی کررہے تھے اور گرفتار بھی کررہے تھے تو دوسری طرف وہ ان کے ''عظیم مقصد'' کی وجہ سے ان سے ہمدردی بھی محسوس کررہے تھے۔

۱۹۵۴ء کے عام انتخابات کے بعد بنگالی زبان کی تحریک اگلے مرحلہ میں داخل ہوگئی۔ ان انتخابات کے نتیجے میں مسٹر نورالامین اور ان کی مسلم لیگ کا صفایا ہوگیا اور ان کی جگہ جگتو فرنٹ کی حکومت اقتدار پر فائز ہوگئی۔ جگتو فرنٹ میں عوامی لیگ، اے کے فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی اور بعض دوسرے گروپ شامل تھے۔ انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ۲۱ فروری کو عام تعطیل کا اعلان کردیا اور وعدہ کیا کہ جس جگہ یہ واقعہ پیش آیا تھا، وہاں ایک عظیم یادگار تعمیر کی جائے گی۔ تقریباً دو مہینے بعد جب مرکزی حکومت کو احساس ہوا کہ صوبائی حکومت کی سرگرمیاں حد سے بڑھ رہی ہیں تو اس نے روک ڈالنے کی کوشش کی مگر تعمیر کا کام تو شروع ہوچکا تھا۔

''شہید مینار'' ڈھاکا، بنگلہ قوم پرستی کا ''بنارس''

انیسواں باب

لسانی تحریک۔یادگار کی تعمیر

سیکشن 92-A نافذ کر کے اسکندر مرزا کی جگہ چوہدری خلیق الزماں کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا گیا لیکن گورنر کی تبدیلی بھی لسانی تحریک کے باعث پیدا ہونے والی خرابی کو روک نہیں سکی۔ یادگار ابھی ادھوری تھی، اینٹوں کی چُنائی سے بنا پلیٹ فارم اور کنکریٹ کے کالم اپنی نامکمل شکل میں مرکزی حکومت کے جبر و استبداد کی علامت بن گئے تھے۔ ماہ و سال گزرنے کے ساتھ ساتھ، طلبہ کی عقیدت اور سازشیوں کی لگن لسانی تحریک کو اندر ہی اندر پروان چڑھاتی چلی گئی۔

آخر کار مرکزی حکومت کی سوچ میں تبدیلی آئی۔ اب اُن کے خیال میں عوامی جذبات کے سامنے سپر ڈال دینے سے اس خرابی کا علاج ہو سکتا تھا اور مرکزی حکومت کی ساکھ کی بحالی بھی شاید اسی طرح ممکن تھی۔ نئے گورنر، جنرل اعظم خان، نے ۲۱ فروری کے دن کو صوبے بھر میں عام تعطیل قرار دے دیا اور لسانی تحریک کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین اس کے چیئرمین مقرر ہوئے اور آبادی کے مختلف طبقات کے افراد کو اس میں نمائندگی دی گئی۔ یونیورسٹی کی نمائندگی کے لیے منیر چودھری اور مجھے چنا گیا۔ دوسرے ممبروں میں بنگلہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر مسٹر علی احسن، کالج آف فائن آرٹس کے پرنسپل مسٹر زین العابدین، ڈھاکا میونسپلٹی کے وائس چیئرمین خواجہ خیر الدین اور حکومت کے نمائندے مسٹر موسیٰ شرف الدین شامل تھے۔

کمیٹی نے مختلف تجاویز کا جائزہ لیا، یادگار کے لیے تجویز کردہ مختلف نقشوں کو جانچا اور ان کے بنانے والوں سے گفتگو کی، موقع کا معائنہ کیا اور اُن بڑی دیوار گیر تصویروں (Murals) کو دیکھا جو ایک آرٹسٹ حمید الرحمٰن نے بنائی تھیں۔ مجھے اور کمیٹی کے ممبران کی اکثریت کو تعمیراتی نقشوں اور میورل نے قطعاً متاثر نہیں کیا۔ مجوزہ ڈیزائن کا تاثر تعمیراتی سے زیادہ تصویری تھا اور اُس میں فنِ مجسمہ سازی کے اصولوں کو بھی پیشِ نظر نہیں رکھا گیا تھا۔ تقریباً پچیس فٹ بلند چار

ستون جو درمیان سے بیس ڈگری جھکے ہوئے تھے اور آپس میں لوہے کی راڈوں سے جڑے تھے۔ ان راڈوں کے درمیان نقشین ورنگین شیشے نصب ہونے تھے۔ اس نقشے میں کوئی رمزیت تھی نہ اصل واقعہ سے کوئی مطابقت۔ اس یادگار سے صرف ہیبت اور تنفر کے جذبات ہی اُبھر سکتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ نقشین شیشوں سے اینٹوں کے پلیٹ فارم پر منعکس ہونے والی روشنی شہیدوں کے خون کی علامت ہوگی۔ لگتا تھا کہ اس ڈیزائن کا بنیادی تصور دینے والے آرٹسٹ مسٹر حمید الرحمٰن عکس اور انعکاس سے مغلوب ہوگئے تھے۔ انہیں فنِ تعمیر کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُنہیں جو ڈیزائن اچھا لگ رہا ہے، اُسے آرکیٹکٹ فنِ تعمیر کے حساب سے ڈھال لیں گے۔ سمجھنے کے لیے یہی بات کافی تھی کہ موصوف کو آرٹ اور فن سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ وہ اس حقیقت سے قطعی ناواقف تھے کہ ہر آرٹ میں حسن اس کے ذریعۂ اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک موسیقار جس کا ذریعہ اظہار آواز ہے، اُس تاثر کو گرفت میں نہیں لے سکتا جو الفاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک شاعر کے لیے ممکن نہیں کہ وہ الفاظ کی الٹ پھیر سے مصور کے کام کا تاثر پیدا کر سکے۔ ایک مجسمہ ساز اپنی تخلیق کو اس میں استعمال ہونے والے دھات، پتھر اور گارے کے لحاظ سے ڈھالتا ہے۔ ایک آرکیٹکٹ کو یاد رکھنا پڑتا ہے کہ اس کا ذریعۂ اظہار آواز کی طرح نازک ہے، نہ الفاظ کی طرح رموز و علامات کا مظہر اور جو اس حقیقت کو نہ سمجھے وہ آرٹسٹ تو بہر حال نہیں ہو سکتا!

مسٹر موسیٰ شرف الدین نے تجویز دی کہ اس جگہ پر ایک مسجد یا مینار بنا دیا جائے جو فنِ تعمیر کا خوبصورت نمونہ بھی ہو، اس سے خوبصورتی کے ساتھ جگہ کی تقدیس میں بھی اضافہ ہوگا۔ مسٹر زین العابدین نے بنگالی نیشنلسٹوں کی ترجمانی کا فریضہ سنبھالتے ہوئے، اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا اور متنبہ کیا کہ اصل منصوبے میں کسی قسم کی تبدیلی کا ناقابل بیان حد تک خطرناک ردِعمل ہوگا اور اسے تحریک سے غداری بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر محمود حسین نے، جو اِن دیوار گیر تصویروں میں کشیدہ بربریت کے مناظر سے پہلے ہی ہیبت زدہ ہو کر رہ گئے تھے محسوس کر لیا کہ مسٹر زین العابدین کی وارننگ کے بعد اس موضوع پر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا کمیٹی کو اس سفارش کے ساتھ اپنی کارروائی ختم کر دینی چاہیے کہ اصل منصوبے کو برقرار رکھا جائے۔

یہ تھا وہ ماحول، جس میں ہم جرأت اظہار بھی نہ کر سکے، اعتراض کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تعمیراتی سرگرمیاں بحال اور بدہیئت یادگار تعمیر ہوگئی۔ اس سے زیادہ بدنما یادگار شاید ہی دنیا میں کہیں اور دیکھی ہو! رنگین و نقشین شیشے دستیاب نہیں ہو سکے اور لوہے کی سلاخیں کھلی رہ گئی تھیں، پسلیوں کی طرح! سوچتا ہوں تو بات اب سمجھ میں آتی ہے کہ مسٹر زین العابدین نے مسجد اور مینار کی مخالفت کیوں کی تھی؟ اس لیے کہ اس سے اسلام سے وابستگی کا اظہار ہوتا تھا اور بنگالی نیشنلسٹ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں یاد دلایا جائے کہ مشرقی پاکستان کی آبادی کی غالب اکثریت مسلمان ہے۔ جو بات معمہ بنی، وہ یہ تھی کہ اسلامی فن تعمیر کو مسترد کر کے تعمیر کا ایسا نمونہ کیوں منتخب کیا گیا جو جمالیاتی اعتبار سے ناقص اور کریہہ المنظر تھا؟ آخر غیر مسلم دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں ایسی یادگاریں موجود ہیں جو نمونے کے طور پر اختیار کی جا سکتی تھیں۔ بات یہ تھی کہ نیشنلسٹ طبع زاد (Original) رہنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں اس یادگار کے ڈیزائن کی ذمہ داری ناپختہ اور کم علم لوگوں کے ذمہ تھی جو جوش و جذبہ سے علم اور ذوق کی کمی پوری کر رہے تھے۔ آخر چالیس لاکھ لوگوں نے اس یادگار کو جوں کا توں قبول کر ہی لیا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ ہم جیسے چند لوگوں کے نزدیک یہ یادگار بدصورت اور کریہہ المنظر تھی۔ اگر کبھی بات ہوتی تو ان کا استدلال یقیناً یہ ہوتا کہ یہ یادگار پرولتاری ذوق کی عکاس تھی اور بورژوائی مزاج کے افراد اس میں کیڑے نکالتے ہیں تو انہیں اس کی قطعاً پروا نہیں!

اب تک لسانی تحریک طلبہ کے درمیان ایک قومی تہوار کی سی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہاں لفظ تہوار غیر مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہر سال جمع ہونے والے لوگ ناچ گا کر ہی مرنے والوں سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے، انداز سوگ سے زیادہ جشن کا سا ہی ہوتا تھا۔ مرکزی حکومت نے خوشامد کی حد تک مفاہمانہ پالیسی اختیار کر لی تھی۔ پہلے تو بنگالی لکھاریوں کے لیے سالانہ آدمجی ادبی انعامات کا اعلان کیا، پھر سینٹرل بورڈ فار ڈویلپمنٹ آف بنگالی قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ مرکزی حکومت کے مالی وسائل سے چلنے والے اس بورڈ کا مقصد کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے بنگالی میں نصابی کتب تیار کرنا تھا۔ اسی طرح بنگالی اکیڈمی صوبے کے مالی وسائل سے قائم کی گئی جس کا مقصد بھی بنگالی زبان کے تخلیقی شاہپاروں کو ڈھیروں انعامات سے نوازنا تھا۔ ایک دوسرے صنعت کار، احمد داؤد کے خاندان نے بھی سنجیدہ موضوعات پر بنگالی

میں خامہ فرسائی کرنے والوں کے لیے بہت سے دوسرے انعامات کا اعلان کر دیا۔

مگر یہ سارے اقدامات اس تاثر کو دور کرنے میں ناکام رہے کہ مرکزی حکومت فی الحقیقت بنگالی ثقافت کو ملیامیٹ کر دینا چاہتی ہے۔ حکومت بنگالی پر جتنی سرمایہ کاری کر رہی تھی، یہ خیال زور پکڑتا جا رہا تھا کہ چپکے چپکے بنگالی کے خلاف سازش تیار کی جا رہی ہے۔ حکومت کی طرف سے بنگالی زبان کی سرپرستی کو تو مقامی پریس نے بالکل نظر انداز کر رکھا تھا لیکن کھلی بغاوت پر مبنی کسی خبر پر حکومت اگر کوئی کارروائی کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی کرتی تو پورا پریس یک زبان ہو کر اسے بنگالی ثقافت پر حملہ قرار دے دیتا تھا۔ میں اس سلسلے میں دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

پہلی تو ٹیگور کے بارے میں اختلافی بحث تھی۔ ٹیگور، اب مشرقی پاکستان کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نظر میں بنگالی ثقافت کا خصوصی مظہر بن چکا تھا۔ وہ اُس کی سالگرہ اور برسی کا اہتمام بڑے زور وشور سے کرتے تھے، مغربی بنگال میں ہونے والی ایسی کسی تقریب سے بھی کہیں زیادہ حکومت اس مہم کو پروان چڑھتے دیکھتی رہی۔ لیکن اُسے اس پر کسی قسم کی رکاوٹ ڈالنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ تاہم سازشیوں کو معلوم تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں، اسی لیے وہ بڑی مہارت سے اس کھیل کو آگے بڑھاتے رہے۔ اُن کے دو مقاصد تھے جنہیں وہ بیک وقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پہلا تو یہ کہ وہ نئی نسل کو قائل کرنا چاہتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی اور تہذیبی فرق کی اور نظریۂ پاکستان کی باتیں بے بنیاد تھیں۔ کیا ٹیگور تمام بنگالیوں کے لیے بلالحاظ اس کے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، یکساں کشش نہیں رکھتا؟ اُن کا دوسرا مقصد بنگالی نوجوانوں کو یہ باور کرانا تھا کہ مرکزی حکومت، ہندوؤں سے نفرت کے نام پر، اُنہیں اُن کے عظیم ثقافتی ورثہ سے محروم کرنا چاہتی ہے اور یہ سب کچھ کرنا بہت آسان تھا۔ نوجوانوں کو بھڑکایا گیا کہ وہ ٹیگور پرستی کے معاملے میں انتظامیہ کی تیکھی نظر کو خاطر میں نہ لائیں اور ردِّعمل میں تہذیب وشائستگی کی تمام حدیں پھلانگ جائیں۔ حکومت کے کسی بھی اقدام کو بنگالی ثقافت پر حملہ قرار دینا تو معمول کی بات تھی۔ مثلاً مخلوط ثقافتی محفلوں پر اصرار کیا جاتا تھا تاکہ ثقافتی آزادی کے نام پر طے شدہ اَقدار کو مجروح کیا جا سکے لیکن معاشرے کی مسلّمہ روایات کے پیشِ نظر اٹھائے جانے والے کسی بھی اعتراض کو بنگالی ثقافت میں براہِ راست مداخلت قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے کسی اعتراض کی غیر موجودگی

میں وہ خود بے مزہ ہو جاتے تھے!

ٹیگور کی صد سالہ تقریبات اس سلسلے کی ایک اور مثال ہے۔ کسی نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ مشرقی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے بھرپور تعاون کیا۔ میں نے بھی ایک مقالہ پیش کیا۔ میرا بنیادی استدلال یہ تھا کہ دنیا میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جہاں ایک ہی زبان کئی ملکوں میں بولی جاتی ہے۔ میں نے بتایا کہ بلجیم، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور کینیڈا میں فرانسیسی بولی جاتی ہے، جبکہ آسٹریا اور جرمنی جرمن زبان کا مرکز ہیں۔ اسی طرح انگلینڈ اور امریکا میں انگریزی مشترک ہے۔ میں نے واضح کیا کہ ان میں سے ہر ملک اپنی ایک علیحدہ شناخت رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک مشترکہ ادبی میراث رکھتے ہیں، اس چکر میں پڑے بغیر کہ قومی ادب کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ میرا سوال تھا کہ آخر ٹیگور کی نثر و نظم کو اور اس میں پیش کی جانے والی تہذیب کو پاکستانی یا غیر پاکستانی قرار دیے بغیر ہم بنگالی ادب کے لازمی جزو کے طور پر کیوں نہیں پڑھ اور سمجھ سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ منتظمین نے مجھے ٹیگور پر لکھنے کے لیے کیوں آمادہ کیا؟ اس لیے نہیں کہ وہ ٹیگور پر مختلف النوع آرا پیش کرنا چاہتے تھے، بلکہ وہ مجھ سے اعتراف جرم کروانا چاہتے تھے۔ جی ہاں، اعتراف جرم! اس بات کا کہ ٹیگور بنگالیوں کی مشترکہ ادبی میراث تھا (وہ میرے مقالے کو اعترافِ جرم ہی سمجھتے تھے۔ حالانکہ میں نے بغیر کسی ادنیٰ بددیانتی کے اپنی مخلصانہ رائے پیش کی تھی)۔ میرے مقالہ پیش کرنے سے اُن کا فوری مقصد حاصل ہو گیا۔ اسی لیے انہوں نے اِسے اُس یادگاری مجلے میں شامل نہیں کیا جو بعد میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ بنگلہ کے ڈاکٹر انیس الزماں نے شائع کروایا تھا۔

جشنِ ٹیگور کی تقریبات کے پشت پر موجود مکروہ عزائم ۱۹۶۷ء میں اُس وقت اور کُھل کر سامنے آ گئے جب وزیرِ اطلاعات خواجہ شہاب الدین کے ایک پالیسی بیان پر بحث چھڑ گئی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد جب پاک بھارت تناؤ میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ بالکل فطری تھا کہ حکومت ایسے کسی اقدام کی ہمت افزائی نہ کرے جس سے دشمن ملک کے حق میں فضا ہموار ہو۔ میں نے وزیرِ محترم کی تقریر کا متن تو نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ آئندہ ریڈیو پاکستان سے، بلالحاظ شاعر، ایسے نغمے نشر نہیں کیے جائیں گے جو ملک کے بنیادی نظریے

کے خلاف ہوں۔ حکومتی سطح پر دیے جانے والے دوسرے سکہ بند بیانات کی طرح اس پر بھی کسی نے توجہ نہیں دی۔ لیکن ''پاکستان آبزرور'' نے اسے ایک خاص انداز میں چھاپا اور آگ لگا دی۔ ٹیگور کے چاہنے والے بھڑک اٹھے۔ سرخی کچھ اس طرح تھی، ''ریڈیو پاکستان میں ٹیگور کا داخلہ بند''۔ حالانکہ اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی گئی تھی لیکن خبر چھاپنے والوں کا مقصد حاصل ہو گیا۔ اشتعال جنگل کی آگ کی طرح چہار سو پھیل گیا۔ بلند آہنگ مظاہروں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پورے مشرقی پاکستان میں نوجوانوں کی تنظیموں کو ''بنگالی ثقافت پر ہونے والے حملے'' سے دفاع کے لیے چوکس کر دیا گیا۔ روزانہ جلسے ہو رہے تھے اور قراردادیں منظور ہو رہی تھیں کہ فیصلہ واپس لو۔ خواجہ شہاب الدین نے، جن کی بنگالی سے واقفیت واجبی سی تھی، اس ردِعمل سے گھبرا کر نیشنل اسمبلی میں ایک وضاحتی بیان دے ڈالا جس نے صورتحال کو اور خراب کر دیا۔ ایک اصولی موقف پر ڈٹے رہنے کے بجائے انہوں نے اس بات پر معذرت کر لی کہ وہ شاید ایک غلط فہمی کو جنم دینے کا سبب بن گئے تھے۔ اُن کی یہ وضاحت سازشیوں کے نزدیک شرمناک پسپائی کے مترادف تھی۔ اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور ہر طرف فتح کے نعرے گونجنے لگے۔

مشرقی پاکستان کے وہ لوگ جنہوں نے نیشنلسٹوں کے غیظ و غضب اور لایعنی شدت پسندی کی مذمت کی جرأت کی تھی، اب اپنی نظروں میں آپ حقیر ہو کر رہ گئے تھے۔ مصنفین اور یونیورسٹی کے اساتذہ پر مشتمل چالیس افراد کے ایک گروپ نے بیان میں دعویٰ کیا کہ ''ٹیگور بنگالی ثقافت کا لازمی جزو ہے''۔ اُن کے بیان میں پاکستانی ثقافت کی تکذیب اور پاکستانی قومیت کا کھلم کھلا انکار بھی شامل تھا۔ میرے خیال میں ایسے کسی بیان کو بلا روک ٹوک پھیلنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی، لہٰذا پانچ افراد نے، جن میں میرے علاوہ شعبۂ انگریزی کے مسٹر کے ایم اے منعم، شعبۂ تاریخ کے ڈاکٹر مہر علی، فیکلٹی آف لا کے ڈین پروفیسر شہاب الدین اور شعبۂ ریاضی کے ریڈر مسٹر اے ایف ایم عبدالرحمٰن شامل تھے، اپنے تین جملوں پر مشتمل ایک بیان میں عوام کو متنبہ کیا کہ ہمارے ان نادان دوستوں نے جو زبان استعمال کی، اُس کا لازمی مطلب یہی نکلتا ہے کہ وہ پاکستانی اور بھارتی ثقافت کے فرق کو ملیامیٹ کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے اس بیان کا ردِعمل وزیر کے بیان پر آنے والے ردِعمل سے مختلف نہیں تھا۔ ہمیں ایوب

خان کا ایجنٹ قرار دے کر ہماری مذمت کی گئی۔ ہمارے بیان کا مکمل متن سوائے مارننگ نیوز کے کسی اخبار نے نہیں چھاپا۔ دوسرے اخباروں نے صرف اتنا لکھا کہ ہم نے حکومت کے موقف کی تائید کی ہے جو ایک ناقابل معافی جرم تھا۔

اس تنازعے نے یونیورسٹی کے دونوں گروپوں کے درمیان بُعدالمشرقین (Polarization) پیدا کر دیا تھا۔ ایک گروپ وہ تھا جس نے پاکستان سے وفاداری کو ترک کر دیا تھا، دوسرا وہ جو دوقومی نظریہ کو مضبوطی سے تھامے ہوا تھا!

اب لسانی تحریک بنگالی ثقافت کو بچانے کی تحریک کا روپ دھار چکی تھی۔ اس کا علیحدہ سے کوئی قابل ذکر کردار نہیں رہا تھا۔ اس کے لیڈروں نے اب کھلم کھلا پاکستان سے علیحدگی کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ ریڈیو، پریس اور ٹیلی وژن سارے ذرائع ابلاغ نظریۂ پاکستان پر چڑھ دوڑے تھے۔ ہم دم بخود ہو کر رہ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ حکومت اپنے اختیارات سے دست بردار ہو چکی ہے۔ دن بدن صورتحال بگڑتی چلی جارہی تھی۔ جو گروہ ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات کا مختارِکل بنا ہوا تھا، اُن میں منیر چوہدری، رفیق الاسلام، سراج الاسلام چودھری اور نیلما ابراہیم جیسے لوگ شامل تھے۔ ان سب کا تعلق ڈھاکا یونیورسٹی سے تھا۔ یہ بزعم خود بنگالی ثقافت کے پاسبان بنے ہوئے تھے اور انہوں نے اس کے خلاف ہونے والی سازشوں اور اس کے دشمنوں کو بے نقاب کرنے کا ٹھیکہ اُٹھا رکھا تھا۔

اس پوری صورتحال کا اندازہ ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر شہیداللہ کی تجویز پر ڈھاکا یونیورسٹی کی طرف سے ہجّوں کی اصلاحات (Spelling Reforms) کے لیے قائم ہونے والی کمیٹی کے کام پر ہونے والے ردعمل سے بھی ہو سکتا ہے۔ آج ڈاکٹر شہیداللہ کو بنگالی کا دشمن کہنا بہت مشکل کام ہے مگر بظاہر ناممکن یہ کارنامہ بھی انجام دے ہی دیا گیا۔ جو طریقہ استعمال کیا گیا وہ عجیب تو تھا ہی مگر غیر اخلاقی بھی تھا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ پندرہ ارکان پر مشتمل ایک بڑی کمیٹی تھی جن میں دیگر افراد کے علاوہ ڈھاکا یونیورسٹی میں بنگالی کے پروفیسر مسٹر کے ایم اے حیٔ، مسٹر منیر چوہدری، ڈاکٹر انعام الحق، مسٹر ابراہیم خان، مسٹر ابوالقاسم اور راقم شامل تھے۔ مسٹر حیٔ، مسٹر منیر چوہدری اور

ڈاکٹر انعام الحق ایک علیحدہ گروپ بنا کر بیٹھ گئے اور انہوں نے علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ کمیٹی سے ذرا بھی تعاون نہیں کریں گے۔ اُن کی منطق بڑی عجیب سی تھی، وہ کہتے تھے کہ وہ اس ضمن میں کسی بھی قسم کی اصلاحات کی حمایت نہیں کر سکتے۔ وقت ناساز گار تھا، ہم ان سے اُلجھ نہیں سکتے تھے۔ انہیں یاد دلایا گیا کہ وہ تینوں بنگالی اکیڈمی کی چند برس پہلے قائم ہونے والی اسی طرح کی ایک کمیٹی کے رکن تھے اور ہجّوں کے سلسلے میں کی جانے والی اصلاحات (Spelling Reforms) کی سفارشات پر ان کے بھی دستخط تھے۔ انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا کہ اب صورتحال بدل چکی ہے اور اب وہ ان سفارشات کی حمایت نہیں کر سکتے۔ ان کا یہ ٹکا سا جواب سن کر ہم منہ تکتے رہ گئے۔ اُن کی علمی بددیانتی اپنی حدوں کو چھو رہی تھی۔ یہ تینوں بنگلہ اکیڈمی کی کمیٹی میں اپنی ہی پیش کردہ تجاویز پر دوبارہ غور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے!

شہید اللہ کمیٹی بالآخر انہی تجاویز کو دوبارہ پیش کر پائی جو اس سے پہلے بنگلہ اکیڈمی کی طرف سے سامنے آ چکی تھیں۔ کمیٹی نے اس بات پر زور دیا کہ ان سفارشات پر جلد عمل کیا جائے۔ یہ سفارشات اکیڈمک کونسل نے ماسوا ڈاکٹر عبدالحیٔ اور کبیر چوہدری (منیر چوہدری کے بڑے بھائی) کے ووٹوں کے بالاتفاق منظور کر لی تھیں۔ اگلے روز میں نے یونیورسٹی کی طرف سے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں ان مقاصد کو اجاگر کیا گیا تھا جو شہید اللہ کمیٹی کے پیشِ نظر تھے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی کہ ڈاکٹر شہید اللہ، کمیٹی کے کام مکمل ہونے سے پہلے ہی فالج کا شکار ہو گئے تھے اور کمیٹی کی کارروائی میں عملاً حصّہ نہیں لے سکے تھے۔ وہ اُس اختلافی بحث سے بھی دور رہے جو اَب پیدا کی جا رہی تھی۔ البتہ کمیٹی نے جو تجاویز پیش کی تھیں، ان کے خالق وہی تھے۔ تمام ممبروں میں اس کام کے لیے وہی سب سے موزوں شخصیت تھے۔ اس لیے کہ وہ مشرقی زبانوں کے فنِ لسانیات (Philologiy) اور بنگالی زبان کے فنِ ہجّہ (Orthography) کے ماہر تھے۔ ہم نے اپنی تجاویز کو ان کے خیالات کا تابع ہی رکھا۔ تاہم کمیٹی کی کارروائی میں مَیں نے زیادہ حصہ نہیں لیا۔ بس شروع کی ایک آدھ میٹنگ میں ہی شریک ہوا ہوں گا۔ میں کسی تنازعہ کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ گو کہ اسپیلنگ ریفارمز میرے دل کی آواز تھی مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ متنازعہ ہو کر پوری اسکیم ہی غارت ہو جائے۔ مجھے اندازہ تھا کہ جس طرح میرے پچھلے

مقالے میں ٹیگور کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی گئی تھیں، اسی طرح اب بھی میری ذات پر کیچڑ اُچھالا جاسکتا ہے۔

باوجود اس کے کہ میں نے احتیاطاً اس کام میں کھلم کھلا شرکت سے اجتناب برتا، پھر بھی اس کے ردِعمل کا نشانہ بننے سے نہیں بچ سکا۔ اکیڈمک کونسل کی میٹنگ کے ایک ہفتے کے اندر ہی مسٹر ایم اے حئی اور ان کے حواریوں نے میرے خلاف جلوس نکال دیا۔ اُس دن تقریباً ساڑھے بارہ بجے دوپہر جب میں آرٹس بلڈنگ میں واقع اپنے کمرے میں کھانا کھا رہا تھا، مجھے نعروں کی آواز سنائی دی۔ باہر نکل کر صورتحال جاننے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ تقریباً بیس تیس طلبہ کا ایک گروہ میرے خلاف نعرے لگاتا ہوا بلڈنگ کی راہداریوں میں گشت کر رہا تھا۔ ان لڑکوں کا تعلق مختلف شعبہ جات سے تھا، البتہ ان میں میرے شعبہ سے تعلق رکھنے والا کوئی طالبعلم نہیں تھا۔ یہ سب میرے قریب سے گزر گئے مگر میرے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی انہیں ہمت نہیں ہوئی۔ میں دل ہی دل میں مزے لیتا رہا۔

اس مرحلے پر میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بنگالی زبان کے لیے یہ جوش و جذبہ صرف طلبہ برادری میں ہی تھا۔ انہیں تعلیم یافتہ طبقے کے ایک حصے کی ہی پشت پناہی حاصل تھی جن میں زیادہ تر اساتذہ، وکلا اور بیوروکریٹ شامل تھے۔ جہاں تک عوام، مزدور اور کسان کا تعلق ہے، انہیں اس پورے مسئلے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انہیں کیا سمجھ میں آتا کہ بنگالی زبان کس طرح سے خطرے میں ہے۔ انہیں تو اپنی عملی زندگی میں بنگالی میں بحیثیت زبان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ یہ عدالتوں میں، ڈاکخانوں میں اسی طرح استعمال ہو رہی تھی۔ ان کے جو بچے پرائمری میں تھے، اُسی طرح بنگالی پڑھ رہے تھے۔ کوئی بھی نہیں کہہ رہا تھا کہ بنگالی نہ پڑھائی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ طلبہ کے لاکھ جتن کے باوجود لسانی تحریک کو اس طبقے میں سے ایک بھی حامی نہیں ملا۔ بالخصوص کسان طبقے کو دیہات کے اسکولوں میں بننے والی یادگاروں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حکومت اگر دلچسپی لیتی اور دہقانوں کے علم میں لاتی کہ ہمارے سرکش نوجوان کس طرح دورِ جاہلیت کا ایک اور بت ہم پر مسلط کر رہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ عوام اُٹھ کھڑے ہوتے اور ان ساری یادگاروں کو ڈھا دیتے۔ لیکن ہماری مرکزی اور صوبائی

حکومتوں کی مسلسل پسپائی کی پالیسی سے یہ تاثر مضبوط ہوا کہ صرف اور صرف طلبہ ہی رائے عامہ کے نمائندے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر زبان کے مسئلے پر ریفرنڈم کرالیا جاتا تو اتنا وقت گزر جانے کے باوجود، ۱۹۵۸ء میں بھی عوام کی واضح اکثریت اردو کے حق میں ووٹ دیتی۔ مگر جن کے ہاتھ میں معاملات کی باگ ڈور تھی، وہ ایسے کسی مسئلے پر عوام کے سامنے جانے کی ہمت ہی نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو عوام سے اتنے دور تھے کہ انہیں تو طلبہ کی مخالفت میں با آواز بلند بات کرنے کا بھی یارا نہ تھا۔ مسٹر نورالامین ۱۹۵۲ء کی فائرنگ کے بعد اتنے بددل اور بے حوصلہ ہو گئے تھے کہ وہ ۱۹۷۰ء تک تمام عرصہ فائرنگ سے لاتعلقی کا اظہار کر کے نوجوانوں میں اپنا کھویا ہوا مقام بحال کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مسٹر فضل الرحمٰن، مرکزی وزیرِ تعلیم، جو زبان کے مسئلے پر اپنا ایک واضح اور مضبوط مؤقف رکھتے تھے، کبھی بھی مقبول سیاستدان نہیں رہے۔ آپ اُن سے یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ وہ لچھے دار تقریروں سے لوگوں کو متاثر کر لیں گے۔ ہاں، وہ جوڑ توڑ کے ماہر تھے اور بڑی کامیابی سے لوگوں کو لڑوا کر اپنا کام نکالنا جانتے تھے۔ خواجہ ناظم الدین بنگالی سے نابلد تھے، علاوہ ازیں وہ دانشورانہ معاملات سے دور ہی رہتے تھے۔ مرکزی اور صوبائی کابینہ کے دوسرے ارکان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ مشرقی پاکستان کا بینہ کے واحد دانشور اور قلمکار رکن مسٹر حبیب اللہ بحر جلد اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ دیکھا جائے تو اس حوالے سے یہ ایک بڑا نقصان تھا۔ اس لیے کہ وہ اتنے قابل تھے کہ پوری طلبہ تحریک کا وہ تنِ تنہا بھی مقابلہ کر لیتے۔ اُن کی نظریۂ پاکستان سے وابستگی کسی شک وشبہ سے بالاتر تھی اور کامیاب بنگالی قلمکار کی حیثیت سے ان کا ریکارڈ شاندار تھا۔

آپ اسے جو نام چاہے دے لیں لیکن بدقسمتی، غلط فیصلے، عوام سے لاتعلقی، عوام کے مزاج کو سمجھنے میں ناکامی، بہرحال یہی وہ عناصر تھے جنہوں نے فائرنگ کے ایک چھوٹے سے واقعہ کو پاکستان کی قومی زندگی کے ایک بہت بڑے سانحے میں تبدیل کر دیا۔ انہی کے دم سے ہر آنے والا دِن سازشیوں کو مضبوط کرتا رہا اور سانحۂ ۱۹۷۱ء کی راہ قدم بہ قدم ہموار ہوتی چلی گئی۔

بیسواں باب

سیاست اور ثقافت پر حملہ

پاکستان کی سیاست پر حملہ، ثقافتی حملے کے ساتھ ساتھ ہی ہوا۔ ان دونوں کا الگ الگ تجزیہ کرنا تو ممکن نہیں تاہم پاکستان میں ہونے والی سیاسی پیش رفت کا الگ سے جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد، جبکہ ڈھاکا میں نئی حکومت صحیح طرح سے کام بھی شروع نہیں کر پائی تھی، دوقومی نظریے کے خلاف مہم شروع کر دی گئی تھی۔ کہا جانے لگا تھا کہ دو قومی نظریہ نئے تناظر میں درست نہیں ہے اور اگر اس پر اصرار کیا گیا تو بنگال کے مزید ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال میں آٹھ سے نو فیصد ہندو بھی آباد تھے۔ کیا کل کو وہ اپنے لیے آزاد ریاست کے قیام کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے؟

اندازہ لگایئے کہ یہ مہم کتنی ہوشیاری اور مہارت سے چلائی جارہی تھی۔ ہندوستان کے وسیع تر تناظر میں پروان چڑھنے والے دوقومی نظریے کا قد گھٹایا جارہا تھا۔ دوقومی نظریے کو قریہ قریہ، گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس کے من مانے منطقی انجام تک دھکیلنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ جنہیں ماضی کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا، انہیں گمراہ کیا جارہا تھا۔ دوقومی نظریے کے بارے میں جو کچھ کہا جارہا تھا، اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا تھا کہ فرانسیسی اور جرمن دو جداگانہ قومیں ہیں لہٰذا فرانس میں جرمن اقلیت کو اور جرمنی میں فرانسیسی اقلیت کو حق تھا کہ علیحدگی کا اعلان کر دیں!

دوقومی نظریے کے خلاف کانگریس کی منطق یہ تھی کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ خالص ہندو آبادیوں یا خالص مسلم آبادیوں کا تعین کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے اُن کے نزدیک پاکستان کا قیام ایک بے معنی بات تھی۔ اب جبکہ پاکستان معرض وجود میں آچکا تھا، وہ اسی دلیل کو پاکستان کی نظریاتی اساس کو کمزور کرنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ دشمن پاکستان کو ختم کرنے کی تجویز براہ راست تو پیش نہیں کر سکتا تھا، تاہم اُس نے اس بات

پر زور دینا شروع کر دیا کہ ملک کی بقا کا انحصار اس کی بنیادوں کو تیزی سے ''مستحکم'' کیے جانے پر ہے۔ اور ان بنیادوں کو ''مستحکم'' کرنے کے لیے جداگانہ طریق انتخابات کو ختم کر دینا ضروری تھا۔ ''ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکساں سیاسی حقوق ملنے چاہئیں تاکہ دونوں یکساں وفاداری کے ساتھ اپنی شہری ذمہ داریاں نبھا سکیں''۔ یہ کوئی نرالی منطق نہیں تھی۔ نئی نسل، خاص طور پر یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبہ اس منطق سے متاثر تھے، اس لیے کہ وہ نصابی کتابوں میں جدید سیاسی نظریات کے مطابق قوم پرستی (Nationalism) کے بارے میں جو کچھ پڑھتے تھے، یہ اُس سے قریب تر تھا۔ جبکہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی سیاسی حقیقتیں ان کو اپنے کتابی نظریات سے متضاد لگتی تھیں۔ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے آتے آتے لوگوں کے ذہن سے پاکستان کی جدوجہد کے بارے میں معلومات معدوم ہو چکی تھیں۔ جن لوگوں کو حقائق کا علم تھا، وہ بھی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر سامنے نہیں آ رہے تھے۔ بلکہ ان میں سے بعض نے تو جداگانہ انتخابات کے بارے میں بڑے احمقانہ اور لایعنی قسم کے بیانات دینے شروع کر دیے تھے۔ اور تو اور خود سہروردی صاحب نے اس مسئلے کو پارلیمنٹ میں اُٹھایا اور بالآخر قومی اسمبلی کو بڑی چابکدستی سے قائل کر لیا کہ جداگانہ طرزِ انتخاب کو ختم کر دینا پاکستان کے اپنے مفاد میں تھا۔ اس طرح بیک جنبشِ قلم پاکستان کے بنیادی نظریے کو جڑ پکڑنے سے پہلے ہی خطرے میں ڈال دیا گیا۔

مسٹر حسین شہید سہروردی نے قومی اسمبلی میں جو دلائل پیش کیے، اُن میں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ جداگانہ انتخابات ختم کرنے سے اسمبلی میں مسلمانوں کی نشستوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے اب ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کو علیحدہ نشست دینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بات تو اپنی جگہ صحیح تھی لیکن اب مسلمان امیدواروں کو ہندو ووٹروں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے نہ صرف دین کے ساتھ اپنی وابستگی چھپانا پڑ جاتی بلکہ ماضی کے اپنے بہت سے سیاسی عقائد کو بھی جھٹلانا پڑ جاتا۔ ظاہر ہے، آپ ہندو ووٹروں کے پاس یہ کہہ کر تو ووٹ لینے جانے سے رہے کہ اسلامی نظریات کو استحکام کی ضرورت ہے، یا مسلمانوں کے تہذیبی مفادات کے تحفظ کے لیے جن اقدامات کی ضرورت ہے، آپ اُن کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیں گے۔ اب سارا زور سیکولرازم پر ہو گیا تھا اور ہندوستانی تناظر میں سیکولرازم کا مطلب تھا کہ ہندو تو اپنے مذہب اور

فلسفے کے پرچار کے لیے آزاد ہیں مگر مسلم روایات اور عقائد کی بات کرنا تنگ نظری کی علامت اور دورِ جدید کے تقاضوں کے منافی ہے۔

برِصغیر کی سیاست میں مذہب کے مقام سے متعلق اختلافی بحث کو بڑے سلیقے سے دوبارہ چھیڑا گیا تھا۔ مقصد تھا کہ مسئلے کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اِدھر اُدھر کی باتوں میں اڑا دیا جائے۔ طلبہ جو اپنے اساتذہ سے سیکھتے تھے کہ مذہب کسی بھی فرد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے، اُن پر زور دیا جاتا تھا کہ وہ اس بات پر بھی غور کریں کہ مذہب کے نام پر ریاست اور حکومت کا قیام کیا مشق فضول نہیں تھی؟ جی ہاں، یہ ماننے کے بعد کہ مذہب تو محض ایک ذاتی معاملہ ہے، طلبہ یہ نہیں سوچیں گے کہ اُن کے بزرگوں نے مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم قبول کرنے کی غلطی کیوں کی؟

قیامِ پاکستان کے بعد کے برسوں میں جبکہ ہندوؤں کا بالائی طبقہ بھارت کی طرف ہجرت کر چکا تھا، ہندو اور مسلمانوں کا بطور حریف آمنا سامنا اتنا زیادہ نہیں تھا۔ مسلمان بچوں کا ہندوؤں سے رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ذات پات اور چھوت چھات کا نظام جس نے برِصغیر کی پوری سیاست کو آلودہ کر رکھا تھا اور جس کے بارے میں وہ کتابوں میں پڑھتے تھے، اُن کی سمجھ سے بالاتر تھا، اس لیے کہ ان کا اس سے عملاً واسطہ نہیں پڑا تھا۔ مسلم لیگی چاہے جو کرلیں، آزادی کے بعد کی نئی نسل کو اس بات پر قائل کر لینا بہت آسان تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق کو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ نسل پرست ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں نے جو بھی زیادتیاں سہیں، وہ تو شکوک و شبہات کی دھند میں اب قصہ کہانی بن چکی تھیں۔

پاکستان کی بنیادوں کے بارے میں پیدا کیے جانے والے شکوک و شبہات اب باقاعدہ نظریہ کا روپ دھار رہے تھے۔ مسٹر قمرالدین احمد کی "The Social History of East Pakistan" پہلی کتاب تھی جس نے دوقومی نظریے کو متنازعہ بنایا۔ اس کے بعد مسٹر بدرالدین عمر نے بنگالی زبان میں کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا جس میں برِصغیر ہند کی سیاست اور ثقافت کا، مشرقی پاکستان کے خصوصی حوالے کے ساتھ، جدید اور ترقی پسند انداز میں تجزیہ کیا گیا۔ اس سلسلۂ کتب میں مصنف نے اُن رجحانات اور نظریات کا مضحکہ اُڑایا جو بالآخر پاکستان کی تخلیق کا سبب بنے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''ہماری ثقافت کا بحران'' کے نام سے شائع ہوئی جس

میں مصنف نے دعویٰ کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی زندگی اور رہن سہن کے انداز بالکل یکساں تھے اور شادی بیاہ کی رسومات کے علاوہ ان میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تھا۔ حقائق کے برعکس اُس کا یہ بھی کہنا تھا کہ اُن کا کھانا پینا اور لباس سب یکساں تھے بلکہ اُس نے تو اشارۃً یہاں تک کہہ دیا کہ اُن کے مراسمِ عبادت تک ملتے جلتے تھے۔ مصنف کے مطابق یہ فرقہ پرست لیڈروں کی کارستانی تھی جس نے مسلمانوں کو بھڑکا کر قائل کیا کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں یا یہ کہ برصغیر کی تاریخ میں ان کے ہیرو بقیہ آبادی کے ہیروؤں سے مختلف تھے، وغیرہ وغیرہ۔ تھیں نا عجیب سی دلیلیں! یہ تو پھر بھی قابلِ بحث بات ہوسکتی تھی کہ ہندو اور مسلمان علیحدہ قومیں ہیں یا نہیں۔ لیکن اُن کی سماجی اور مذہبی زندگی میں پائے جانے والے فرق کو جھٹلانا انتہائی نامعقول، جھوٹی اور تعجب خیز بات تھی جس کی کم از کم کسی پڑھے لکھے آدمی سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسا کہ کوئی یہ کہے کہ چونکہ چاول، آٹا، آلو، گوشت، مچھلی یا دودھ وغیرہ ساری دنیا کے لوگوں کی غذا کے اجزا ہیں لہٰذا امریکا اور روس کے لوگوں کی غذائی اطوار کو مختلف نہیں کہنا چاہیے۔ اگر بات کو صرف لازمی ضرورتوں تک محدود کر دیا جائے تو دنیا کے سارے لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ کیا ہم سب زندہ رہنے کے لیے کھانا نہیں کھاتے؟ کیا موسم کے سرد و گرم سے بچنے کے لیے ہم میں سے ہر آدمی کپڑے نہیں پہنتا؟ کیا سر چھپانے کے لیے گھر ہم سب کی ضرورت نہیں؟ کیا ہر شخص کسی خاندان یا کسی کمیونٹی کا حصہ نہیں ہوتا؟ اگر ایسا ہے تو کیا ساری دنیا کے لوگ ایک ہی قوم ہو گئے؟

مسٹر عمر نے جو کچھ لکھا اُسے ہٹ دھرمی کے سوا کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ جی ہاں! ہٹ دھرمی، مگر ایک واضح مقصد اور منصوبے کے ساتھ! اس لیے کہ مصنف کے دلائل ترقی پسندی کے جامے میں ملبوس تھے اور ناپختہ اور معصوم ذہنوں کے لیے کشش رکھتے تھے۔

مجھ سے راجشاہی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے سربراہ مسٹر ظل الرحمٰن صدیقی نے اپنے مجلّے میں مسٹر بدرالدین عمر کی مذکورہ بالا کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا جو میں نے کیا اور کوشش کی کہ اُس میں اُٹھائے گئے نکات کا مدلّل جواب دوں۔ میں نے اپنی بات کا آغاز اس نکتے سے کیا کہ مسٹر بدرالدین عمر کی کتاب نے ان سیاسی بحثوں اور تنازعات کو زندہ کرنے کی کوشش

کی ہے جو ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے ساتھ ہی طے پا گئے تھے۔ مجلّے کے اگلے ہی شمارے میں مصنف کا جواب موجود تھا۔ لہجہ بڑا تند، ناشائستہ اور جارحانہ تھا۔ مسٹر عمر کا کہنا تھا کہ اگر وہ قاری کو ۱۹۴۷ء سے قبل کے زمانے میں لے جا رہے تھے تو میں بھی تو اپنے دلائل کی روشنی میں اُن کو چودہ سو سال قبل تاریخ اسلام کے دورِ اول میں لے جا رہا تھا۔ تاہم پورے مضمون میں اُن دلائل اور نکات کا کوئی جواب نہیں تھا جو میں نے اپنے تبصرے میں اُٹھائے تھے۔ البتہ میری اس بے باکانہ رائے کے تناظر میں کہ وہ نظریۂ پاکستان پر ایمان نہیں رکھتے، وہ کچھ خوف زدہ سے ہو گئے تھے۔ ان کا پورا زور یہ ثابت کرنے پر تھا کہ وہ غدار نہیں مگر وقت نے ثابت کیا کہ وہ غدار کے سوا کچھ نہیں تھے۔

ایک طرف تو راجشاہی یونیورسٹی کے مسٹر عمر اور ڈھاکا یونیورسٹی کے مسٹر عبدالرزاق جیسے لوگ پاکستان کے بنیادی نظریے کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے بلکہ اس پر کھلم کھلا حملے کر رہے تھے اور دوسری طرف ہمارے سیاستدان ایک سے بڑھ کر ایک فاش غلطیاں کر رہے تھے۔ میرے خیال میں سیاستدانوں کی سب سے بڑی غلطی تو یہ تھی کہ وہ وقت کے مسائل کو پیشِ نظر رکھ کر اُن کے کسی مکمل دستوری حل کے لیے کوشاں تھے۔ انہیں اس سے زیادہ عملی سوچ کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ کیا حرج تھا اگر وہ مکمل دستور سازی کے بجائے مرحلہ بہ مرحلہ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ میں حسبِ ضرورت ترمیم کرتے رہتے۔ آخر ایسی کون سی ضرورت آن پڑی تھی کہ اس وقت ایک مکمل، ہر نقطۂ نگاہ کو سمونے والا اور ہر زاویے سے بے نقص دستور لازماً بنایا جاتا۔ برطانیہ کی مثال سامنے ہونے کے باوجود کسی نے عملی سوچ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دستوری مسودوں اور ترامیم پر خواہ مخواہ کی بحث میں قوم کے سات سال ضائع کر دیے گئے۔ دوسری طرف سیاستدانوں کی لاحاصل بحثوں اور اقتدار سے چپکے رہنے کی کوششوں کے نتیجے میں قوم کی مایوسی بڑھتی چلی گئی۔ حکمران مسلم لیگ کے خلاف سازشیں زور پکڑنے لگیں۔ مسٹر سہروردی نے مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر اپنی عوامی مسلم لیگ کی بنیاد ڈال دی۔ انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ شوشا چھوڑا کہ دستور ساز اسمبلی نے دستور نہ بنا کر اپنی نااہلی ثابت کر دی ہے، اس طرح اس کا دستور بنانے کا حق ساقط ہو گیا۔ مسٹر سہروردی کے اس طرزِ عمل سے پنجاب میں مسلم لیگ کے

دشمنوں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے گورنر جنرل مسٹر غلام محمد سے ساز باز کر کے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کروا دیا۔ مسٹر غلام محمد نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دستور ساز اسمبلی کو بھی برطرف کر کے نئے الیکشن کے احکامات جاری کر دیے۔ برسہا برس میں پروان چڑھنے والا برطانوی طرز کا دستوری ڈھانچا یک زمیں بوس ہو گیا۔

یہ اور اس کے تسلسل میں ہونے والے واقعات کے بعد ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان کا بحیثیت ڈکٹیٹر، پاکستان کا اقتدار سنبھالنا منطقی اور لازمی نتیجہ تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس سارے معاملے کو مہمیز دینے والے کوئی اور نہیں، جمہوریت کے نام نہاد چمپئن حسین شہید سہروردی تھے، جنھوں نے نہ صرف گورنر جنرل کی جانب سے خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کو سراہا بلکہ اسے ایک جائز اور قانونی اقدام قرار دیا۔ یہ اور بات ہے کہ بعدازاں انہیں اسکندر مرزا کے ہاتھوں اپنی برطرفی کے ''جائز اور قانونی اقدام'' کا کڑوا گھونٹ بھی بغیر منہ بنائے پینا پڑا۔ مسٹر سہروردی کو اس وقت بھی کوئی خفت محسوس نہیں ہوئی، جب انہیں اپنے ہی ایک چیلے محمد علی بوگرہ کے ماتحت وزارت کا عہدہ سنبھالنا پڑا۔ انہیں ۱۹۵۶ء کے دستور کا دفاع کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی، حالانکہ وہ بذاتِ خود اس میں ایک فریق تھے۔

مسٹر سہروردی اُس وقت جاگے جب ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے تمام دستوری جکڑ بندیوں کو اُٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور زور بازو سے سارے اختیارات خود سنبھال لیے۔ اُن کے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ مسٹر سہروردی خواب خرگوش سے جمہوریت یا دستور کی محبت میں نہیں جاگے تھے، اُن کی بیداری کا اصل سبب تو ان کا یہ احساس تھا کہ نئے انتظام میں ان کے لیے اقتدار سنبھالنے کا کوئی موقع دستیاب نہیں۔ جمہوریت اور دستور کی جڑیں کھودنے کے بعد مسٹر سہروردی نے بالآخر ایوب خان پر تنقید شروع کر دی تھی۔ وہ بھی اس وقت جب ایوب خان ملک کو کسی حد تک سیاسی طور پر مستحکم کر رہے تھے۔ اس سے قطع نظر کہ تشدد کے واقعات میں ایوب خان کا کیا حصہ تھا۔

وہ سیاسی جماعتیں جنھوں نے غلام محمد کے اسمبلی توڑ کر جمہوریت کے خلاف شب خون مارنے پر چپ سادھ لی تھی، ۱۹۶۸ء میں ایوب خان کے خلاف تحریک چلانے کے لیے متحد ہو

لی تھیں۔ یہ تنگ نظری کی ایک افسوسناک مثال تھی جس کی ماضی میں نظیر نہیں ملتی۔ اس لیے کہ ۱۹۶۸ء میں مسئلہ یہ نہیں تھا کہ پاکستان میں صدارتی نظام ہو یا پارلیمانی، بلکہ یہاں تو معاملہ پاکستان کی بقا کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نوشتۂ دیوار کو پڑھنے اور سمجھنے کی زحمت ہی نہیں کی گئی۔

۱۹۶۶ء کا عوامی لیگ کا چھ نکاتی پروگرام عملاً ملک سے علیحدگی کا اعلان تھا۔ اس کے باوجود ۱۹۶۷ء میں سامنے آنے والا اگرتلہ سازش کیس سیاستدانوں کی زیادہ توجہ حاصل نہ کر سکا۔ اس کے برعکس حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والی اکثر پارٹیوں نے کھلم کھلا یا بالواسطہ شیخ مجیب الرحمٰن کو سیاسی منظر نامے سے ہٹانے کی ایک کوشش قرار دیا۔ حتیٰ کہ خود مسلم لیگ (جو اب کونسل لیگ، کنونشن اور قیوم لیگ میں بٹ چکی تھی) کا رویہ ایسا تھا کہ لگتا تھا کہ انہیں اگرتلہ سازش کیس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ اس کے بعض ممبر تو اس حد تک چلے گئے تھے کہ انہوں نے ۱۹۶۹ء میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا تھا، تاوقتیکہ سازش کیس کو واپس لے کر شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا نہ کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ اس کے باوجود تھا کہ عوامی لیگ کے حامیوں نے مشرقی پاکستان میں امن وامان کو تاراج کر رکھا تھا۔ اگرتلہ سازش کیس واپس لے لیا گیا۔ اس طرح عوامی لیگ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پُرتشدد اور نامعقول طریقوں سے اپنی بات منوا سکتی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے گول میز کانفرنس میں شرکت تو کی مگر کسی بھی سمجھوتے پر پہنچنے سے انکار کر دیا۔ ڈھاکا واپس پہنچنے پر شیخ مجیب نے مسٹر نورالامین اور مسٹر حمید الحق چودھری وغیرہ کی سخت مذمت کی اور انہیں بنگال کا غدار قرار دیا حالانکہ یہی لوگ تھے جنہوں نے شیخ مجیب کی رہائی پر سب سے زیادہ زور دیا تھا۔

اب اُس داستان کے آخری سین کے لیے اسٹیج تیار تھا جو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں اختتام پذیر ہونے والی تھی۔

مستقبل کا غیر جانبدار مؤرخ جب اس دور میں ہونے والے واقعات کا تجزیہ کرنے بیٹھے گا تو وہ اُن سازشوں کو نظر انداز نہیں کر سکے گا جنہیں عوامی لیگ قدم بقدم عملی جامہ پہنا رہی تھی۔ یہ دلیل کہ ۱۹۵۶ء کا دستور بنگالیوں پر ہونے والے مظالم کی بنیاد تھا، اُس وقت زمیں بوس ہو جاتی ہے، جب یہ سامنے آتا ہے کہ اس دستور کے اصل خالق تو حسین شہید سہروردی تھے

اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مساوات (Parity) ان کا مرغوب فارمولہ تھا۔ علاوہ ازیں اس دستور نے جداگانہ طرزِ انتخاب کا بستر بھی گول کر دیا تھا جسے اب تک مسلم لیگ کی پالیسی کی بنیاد کا سب سے وزنی پتھر ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔

مزید برآں، ڈھاکا یونیورسٹی کے مسٹر عبدالرزاق اور ڈاکٹر مظفر احمد چوہدری دستور سازی کے پورے عمل میں بطور مشیر شریک رہے تھے۔ وہ آج تک یہ نہیں بتا سکے کہ اُن کی وہ کون سی تجاویز تھیں جن کو دستور ساز اسمبلی نے مسترد کر دیا تھا۔ ۱۹۵۶ء کے دستور پر اُن کی بے جا تنقید علمی دیوالیے پن کا مظہر تھی۔ اس لیے کہ وہ دستور سازی کے کسی بھی مرحلے پر کوئی مثبت تجویز نہیں دے پائے تھے۔ ان کا رویہ اس طرح کے معاملات میں ہماری مخصوص بنگالی ذہنیت کا آئینہ دار تھا یعنی بغیر کسی مثبت تجویز کے لایعنی تنقید! اگر ۱۹۵۶ء کا دستور اتنا ہی خراب تھا تو آپ یہ تو بتلاتے کہ پاکستان کی خوشحالی کا آپ کے پاس کیا متبادل نقشہ تھا۔

دوسرا سوال، جس کی تحقیق ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ آخر عوامی لیگ اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان کے ساتھ ساز باز کر کے ایسے اقدامات میں کیوں شامل رہی جو انجامِ کار ۱۹۵۸ء کی فوجی آمریت کے قیام پر منتج ہوئے؟ کیا یہ محض خواجہ ناظم الدین کے ساتھ کینہ پروری تھی یا اس کی پشت پر کوئی خباثت کام کر رہی تھی؟ یعنی پاکستان کو بالآخر توڑ دینے کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ!

آخر جنابِ سہروردی نے (جن کے ضمیر نے محمد علی بوگرہ کی کابینہ میں شمولیت پر کوئی خلش محسوس نہیں کی تھی) جنرل ایوب کے ساتھ تعاون کرنے سے کیوں انکار نہیں کیا؟ مسٹر سہروردی کے چاہنے والے بتلائیں کہ جنرل ایوب اور سہروردی کے معیار اور کردار میں کیا فرق رہ گیا تھا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب خان کا اقتدار پر جبری قبضہ، آنے والے برسوں میں جڑ پکڑنے والی بہت سی برائیوں کا ذمہ دار تھا۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اُس نے ملک میں صدارتی نظام متعارف کرا کے ایک اچھا کام کیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سہروردی نے پاکستان کے ابتدائی دنوں میں متعدد بار صدارتی نظام کی حمایت میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ لیکن جونہی جنرل ایوب نے صدارتی نظام نافذ کیا، مسٹر سہروردی نے مخصوص بنگالی ذہنیت کا مظاہرہ

کرتے ہوئے اس میں کیڑے نکالنے شروع کر دیے۔ اُن کی تازہ دریافت یہ تھی کہ صدارتی نظام نہ صرف شہری آزادیوں کے لیے بلکہ ملک کے مستقبل کے لیے بھی خطرہ تھا۔ جبکہ تلخ حقیقت یہ تھی کہ ملک میں پارلیمانی نظام خاطر خواہ طریقے سے نہیں چل رہا تھا اور اس نے ریاست کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے عملاً حالتِ نزع سے دوچار کر دیا تھا۔ اَب ہو یہ رہا تھا کہ نئے بھی صدر ایوب سے کوئی پُر خاش ہوتی وہ سہروردی کے ساتھ صدارتی نظام کے خلاف کورس میں شامل ہو جاتا۔ موجودہ مسائل سے بے اعتنا، صحافی اور سیاستدان، تاریخی حقائق کو پسِ پشت ڈال کر، ایک آواز ہو گئے تھے اور بدنام پارلیمانی نظام کی بحالی کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ اُن کے نزدیک یہی ہر مرض کی دوا تھی۔ مشرقی پاکستان میں مسٹر نورالامین اور حمید الحق چوہدری جبکہ مغربی پاکستان میں چوہدری محمد علی اور میاں دولتانہ زور دے رہے تھے کہ پارلیمانی نظام کی بحالی کے سوا کوئی اور طریقہ ہمیں عوامی لیگیوں کی ساز باز سے بُنے جانے والے جال میں پھنس جانے سے نہیں بچا سکتا۔

تیسرا سوال، جس کا مستقبل کے مؤرخ کو جواب تلاش کرنا ہوگا، یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے غیر بنگالی صنعت کار، آدمجی، اصفہانی و دیگر شیخ مجیب الرحمٰن کی انتخابی مہم میں کیوں بڑھ چڑھ کر سرمایہ کاری کر رہے تھے؟ کیا یہ فتح مند مگر منتقم مزاج عوامی لیگ کا خوف تھا یا عوامی لیگ کے اُصولوں سے محبت تھی جس نے اُن کو اِس امر پر آمادہ کیا؟ اصولوں سے محبت والی بات تو بوجوہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن خوفزدہ ہو کر یا عوامی لیگ کی حمایت کو طویل مدت کی سرمایہ کاری سمجھ کر نوٹوں سے اُن کی بوریاں بھر دینا، اُن کی ناسمجھی تھی۔ لگتا تھا کہ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ سیاسی سطح پر کون سی طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ آدمجی اور اصفہانی سمجھ رہے تھے کہ شاید وہ شیخ مجیب اور بنگالیوں کو مجرے کی کمائی میں سے ان کا حصہ دے رہے تھے لیکن انہیں بنگالی نسل پرستی کے ہیبت ناک عفریت کا کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔

صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے بھی اپنی اپنی جگہوں پر عوامی لیگ کو مضبوط کرنے میں کوئی کم کردار ادا نہیں کیا۔ صدر ایوب نے بظاہر بنگالیوں کا دل جیتنے کے لیے اعلان کیا تھا کہ دونوں بازوؤں کے درمیان معاشی تفاوت کو ختم کرنا انتظامیہ کی دستوری ذمہ داری ہے۔ مشرقی

پاکستان کے گورنر مسٹر منعم خان نے، ظاہر ہے صدر ایوب کی ہدایت پر، اپنی ہر تقریر میں اس موضوع پر بولنا شروع کر دیا۔ اُن کی تقریر کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ اس تفریق کو پیدا کرنے کے ذمہ دار چوہدری محمد علی تھے۔ بظاہر اس خیال انگیزی کا مقصد ایک تیر سے دو شکار کرنا تھا۔ ایک طرف تو صدر ایوب کے حریف، چوہدری محمد علی کی شخصیت کو داغ دار کرنا تھا، دوسری طرف حکومت کے اس عزم کا اظہار کرنا تھا کہ اسے سابقہ حکومتوں سے جو مسائل ورثہ میں ملے ہیں اُن کو حل کرنے کے لیے وہ پوری طرح مخلص ہے۔ لیکن گورنر کی تقریروں کا اُلٹا ہی اثر ہو رہا تھا۔ عوامی لیگ کا مشرقی پاکستان کے حقوق کی چمپئن ہونے کے دعوے کی تصدیق ہو رہی تھی اور ثابت ہو رہا تھا کہ مغربی پاکستان کے خلاف اُس کی مہم کی بنیاد ناقابل تردید حقائق پر مبنی ہے۔

گورنر منعم خان کو عام طور پر شیخ مجیب الرحمٰن کا کٹر دشمن تصور کیا جاتا ہے، تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان کی مذکورہ بالا مہم نے شیخ مجیب کی پوزیشن مضبوط کرنے اور اسے عوام کی نظروں میں بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ دُکھ کی بات یہ ہے کہ انہوں نے خود کبھی اس بات کا احساس نہیں کیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان عدم مساوات اور قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کی آبادی کے لحاظ سے متناسب نمائندگی کے سوال کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے۔ یہ دونوں ایشو ان لوگوں نے اٹھائے تھے جن کے خیال میں مشرقی پاکستان سے زیادتی کی جا رہی تھی اور اس کے حقوق غصب کیے جا رہے تھے۔ ہم اگلے سیکشن میں معاشی ناہمواری اور عدم مساوات پر بحث کریں گے۔ تاہم لگتا ایسا ہے کہ مساوی نمائندگی کے مطالبے کے پیچھے حد سے بڑھی ہوئی سادگی تھی یا پھر اس مطالبے کے پس منظر میں کچھ اور ہی مقاصد تھے۔

متناسب نمائندگی کا مطالبہ کرنے والے کچھ زیادہ دور اندیش نہیں تھے۔ ملک کے دونوں حصوں کی آبادی میں فرق زیادہ نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کی آبادی اگر چھ کروڑ تھی تو مغربی پاکستان کی آبادی بھی ۵ کروڑ سے کم نہ تھی۔ ایک کروڑ کی اکثریت کے نام پر مشرقی بازو جو فائدے سمیٹ سکتا تھا، مغربی پاکستان کی آبادی میں اضافہ اس فرق کو ختم بھی کر سکتا تھا لیکن کسی نے اس نکتے پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی، سوائے ابوالمنصور احمد کے۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے تباہ کن نتائج کے باوجود اس بات پر اصرار کیا کہ دونوں صوبوں کے درمیان

نمائندگی صرف برابری (Parity) کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ اُن کے مطابق اسی صورت میں صوبے ایک دوسرے کے مقابلے میں توازن برقرار رکھ سکتے تھے جس کے نتیجے میں سیاسی استحکام اور معاملات کے بہتر ہونے کی امید کی جاسکتی تھی۔ جو لوگ جمہوریت کے نام پر متناسب نمائندگی کی بات کر رہے تھے، وہ پاکستان کی بقا کے خواہش مند نہیں تھے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ انتشار کی فضا برقرار رہے تاکہ ملک کی شکست وریخت کا سامان ہو۔ اور ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کے واقعات نے انہیں سچا ثابت کر دیا۔

ایک اور مسئلہ، جس کی طرف مسٹر اے کے بروہی کے علاوہ کسی دوسرے معروف سیاستدان کی توجہ نہیں گئی، وہ مشرقی پاکستان کی آبادی میں ہندوؤں کا تناسب تھا۔ مسٹر اے کے بروہی نے اُس وقت ایک بیان کے ذریعہ واضح کیا کہ مشرقی پاکستان کی عددی برتری کی بات کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ وہاں آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ ہندوؤں کا بھی ہے۔ مختلف اندازوں کے مطابق ہندو مشرقی پاکستان کی کل آبادی کا چھ سے سات فیصد تھے جبکہ بعض تجزیہ کاروں کے نزدیک یہ تناسب دس فیصد تک بنتا تھا۔ جبکہ مغربی پاکستان کی مسلم آبادی کسی شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ عددی برتری کی بنیاد پر ملک کے اس بازو کو زیادہ حصہ کیسے دیا جاسکتا تھا جس کی آبادی میں وہ اقلیت بھی شامل تھی جو ملک کے بنیادی نظریے ہی کے خلاف تھے۔ اگر اختیار ملتا تو مشرقی پاکستان کی ہندو آبادی بلاتردد پاکستان کے خلاف ہی ووٹ دیتی۔ پھر ایسے فیصلے کا اختیار جس پر ملک کی بقا کا دارومدار ہو، ایسے لوگوں کے ہاتھ میں کیونکر دیا جاسکتا تھا؟

میں جانتا ہوں کہ اس دلیل کو نام نہاد ترقی پسند عناصر رجعت پسندانہ اور غیر جمہوری قرار دینے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ بظاہر عددی برتری کی جمہوری منطق ان کے حق میں ہے۔ مگر تباہی کی ذمہ دار پاکستان کی قیادت ہے جس نے حقائق کا کھلے بندوں سامنا کرنے کے بجائے منافقت سے کام لیا اور قوم کی متناسب نمائندگی کے حقیقی خطرات سے آگاہ نہیں کیا۔

پہلا وار صدر جنرل یحییٰ خان نے کیا۔ شیخ مجیب یا کسی اور نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ متناسب نمائندگی کا معاملہ اتنی سبک رفتاری سے نمٹا دیا جائے گا۔ جنرل یحییٰ خان نے ''ایک آدمی، ایک

ووٹ'' کے فارمولے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ اس معاملے کو قومی اسمبلی میں بحث کے بعد اُسی ایوان میں طے ہونا چاہیے تھا۔ مگر یحییٰ خان نے تمام مروج طریقوں کو بالائے طاق رکھ کر انتظار کرنے کے بجائے، دوررس نتائج کے حامل براہ راست دو ایسے اقدامات کر دیے جن کی وجہ سے پورا آئینی ڈھانچا زمیں بوس ہو گیا اور ملک افراتفری اور انتشار کا شکار ہو گیا۔ پہلا اقدام تو بیان کیا ہی جا چکا ہے۔ دوسرا، جو ملک کی سلامتی کے لیے یکساں ضرر رساں تھا، ون یونٹ ختم کرنے کا اعلان تھا۔ ان دو بنیادی مسائل کو نمٹانے کے بعد بھی یحییٰ خان نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ آئین سازی کے حوالے سے نئی قومی اسمبلی کے کاندھوں پر غیر معمولی ذمہ داری ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی اسمبلی کے پاس اب کرنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

یحییٰ خان نے ایسا کیوں کیا؟ یہ ایک ایسا راز ہے جس پر سے مستقبل کا کوئی مؤرخ ہی پردہ اٹھا سکے گا جس کو خفیہ سرکاری دستاویزات تک رسائی حاصل ہوگی۔

جب بھی یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے سیاست دان اور دانشور اپنے صوبے کو استحصال سے بچانے اور اس کی ترقی و بہتری کے لیے کوئی منصوبہ نہیں دے سکے تو ان کی طرف سے جواب میں عوامی لیگ کا ٦ نکاتی پروگرام پیش کر دیا جاتا ہے۔ اگر غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو عوامی لیگ کے پیش کردہ ٦ نکات میں ملک کے استحکام کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ چھ نکات کا بنیادی مقصد ملک کو مستحکم کرنا نہیں بلکہ شکست و ریخت کے عمل کو تیز کرنا تھا۔ یہ چھ نکات آخر تھے کیا؟ ان میں مشرقی پاکستان کے لیے علیحدہ کرنسی اور تجارتی پالیسی کا مطالبہ شامل تھا۔ وہ امور جو مرکز کے لیے چھوڑے گئے تھے، ان پر بھی مرکز کو ٹیکس لگانے کا اختیار نہ دینے کی بات کی گئی تھی، حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے لیے علیحدہ ملیشیا بنانے تک کا مطالبہ بھی کر دیا گیا تھا۔ اگر ان چھ نکات کی بنیاد پر کوئی آئین تشکیل پا جاتا تو مشرقی پاکستان خود بخود ایک آزاد ریاست میں تبدیل ہو جاتا جس کا مرکز سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ چھ نکات کے حامی کچھ ہی کہیں، سچ تو یہ ہے کہ ان نکات کو ملک کے استحکام کی ضمانت قرار دینا سچائی کی تضحیک سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ منصوبہ، جیسا بھی تھا، ۱۹۶۶ء میں پیش کیا گیا۔ یعنی ۱۹۶۵ء

کی پاک بھارت جنگ کے ایک سال بعد۔ اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ان نکات کا مقصد ملک توڑنا نہیں تھا، گو کہ عوامی لیگ کے رہنماؤں کے ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد کے اعترافات اور ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۱ء کے واقعات کی روشنی میں ایسا فرض کرنا ممکن نہیں، تب بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء تک کے زمانہ کی کیا وضاحت کی جائے گی؟ ان ۱۹ برسوں کا باریک بینی سے ہفتہ وار جائزہ لینے کی صورت میں ہمیں اندازہ ہوگا کہ مرکز پر استحصال، زیادتی اور حق تلفی کے الزامات کی یورش کی جاتی رہی اور ان الزامات کو بار بار دُہرا کر ذہنوں میں ٹھونسا گیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان مخالف ماحول پیدا ہوا اور ملک میں استحکام نہ ہوسکا۔ اس پورے عرصے میں مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں کی طرف سے کبھی بھی مثبت بات سامنے نہیں آئی۔

اس کے برعکس عوامی لیگ نے، بائیں بازو کے صحافیوں کی مدد سے، اِن اُنیس برسوں میں بنگالی قوم پرستی کو ہوا دی۔ اس معاملے میں ان کی ایک اور بددیانتی روزِ روشن کی طرح واضح تھی۔ عوامی لیگ نے کسی مرحلے پر یہ نہیں کہا کہ زبان کی بنیاد پر برصغیر کی نئی تقسیم کا وقت آگیا ہے اور پاکستان اور بھارت میں ہر بڑی زبان بولنے والے علاقوں کو علیحدہ ریاست قرار دے کر حق خودارادیت دیا جانا چاہیے۔ لسانی بنیاد پر قومیت کا نظریہ صرف پاکستان کے بنگالیوں پر مسلط کیا گیا۔ مغربی بنگال کے بنگالیوں کو باقی ہندوستان کے ساتھ جوں کا توں رہنے پر عوامی لیگ کو کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔ اسی طرح مراٹھی، تیلگو، گجراتی اور دیگر زبانیں بولنے والوں کو انڈین یونین کا حصہ تسلیم کرنے میں عوامی لیگ کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ ناگالینڈ کے باشندے نسلی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے باقی ہندوستان سے یکسر مختلف ہیں اور ۱۹۴۷ء سے علیحدگی کی تحریک چلا رہے ہیں تاہم ان کی تحریک کے لیے حمایت کا اعلان کرنے کی کسی نے زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کا لیڈر ڈاکٹر فیزو لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا اور ناگالینڈ کے دیہات پر بھارتی فوج کی یلغار جاری تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانے کے ذریعے ناگالینڈ کو ''خاموش'' کیا گیا۔ جموں وکشمیر کے متنازع خطے کو بھی تنہا چھوڑ دیا گیا اور اس مسئلے کو حل کرنے پر خاطر خواہ توجہ دینے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی۔ بھارت اور دوسرے بہت سے ممالک میں مختلف النسل آبادیاں تھیں اور تمام گروپ مل کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ صرف پاکستان کے

معاملے میں استثنا اختیار کیا گیا۔ پاکستان میں آبادی کے تنوع کو ملک کی تقسیم کی بنیاد بنایا گیا۔ پاکستان اور بھارت میں نسلی تفاوت یکساں نوعیت کا تھا مگر سیاسی تاریخ میں ایسی تنگ نظری کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ دو یکساں نوعیت کے ممالک کو یکسر مختلف نقطۂ نظر سے دیکھا گیا اور پاکستان کو اس معاملے میں سراسر زیادتی کا سامنا کرنا پڑا۔ جن حالات کا سامنا پاکستان کو تھا، انہی حالات کا سامنا بھارت کو بھی تھا مگر پاکستان کے لیے یکسر مختلف نتائج پر اصرار کیا گیا۔

دشمن کی سازشوں، عوامی لیگ کی کاوشوں اور ناموافق حالات کے باعث بنگالی قوم پرستی کا بُت پروان چڑھتا چلا گیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل کے فاصلے نے بھی ملک کے خلاف بھڑکنے والے جذبات کو ہوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسری طرف مرکزی حکومت بنگالی قوم پرستی کے بارے میں درست اندازے قائم کر کے بروقت اقدام کرنے میں ناکام رہی۔ علاوہ ازیں مغربی پاکستان کے سیاست دانوں میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کو زچ کرنے اور ان کو تحقیر کی نظر سے دیکھنے کی عادت عام تھی۔ اگر وہ اس عادت پر قابو پا لیتے اور بنگالیوں کو ضروری احترام دیتے تو حالات میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑ سکتا تھا۔ اسی طرح دشمنوں کی جانب سے معاشی امور کے بارے میں جو دروغ گوئی کی جاتی رہی، اس کی مرکزی حکومت نے جامع انداز سے نفی کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی۔ ایک اور بڑی خرابی یہ تھی کہ مغربی پاکستان کے سیاست دان اور اعلیٰ حکام آخر میں خود کو مجرم سمجھ کر حالات کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ پھر یہ عقیدہ کہ پاکستان کی بنیادوں کو کوئی بھی چیز کمزور نہیں کر سکتی، بے عملی کے سبب صحیح ثابت نہیں ہوا۔ آخری بات یہ کہ اقتدار کے ایوان میں اعلیٰ ترین منصبوں پر بیٹھے لوگ ملک کے خلاف بین الاقوامی سطح پر کی جانے والی سازشوں کا ادراک ہی نہیں کر سکے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

مصنف کی دعائیہ نظم
اُن کے اپنے قلم سے

12.5.73

A Prayer

Lord, give me courage
that I may face life;
give me strength
that I may bear the burdens
Thou imposest on me;
give me forbearance
that I may stay unperturbed
when provoked;
give me tolerance
that I may view, unexcited,
the great human comedy;
give me patience
that I may not lose my equanimity
when confronted
by trials.

Protect me, O Lord,
from the tongue of those who
malign Thee;
from the contumely of those
who are vain and proud;
from the hatred of those
who are ignorant;

from the ferocity of those
who forget Thee;
from the stupidity of those
who know not but think that they know,
from the dullness of the unintelligent.

But save me, Lord, above all,
from the hatreds within me,
from the pride in my own heart,
from the ignorance in my own mind,
and the flames of greed, avarice
and malice which burn me.

Epilogue

A Prayer

Lord, give me courage
that I may face life;
give me strength
that I may bear the burdens
thou imposest on me;
give me forbearance
that I may stay unperturbed
when provoked;
give me tolerance
that I may view, unexcited,
the great human comedy;
give me patience
that I may not lose my equanimity
when confronted
by trails.

Protect me, O Lord,
from the tongue of those who
malign Thee;
from the contumely of those
who are vain and proud;
from the hatred of those
who are ignorant;
from the ferocity of those
who forget Thee;
from the stupidity of those
who know not but think that they know;
from the dullness of the unintelligent.

But save me, Lord, above all.
from the hatreds within me,
from the pride in my own heart,
from the ignorance in my own mind,
and the flames of greed, avarice
and malice which burn me.

Syed Sajjad Husain
12-5-1973

ضمیمہ جات

ضمیمہ اول

قراردادِ لاہور

(قراردادِ پاکستان)

۲۲ تا ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے منٹو پارک، لاہور (موجودہ مینارِ پاکستان گراؤنڈ) میں اپنا تاریخی جلسہ منعقد کیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے دن ایک قرارداد پیش کی گئی جس میں منجملہ دیگر موضوعات کے درج ذیل تجویز بھی شامل تھی:

"...قرار پایا کہ کل ہند مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اس ملک میں کوئی دستوری خاکہ قابلِ عمل نہ ہوگا اور نہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہوگا جب تک کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب نہ کیا گیا ہو۔

جغرافیائی حیثیت سے متصل ارضی وحدتوں کی حد بندی کر کے ان کو جداگانہ علاقوں میں اس طرح منقسم کیا جائے اور اس کے لیے عملداریوں میں ایسا ضروری ردوبدل کیا جائے کہ وہ علاقے جہاں مسلمان عددی اکثریت میں ہیں.... مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقے .... اکٹھے ہوکر آزاد ریاستوں کی حیثیت اختیار کرلیں جن میں شامل وحدتیں آزاد اور خودمختار ہوں"۔

کرپس مشن کی پیشکش ۱۹۴۲ء
(Cripps Mission Plan)

''ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں وعدوں کی تکمیل کی بابت، اس ملک میں اور ہندوستان میں جس تردد کا اظہار کیا گیا، ان پر غور کرنے کے بعد ہزمیجسٹی کی حکومت نے ان اقدامات کو صاف اور صریح لفظوں میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جو وہ ہندوستان میں جلد از جلد ایک خودمختار حکومت کے قیام کے لیے اُٹھانا چاہتی ہے۔ پیش نظر ایک نئی انڈین یونین کا قیام ہے جس کی حیثیت ایک خودمختار ریاست (Dominion) کی ہوگی۔ جو تاج برطانیہ سے مشترکہ وفاداری کی بنیاد پر سلطنتِ متحدہ (United Kingdom) اور دوسری ریاستوں سے ہر لحاظ سے برابری کی سطح پر تعلق رکھے گی اور اپنے داخلی یا خارجی امور میں کسی بھی پہلو سے ان کے زیرنگیں نہیں ہوگی۔

اس لیے، ہزمیجسٹی کی حکومت حسب ذیل امور کا اعلان کرتی ہے:

الف: مخاصمانہ کارروائیوں کے خاتمے کے فوراً بعد ہندوستان میں، بعد ازاں بیان کیے گئے طریقے کے مطابق، ایک ہیئت منتخبہ کے قیام کے لیے اقدامات کیے جائیں گے، جس کا کام ہندوستان کے لیے ایک نیا آئین وضع کرنا ہوگا۔

ب: بعد میں آنے والے طریق کار کے مطابق آئین ساز تنظیم میں ہندوستانی ریاستوں کی شرکت کی گنجائش رکھی جائے گی۔

ج: مذکورہ طریقے سے مرتب ہونے والے آئین کی بابت ہزمیجسٹی کی حکومت ذمہ لیتی ہے کہ اسے منظور کر کے فی الفور لاگو کر دیا جائے گا بشرطیکہ:

ا۔ برٹش انڈیا کے، نئے آئین کو قبول نہ کرنے والے، ہر صوبے کو حق حاصل ہو کہ وہ

اپنی موجودہ آئینی حیثیت کو برقرار رکھے، مگر آئین میں یہ گنجائش بھی رکھی جائے گی کہ اگر وہ چاہے تو بعد میں یونین میں شامل ہو جائے۔ اس طرح سے یونین میں شامل نہ ہونے والے صوبوں کی خواہش پر ہز میجسٹی کی حکومت ایک نئے آئین پر رضامند ہوگی جو انہیں ویسی ہی مکمل حیثیت دے گا جو کہ انڈین یونین کی ہوگی، اور یہ آئین اس دستاویز میں بیان کیے گئے طریقے کے مطابق مرتب ہوگا۔

۲۔ ہز میجسٹی کی حکومت اور آئین ساز تنظیم باہمی مذاکرات کے بعد ایک میثاق پر دستخط کریں گے۔ یہ میثاق انگریز کے ہاتھوں سے ہندوستانی باشندوں کی طرف مکمل اقتدار کی منتقلی کے تمام ضروری معاملات پر محیط ہوگا۔ اس میثاق میں اُن وعدوں کو پورا کرنے کی گنجائش رکھی جائے گی جو ہز میجسٹی کی حکومت نے نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے کیے ہیں مگر یہ میثاق انڈین یونین کے اس اختیار پر کوئی قدغن نہیں لگائے گا جو مستقبل میں برطانوی دولت مشترکہ کے دوسری ممبر ریاستوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے متعلق ہو۔

کسی بھی ہندوستانی ریاست کے لیے، خواہ وہ آئین کے ساتھ وابستگی رکھنا چاہے یا نہیں، لازمی ہوگا کہ وہ میثاق کے تحت کیے گئے انتظامات پر، کسی نئی صورتحال کے تقاضے کے مطابق، نظرثانی کے لیے مذاکرات کرے۔

د: آئین ساز تنظیم کی تشکیل درج ذیل طریقے سے کی جائے گی، ماسوا اس کے کہ ہندوستان کے اہم فرقوں کے لیڈر مخاصمانہ کارروائیوں کے اختتام سے پہلے کسی اور شکل پر متفق نہ ہو جائیں:

فسادات کے ختم ہوتے ہی جہاں ضروری ہے، وہاں کے صوبائی انتخابات کا نتیجہ معلوم ہونے کے فوراً بعد، صوبائی مجالسِ قانون ساز کے ایوانِ زیریں کے جملہ ارکان ایک واحد انتخابی کالج کے طور پر، متناسب نمائندگی کے اصول پر آئین ساز تنظیم کا انتخاب کریں گے۔ نئی تنظیم کے ارکان کی تعداد انتخابی کالج کے کل ارکان کی تعداد کا دسواں حصہ ہوگی۔

ہندوستانی ریاستوں کو اپنی آبادی کے اُسی تناسب سے نمائندے مقرر کرنے کی دعوت دی جائے گی جو مجموعی طور پر برطانوی ہند کے نمائندوں کا ہوگا اور ان کے اختیارات بھی وہی

ہوں گے جو برطانوی ہند کے نمائندوں کے ہوں گے۔

ہ بحران کی اس گھڑی میں، جس سے اس وقت ہندوستان دوچار ہے اور نئے آئین کے وضع ہونے تک، ہز میجسٹی کی حکومت کو عالمی جنگ میں اپنے حصے کی جدوجہد کے طور پر، ہندوستان کے دفاع کی ذمہ داری اور اس کی کمان اور کنٹرول کو لازماً خود سنبھالنا پڑے گا، لیکن ہندوستان کے فوجی، اخلاقی اور مادّی وسائل کو مکمل طور پر منظم کرنے کی کل ذمہ داری، اپنے عوام کے تعاون کے ساتھ، ہندوستان کی حکومت کی ہی ہوگی.....

بحوالہ: عزیز بیگ: The Quiet Revolution (1959) pp 227-28

اسٹیفورڈ کرپس، قائد اعظم محمد علی جناح (اوپر بائیں) اور موہن چند کرم چند گاندھی (نیچے دائیں طرف) کے ساتھ (۱۹۴۲ء)

جواہرلعل نہرو، لارڈ ویول، قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر سیاستداں گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں۔ ۱۹۴۶ء

گاندھی اور جناح

قائداعظم محمد علی جناح
لیاقت علی خان (دائیں)
اور
جواہرلعل نہرو (بائیں)
کے ساتھ

قراردادِ دہلی

۹؍اپریل ۱۹۴۶ء

نومنتخب اراکین مجلس قانون ساز ہند کا کنونشن منعقدہ دہلی
حسین شہید سہروردی، وزیر اعظم (متحدہ) بنگال کی پیش کردہ قرارداد

''جیسا کہ ہند کے وسیع و عریض برصغیر میں دس کروڑ مسلمان اپنے اُس عقیدے پر قائم ہیں جو زندگی کے ہر شعبے... تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی... کو ضابطے میں لاتا ہے۔ جس کے اصول صرف روحانی معاملات، رسومات اور تقریبات تک محدود نہیں ہیں بلکہ جو بالکل برعکس ہے ہندو دھرم اور فلسفہ کی امتیازی فطرت کا، جس کے تحت ہزاروں سال سے ذات پات کا ایک بے لچک نظام پروان چڑھ رہا ہے۔ جو سبب ہے ساٹھ کروڑ انسانوں کی تحقیر کر کے انہیں اچھوت کا درجہ دینے کا، انسان اور انسان کے درمیاں غیر فطری رکاوٹیں کھڑی کر کے ملک کے ایک بڑے حصے پر معاشی اور سماجی تفریق مسلط کرنے کا، جو خطرہ ہے مسلمانوں، عیسائیوں اور دیگر اقلیتوں کو سماجی اور معاشی لحاظ سے ابدی غلاموں کا درجہ دینے کا؛

''جیسا کہ ہندو ذات پات کا نظام قوم پرستی، مساوات، جمہوریت اور اُن تمام اعلیٰ افکار کی نفی کرتا ہے جو اسلام پیش کرتا ہے؛

''جیسا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف تاریخی پس منظر و روایات اور مختلف تہذیبی و سماجی نظاموں کی وجہ سے ایک واحد ہندوستانی قوم کا... مشترکہ آدرشوں اور نظریات کی بنیاد پر... پروان چڑھنا ناممکن ہوگیا ہے اور جیسا کہ صدیوں تک ساتھ رہنے کے باوجود وہ دونوں اب تک واضح طور پر بالکل علیحدہ اور ممیز قومیں ہیں؛

''جیسا کہ برطانیہ کی طرف سے مغربی جمہوریت کی طرز پر اکثریت کی حکمرانی کی بنیاد پر سیاسی اداروں کے قیام کی پالیسی ... جس کا مطلب ہے کہ قوم کی اکثریت، اقلیت پر اس کی مخالفت کے باوجود، اپنی مرضی مسلط کر سکتی ہے .... کے اجرا کے فوراً بعد ہندو اکثریتی علاقوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت قائم کانگریس کے ڈھائی سالہ دورِ حکومت میں خوب ظاہر ہو گیا، جب مسلمانوں کو ناقابلِ بیان ایذا رسانی اور مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ جس کے نتیجے میں اُن پر خوب اچھی طرح ظاہر ہو گیا ہے کہ اس سلسلے میں دستور میں دیے گئے نام نہاد تحفظات اور گورنروں کو دی گئی ہدایات لایعنی اور بے فائدہ ہیں۔ وہ اس حتمی نتیجے پر بھی پہنچنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ایک متحدہ ہندوستانی وفاق میں، جو اگر قائم ہو گیا تو مسلمان خود مسلم اکثریتی علاقوں میں اس سے زیادہ خراب نتائج بھگتنے پر مجبور ہوں گے اور مرکز میں مستقل اور مسلسل ہندو اکثریت کے مقابلے میں اُن کے حقوق و مفادات کا مناسب تحفظ ممکن نہیں ہو سکے گا:

''جیسا کہ مسلمان اس بات پر قائل ہیں کہ مسلم ہندوستان کو ہندوؤں کی بالادستی سے بچانے کے پیشِ نظر اور مسلمانوں کو اپنی عقل و فہم کے مطابق ترقی کے مکمل مواقع بہم پہنچانے کے لیے لازم ہے کہ ایک آزاد و خود مختار ریاست تشکیل دی جائے جو شمال مشرقی زون میں آسام اور بنگال پر اور شمال مغربی زون میں پنجاب، شمال مغربی صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہو:

''مسلم لیگ کے صوبائی اور مرکزی قانون سازوں کا یہ کنونشن مناسب غور و خوض کے بعد اس قرارداد کے ذریعہ اعلان کرتا ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم پورے متحدہ ہندوستان کے لیے کسی ایک دستور کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے اور نہ کسی ایسی دستور ساز مشینری کا حصہ بنیں گے جو اس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہو۔ برطانوی حکومت کی طرف سے پیش کردہ ایسا کوئی فارمولا جس کا مقصد برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کے عوام کی طرف اقتدار کی منتقلی ہو اور جو ملک کے داخلی امن و سکون کے لیے وضع کیے گئے درج ذیل منصفانہ اور عادلانہ اُصولوں پر مشتمل نہ ہو وہ ہندوستان کے مسئلے کے حل میں معاون نہیں ہو سکتا:

() کہ ہندوستان کے شمال مشرق میں بنگال اور آسام پر مشتمل زون اور شمال مغرب میں

پنجاب، شمال مغربی صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل زون .... جنہیں پاکستان زون کا نام دیا جائے گا اور جہاں مسلمان غالب اکثریت میں آباد ہیں .... پر مشتمل ایک آزاد اور خودمختار ریاست تشکیل دی جائے اور پاکستان کے بلاتاخیر قیام کی واضح اور غیر مبہم ضمانت دی جائے۔

- کہ پاکستان اور ہندوستان کے عوام اپنے اپنے دستور کی تشکیل کے لیے دو علیحدہ علیحدہ دستور ساز ادارے منتخب کریں۔
- کہ پاکستان اور ہندوستان کی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے، آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے مطابق ضمانتیں فراہم کی جائیں۔
- کہ مطالبۂ پاکستان کو تسلیم کر کے اس پر فوری عملدرآمد، مرکز میں عبوری حکومت کے قیام میں شرکت اور تعاون کے لیے مسلم لیگ کی طرف سے بنیادی شرط ہے۔
- یہ کنونشن بالاصرار مزید اعلان کرتا ہے کہ مسلمانوں کے مطالبے کے علی الرغم، پورے ہندوستان پر صرف ایک دستور مسلط کرنے یا مرکز میں کسی عبوری انتظام کو نافذ کرانے کی کوشش مسلمانوں کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑے گی، سوائے اس کے کہ وہ اپنے وجود اور بقا کے لیے ہر ممکن طریقے سے اس اقدام کی بھرپور مزاحمت کریں۔

حوالہ: Memoirs of H. S. Suhrawardy (1987)

قائداعظم محمد علی جناح، مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ دہلی کی صدارت کرتے ہوئے۔ ۱۹۴۶ء

ضمیمہ چہارم

کیبنٹ مشن پلان

۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء

۱) برطانوی ہند اور ریاستوں پر مشتمل ایک یونین آف انڈیا ہوگی جس کی تحویل میں امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے ہوں گے اور اُسے ان محکموں کے لیے مالی وسائل جمع کرنے کے تمام ضروری اختیارات حاصل ہوں گے۔

۲) یونین کی ایک انتظامیہ اور ایک مقننہ ہوگی جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔ کسی بڑے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے مقننہ پر فیصلہ کرنے کے لیے لازم ہوگا کہ وہ دونوں بڑے فرقوں کے موجود نمائندوں کے ووٹوں کی اکثریت کے ساتھ ساتھ مجموعی ووٹوں کی اکثریت بھی حاصل کرے۔

۳) مرکزی محکموں کے علاوہ تمام محکمے اور تمام باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے۔

۴) ریاستوں کو، ماسوا اُن اختیارات کے جو یونین کو تفویض کر دیے گئے ہوں، تمام محکمے اور اختیارات حاصل ہوں گے۔

۵) صوبے ایسے گروپ تشکیل دینے میں آزاد ہوں گے جن کی اپنی انتظامیہ اور مقننہ ہوگی اور ہر گروپ اُن صوبائی محکموں کا تعین کر سکے گا جو گروپ کے مشترکہ انتظام میں دیے جائیں گے۔

۶) یونین اور گروپوں کے دستور میں ایسی شقیں رکھی جائیں گی جن کے تحت کوئی صوبہ، ابتدائی دس سال کی مدت گزارنے کے بعد اور بعدازاں ہر دس سال بعد، اپنی مقننہ میں اکثریتی ووٹ کے ذریعے دستوری شرائط پر دوبارہ غور وخوض کا مطالبہ کر سکے گا۔

ہمارا مقصد درج بالا سطور کے مطابق کسی دستور کی تفصیلات طے کرنا نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد ایسی مشینری کو حرکت میں لانا ہے جس کے ذریعے ہندوستان کے لوگ اپنے لیے دستور وضع کر سکیں۔ بحوالہ: عزیز بیگ: The Quiet Revolution (1959) p 229

تاجِ برطانیہ کا فرمان

فروری ۱۹۴۷ء

کیبنٹ مشن کی شبانہ روز محنت سے دستور سازی کے بنیادی طریق کار پر بڑی حد تک اتفاق رائے ہو گیا تھا، جس کا اظہار مشن کے گزشتہ مئی کے بیان میں کر دیا گیا تھا۔ اور ملک معظم کی حکومت نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ وہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے اُس دستور کی سفارش کرے گی جو مذکورہ تجاویز کے مطابق، ایک نمائندہ دستور ساز اسمبلی سے منظور شدہ ہوگا۔

لیکن اگر یہ محسوس کیا گیا کہ پیراگراف سات کے تحت مقرر کی گئی آخری تاریخ تک یہ دستور ایک نمائندہ دستور ساز اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش نہیں ہو سکے گا تو ملک معظم کی حکومت دیکھے گی کہ مقررہ تاریخ پر مرکزی حکومت کے اختیارات کس کو منتقل کیے جائیں، پورے برطانوی ہند کے لیے ایک مرکزی حکومت کو یا بعض امور میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو۔ یا پھر انتقالِ اقتدار کا کوئی دوسرا معقول طریقہ اختیار کیا جائے گا جو باشندگانِ ہند کے بہترین مفاد میں ہو۔

گو کہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے اقتدار حتمی طور پر منتقل نہیں ہو پائے گا لیکن اس کی تیاری کے تمام اقدام لازماً پیشگی کر لیے جانے چاہئیں۔ یہ بات اہم اور لازم ہے کہ سول انتظامیہ کی کارکردگی کو برقرار رکھا جائے اور دفاعِ ہند کا مکمل انتظام موجود ہو۔ انتقالِ اقتدار کے عمل کے شروع ہونے کے بعد رفتہ رفتہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی تمام دفعات پر حرف بہ حرف عمل کرنا مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ تاہم انتقالِ اقتدار کو حتمی شکل دینے کے لیے وقت آنے پر ضروری قانون سازی بھی کی جائے گی۔

جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق ہے، اور جیسا کہ کیبنٹ مشن واضح کر چکا ہے، حکومت برطانیہ کا قطعاً ارادہ نہیں ہے کہ ان کی ذمہ داریاں اور اختیارات برطانوی ہند کی کسی

حکومت کے اقتدار اعلیٰ کے زیرنگیں کر دیے جائیں۔ اختیارات کی حتمی منتقلی تک اقتدار اعلیٰ کے نظام کو آخری شکل دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے تاہم درمیانی مدت میں تاج برطانیہ ہر ریاست کے ساتھ علیحدہ علیحدہ معاہدوں کے ذریعہ اپنے تعلقات کا تعین کر سکتا ہے۔

ملک معظم کی حکومت انتقالِ اقتدار سے پیدا ہونے والے معاملات کے معاہدے اُن نمائندوں کے ساتھ گفت وشنید کے ذریعے طے کرے گی جنہیں وہ اختیارات منتقل کرنا چاہتی ہے۔ ملک معظم کی حکومت باشندگانِ ہند کے لیے، اپنے عوام کی نیک تمناؤں اور خیرسگالی کے جذبات کے اظہار کے بغیر اس بیان کو مکمل نہیں کر سکتی، جو حکومت خوداختیاری کے حصول کے آخری مرحلے کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ جزائر برطانیہ میں بسنے والے ہر فرد کی خواہش ہوگی کہ دستوری ترمیمات کے علی الرغم برطانیہ اور ہندوستان کے عوام کے درمیان وابستگی اور تعلق کو برقرار رکھا جائے؛ وہ ہندوستان کی فلاح و بہبود میں اضافے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔

بحوالہ: عزیز بیگ: The Quiet Revolution (1959) p 230-31

قائداعظم محمد علی جناح (بائیں سے دوسرے) برطانوی کیبنٹ مشن کے ارکان سے ملتے ہوئے۔ ۱۹۴۶ء

ضمیمہ ششم

۳ جون ۱۹۴۷ء کا منصوبۂ تقسیمِ ہند

۱۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو ملک معظم کی حکومت نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ برطانوی ہند میں ہندوستانیوں کو جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار سپرد کر دیا جائے گا۔ ملک معظم کی حکومت کو یہ امید تھی کہ بڑی جماعتوں کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ کابینہ مشن کے ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء والے منصوبے پر عملدرآمد کے لیے تعاون کرتے ہوئے ہندوستان کا ایک ایسا دستور وضع کر سکیں جو تمام متعلقہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ یہ امید پوری نہیں ہو سکی۔

۲۔ مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی اور برار، آسام، اُڑیسہ اور صوبہ سرحد کے نمائندوں کی اکثریت اور دہلی، اجمیر، میواڑ اور کورگ کے نمائندے ایک نیا دستور وضع کرنے کے سلسلے میں پہلے ہی پیش رفت کر چکے ہیں۔ دوسری طرف مسلم لیگ پارٹی نے جس میں بنگال، پنجاب اور سندھ کے نمائندوں کی اکثریت اور برطانوی بلوچستان کے نمائندے بھی شامل ہیں، مجلس دستور ساز میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

۳۔ ملک معظم کی حکومت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ اقتدار کی منتقلی خود ہندوستانی باشندوں کی خواہشات کے مطابق ہو۔ اگر ہندوستانی سیاسی جماعتوں کے درمیان اتفاق رائے موجود ہوتا تو یہ کام بہت زیادہ آسان ہو جاتا۔ لیکن اس قسم کے کسی سمجھوتے کی غیر موجودگی میں ہندوستانیوں کی خواہشات معلوم کرنے کا طریقہ وضع کرنے کا کام ملک معظم کی حکومت پر آن پڑا ہے۔ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں سے اچھی طرح مشورہ کرنے کے بعد ملک معظم کی حکومت نے حسب ذیل منصوبہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔
ملک معظم کی حکومت اس امر کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ وہ ہندوستان کے لیے کوئی حتمی دستور بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، یہ معاملہ خود ہندوستانیوں ہی پر منحصر ہے اور اس

منصوبے میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جو ایک متحدہ ہندوستان کے لیے مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان گفت وشنید کے راستے میں رکاوٹ ہو۔

۴۔ مَلِک معظم کی حکومت کا یہ ارادہ بھی نہیں ہے کہ موجودہ مجلسِ دستور ساز کے کام میں مداخلت کی جائے۔ اب جب کہ بعض صوبوں کے لیے، جن کی صراحت ذیل میں موجود ہے، آئینی بندوبست کر دیا گیا ہے، ملک معظم کی حکومت کو اعتماد ہے کہ جن صوبوں کے نمائندوں کی اکثریت پہلے ہی مجلس دستور ساز میں شرکت کر رہی ہے، اس اعلان کے بعد اُن صوبوں کے مسلم لیگی نمائندے بھی اِس مجلس کی کارروائیوں میں اپنا مناسب حصہ ڈالیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس بات میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ اس مجلس کا بنایا ہوا کوئی دستور ملک کے اُن حصوں پر نافذ نہیں کیا جا سکتا جو اسے قبول کرنے پر راضی نہ ہوں۔ ملک معظم کی حکومت کو اطمینان ہے کہ ذیل میں پیش کردہ خاکہ ان علاقوں کے باشندوں کی خواہشات معلوم کرنے کے بہترین عملی طریقے پر مشتمل ہے جس سے اُن کے دستور کی تشکیل کی جا سکے، آیا (الف) موجودہ مجلس دستور ساز میں، یا (ب) ایک نئی جداگانہ مجلس دستور ساز میں جو اُن علاقوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو جو اپنے فیصلے کے مطابق موجودہ مجلسِ دستور ساز میں شریک نہیں ہوں گے۔ جب یہ کام کر لیا جائے گا تو یہ فیصلہ کرنا ممکن ہوگا کہ کس حکومت یا حکومتوں کو اقتدار منتقل کرنا چاہیے۔

۵۔ اس لیے بالترتیب بنگال اور پنجاب کی مجالس قانون ساز (باستثنائے یورپی ارکان) کے اجلاس دو حصوں میں ہوں گے، ایک حصہ وہ جو مسلم اکثریت والے اضلاع کا نمائندہ ہو اور دوسرا حصہ وہ جو باقی صوبہ کا نمائندہ ہو۔ اضلاع کی آبادی کا تعین کرنے کے لیے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو مستند تسلیم کیا جائے گا۔ اِن دونوں صوبوں کے مسلم اکثریت والے اضلاع اِس اعلان کے ضمیمے میں دے دیے گئے ہیں۔

۶۔ دونوں صوبوں کی مجلسِ قانون ساز کے دونوں حصوں کے ارکان کو جو الگ الگ بیٹھیں گے، یہ رائے دینے کا اختیار ہوگا کہ اُن کے صوبے کو تقسیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اگر کسی ایک حصہ کی سادہ اکثریت تقسیم کے حق میں فیصلہ کرتی ہے تو تقسیم عمل میں آئے گی اور اس کے مطابق انتظامات کیے جائیں گے۔

۷۔ تقسیم کے بارے میں فیصلہ ہونے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ ہر حصے کو پہلے سے یہ معلوم ہو کہ اگر دونوں حصوں نے متحد رہنے کا فیصلہ کیا تو صوبہ بحیثیتِ مجموعی کس مجلسِ دستور ساز میں شریک ہوگا۔ اس لیے کسی ایک مجلس قانون ساز کا کوئی رکن اس بارے میں مطالبہ کرے تو اُس مجلسِ قانون ساز کے تمام ارکان کا (باستثنائے یورپی ارکان) ایک اجلاس منعقد ہوگا جس میں یہ طے کیا جائے گا کہ اگر دونوں حصوں نے متحد رہنے کا فیصلہ کیا تو صوبہ بحیثیت مجموعی کس مجلسِ دستور ساز میں شریک ہوگا۔

۸۔ صوبے کی تقسیم کا فیصلہ ہو جانے کی صورت میں مجلس قانون ساز کا ہر حصہ، اُن علاقوں کی طرف سے جن کا وہ نمائندہ ہے، یہ فیصلہ کرے گا کہ مندرجہ بالا پیرا گراف میں جو متبادل صورتیں بیان کی گئی ہیں، وہ اُن میں سے کون سی صورت کو اختیار کیا جائے۔

۹۔ تقسیم کے مسئلے پر فوری فیصلہ کرنے کے لیے بنگال اور پنجاب کے ارکان کا اجلاس مسلم اکثریت والے اضلاع (جو ضمیمے میں دیے گئے ہیں) اور غیر مسلم اکثریت والے اضلاع کی بنیاد پر دو حصوں میں ہوگا۔ یہ محض ایک ابتدائی قدم ہوگا جس کی نوعیت بالکل عارضی ہوگی۔ واضح رہے کہ ان صوبوں کی حتمی تقسیم کے لیے سرحد کے تعین سے متعلق معاملات پر مفصل تحقیقات کی ضرورت ہوگی، اور جیسے ہی کسی صوبے کی تقسیم کا فیصلہ ہو جائے گا، گورنر جنرل ایک سرحدی کمیشن مقرر کریں گے جس کی رکنیت اور حدودِ کار کا فیصلہ متعلقہ لوگوں کے مشورے سے کیا جائے گا۔ اِسے یہ ہدایت کی جائے گی کہ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی اکثریت والے متصل علاقوں کی تحقیقات کی بنیاد پر پنجاب کے دو حصوں کی سرحدوں کی نشان دہی کرے۔ اِسے یہ بھی ہدایت کی جائے گی کہ وہ دوسرے عوامل کا بھی لحاظ کرے۔ اسی قسم کی ہدایات بنگال کے سرحدی کمیشن کو بھی دی جائیں گی۔ اِس سرحدی کمیشن کی رپورٹ پر عمل درآمد تک اُن عارضی سرحدوں کو استعمال کیا جائے گا جو ضمیمے میں ظاہر کی گئی ہیں۔

۱۰۔ سندھ کی مجلسِ قانون ساز (باستثنائے یورپی ارکان) ایک خصوصی اجلاس میں پیرا گراف نمبر چار کی متبادل صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے بارے میں اپنا فیصلہ خود کرے گی۔

۱۱۔ صوبہ سرحد کی حیثیت غیر معمولی ہے۔ اس صوبے کے تین نمائندوں میں سے دو موجودہ دستور ساز اسمبلی میں پہلے ہی شرکت کر رہے ہیں۔ مگر جغرافیائی محلِ وقوع اور دیگر امور کے پیشِ نظر یہ طے ہے کہ اگر مکمل پنجاب یا اس کا کوئی حصہ موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کرتا ہے تو صوبہ سرحد کو اپنی حیثیت پر دوبارہ غور کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چنانچہ اس قسم کی صورت پیدا ہونے پر صوبہ سرحد کی موجودہ قانون ساز اسمبلی کے ووٹروں سے یہ استصواب عامہ کیا جائے گا کہ وہ درج بالا پیراگراف نمبر چار میں مذکور متبادل صورتوں میں سے کون سی صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ استصواب رائے عامہ گورنر جنرل کے زیر سرپرستی اور صوبائی حکومت کے مشورے سے منعقد کیا جائے گا۔

۱۲۔ برطانوی بلوچستان نے ایک رکن منتخب کیا ہے مگر اُس نے موجودہ دستور ساز اسمبلی میں اپنی نشست نہیں سنبھالی۔ لہٰذا اس صوبے کو اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کے پیشِ نظر اپنی پوزیشن پر دوبارہ غور کرنے کا موقع دیا جائے گا تاکہ وہ فیصلہ کر سکے کہ درج بالا پیراگراف ۴ میں دی گئی متبادل صورتوں میں سے وہ کون سی صورت اختیار کرے گا۔ فضیلت مآب گورنر جنرل جانچ پڑتال کر رہے ہیں کہ اس کام کا مناسب ترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔

۱۳۔ آسام اگرچہ واضح طور پر ایک غیر مسلم صوبہ ہے مگر بنگال سے متصل ضلع سلہٹ میں مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ یہ مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ بنگال کے تقسیم ہونے کی صورت میں سلہٹ کو بنگال کے مسلم حصے میں مدغم کر دیا جائے۔ اندریں حالات اگر یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ بنگال کو تقسیم کر دیا جائے تو ضلع سلہٹ میں گورنر جنرل کے زیر سرپرستی اور آسام کی صوبائی حکومت کے مشورے سے ایک استصواب رائے منعقد کیا جائے گا جس کے تحت یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ضلع سلہٹ آسام کے صوبے میں شامل رہے یا مشرقی بنگال کی رضامندی سے اُس میں مدغم کر دیا جائے۔ اگر اس استصواب کے نتیجے میں مشرقی بنگال کے ساتھ ادغام کا فیصلہ ہوتا ہے تو ایک سرحدی کمیشن تشکیل دیا جائے گا جس کی حدودِ کار وہی ہوں گی جو پنجاب اور بنگال کے لیے مقرر کی گئی تھیں تاکہ وہ ضلع سلہٹ اور متصلہ

ضلعوں کے مسلم اکثریت والے علاقوں کی حد بندی کر سکے جنہیں بعدازاں مشرقی بنگال میں منتقل کر دیا جائے گا۔ آسام کے باقی ماندہ صوبے کی موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شرکت بہرصورت جاری رہے گی۔

۱۴۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ ہونے کی صورت میں ضروری ہوگا کہ وہاں نئے انتخابات کرائے جائیں تاکہ کابینہ مشن کے ۱۶رمئی ۱۹۴۶ء کے منصوبے میں دیے گئے پیمانے کے مطابق ہر دس لاکھ کی آبادی پر ایک نمائندے کے حساب سے وہاں کے نمائندے منتخب ہو سکیں۔ ضلع سلہٹ کے مشرقی بنگال کا حصہ بننے کا فیصلہ ہونے کی صورت میں وہاں بھی اسی طرح انتخابات منعقد ہوں گے۔ ہر علاقہ نمائندوں کی حسبِ ذیل تعداد کا حقدار ہوگا:

صوبہ	عام	مسلم	سکھ	میزان
ضلع سلہٹ	۱	۲	کوئی نہیں	۳
مغربی بنگال	۱۵	۴	کوئی نہیں	۱۹
مشرقی بنگال	۱۲	۲۹	کوئی نہیں	۴۱
مغربی پنجاب	۳	۱۲	۲	۱۷
مشرقی پنجاب	۶	۴	۲	۱۲

۱۵۔ مختلف علاقوں کے نمائندے اپنے مینڈیٹ کے مطابق یا تو موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شامل ہو جائیں گے یا وہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی تشکیل دیں گے۔

۱۶۔ تقسیم سے متعلق کسی بھی فیصلہ کے انتظامی نتائج و عواقب کے بارے میں جلد از جلد گفت و شنید کا آغاز کرنا ضروری ہوگا:

الف) مختلف جانشین حکومتوں کے نمائندوں کے درمیان دفاع، مالیات اور مواصلات سمیت اُن تمام معاملات پر جن کی ذمہ داری آج کل مرکزی حکومت کے پاس ہے؛

ب) مختلف جانشین حکومتوں اور مَلِک معظم کی حکومت کے درمیان انتقال اقتدار سے پیدا ہونے والے معاملات پر؛

ج) تقسیم کیے جانے والے صوبوں کے معاملات کے بارے میں مثلاً اثاثوں اور

واجبات کی تقسیم، پولیس اور دوسری ملازمتیں، عدالتِ عالیہ، صوبائی ادارے وغیرہ۔

۱۷۔ متعلقہ جانشین حکومت کو ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے قبائل سے معاہدے کرنے پڑیں گے۔

۱۸۔ مَلِک معظم کی حکومت واضح کر دینا چاہتی ہے کہ جن فیصلوں کا اوپر اعلان کیا گیا ہے، ان کا تعلق صرف برطانوی ہند سے ہے اور ہندوستانی ریاستوں سے متعلق مَلِک معظم کی حکومت کی کابینہ مشن کی یادداشت مورخہ ۱۲ رمئی ۱۹۴۶ء میں درج پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

۱۹۔ جانشین حکومتوں کو اقتدار سنبھالنے کے لیے تیاری کا وقت مل سکے، اس مقصد کے پیش نظر یہ امر اہم ہے کہ مندرجہ بالا تمام کارروائیاں جلد از جلد مکمل کر لی جائیں۔ تاخیر سے بچنے کے لیے مختلف صوبے یا صوبوں کے حصے، اس منصوبے پر شرائط کے اندر رہتے ہوئے ممکنہ حد تک آزادانہ عمل کریں گے۔ موجودہ دستور ساز اسمبلی اور نئی دستور ساز اسمبلی (اگر تشکیل پائی) اپنے اپنے علاقوں کے لیے دستور سازی کا کام شروع کر دیں گی؛ وہ اپنے قواعد بنانے میں بلاشبہ آزاد ہوں گی۔

۲۰۔ بڑی سیاسی جماعتوں نے اپنی اس خواہش پر بار بار زور دیا ہے کہ ہندوستان میں جتنی جلد ممکن ہو انتقالِ اقتدار ہو جانا چاہیے۔ مَلِک معظم کی حکومت اس خواہش کے ساتھ مکمل اتفاق رکھتی ہے اور آزاد ہندوستانی حکومت یا حکومتیں قائم کر کے انہیں اقتدار منتقل کرنے کے لیے جون ۱۹۴۸ء یا اس سے قبل کی تاریخ پیشگی مقرر کرنے کو تیار ہے۔ چنانچہ اس خواہش کی تکمیل کے لیے سب سے زیادہ فوری اور حقیقتاً واحد قابلِ عمل طریقہ سمجھتے ہوئے تجویز کرتی ہے کہ پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس کے دوران ہی اس اعلان کے نتیجے میں قائم ہونے والی جانشین حکومت یا دو حکومتوں کو نوآبادی کا درجہ دے کر اسی سال اقتدار منتقل کرنے کے لیے مسودہ قانون پیش کر دیا جائے۔ یہ عمل ہندوستانی دستور ساز اسمبلیوں

پیراگراف ۱۹ کے محذوف ٹکڑے میں صوبوں کی گروہ بندی حسب ذیل حصوں میں کی گئی ہے:۔ (الف) مدراس، بمبئی، صوبہ متحدہ، بہار، صوبہ متوسط اور اڑیسہ، (ب) پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ اور (ج) بنگال اور آسام۔ اس میں ہر صوبے کے لیے ملت وارانہ بنیاد پر مختص کی گئی نشستوں کی تعداد بھی دی گئی ہے۔

کے اس حق پر اثر انداز نہیں ہوگا جس کے تحت وہ مناسب مدت میں یہ فیصلہ کر سکتی ہیں کہ اُن کے زیرِ اختیار ہندوستان کا حصہ برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہے گا یا نہیں۔

۲۱۔ فضیلت مآب گورنر جنرل وقتاً فوقتاً ایسے مزید اعلانات کرتے رہیں گے جو مذکورہ بالا انتظامات کی انجام دہی کے طریق کار یا اسی طرح کے کسی اور معاملے کے متعلق ہوں۔

تتمہ (الف)

۱۹۴۱ء کی مردم شماری، کے مطابق پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریت والے اضلاع

(ملاحظہ ہو اس بیان کا پیراگراف ۵)

۱۔ پنجاب

لاہور ڈویژن:	گوجرانوالہ، گورداس پور، لاہور، شیخوپورہ اور سیالکوٹ۔
راولپنڈی ڈویژن:	اٹک، گجرات، جہلم، میانوالی، راولپنڈی اور شاہ پور۔
ملتان ڈویژن:	ڈیرہ غازی خان، جھنگ، لائل پور، منٹگمری، ملتان اور مظفر گڑھ۔

۲۔ بنگال

چاٹگام ڈویژن:	چاٹگام، نواکھالی اور ٹپرا۔
ڈھاکا ڈویژن:	باقر گنج، ڈھاکا، فرید پور اور میمن سنگھ۔
پریذیڈنسی ڈویژن:	جیسور، مرشد آباد اور نادیا۔
راجشاہی ڈویژن:	بوگرا، دیناج پور، مالدہ، پبنہ، راج شاہی اور رنگ پور۔

جون 1947ء

بحوالہ: عزیز بیگ The Quiet Revolution (1959) p 231-37

قانونِ آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء

اقتباسات

ایک بل جس کے ذریعے ہندوستان میں دو خود مختار مملکتوں کے قیام اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں بعض دفعات میں ترمیم کی گنجائش پیدا کرنا مقصود ہے، جن کا اطلاق ان مملکتوں سے باہر ہوگا، ایسے دیگر امور کی بھی گنجائش نکالنا جو ان مملکتوں کے قیام کے نتیجے میں سامنے آئیں یا ان سے متعلق ہوں۔

دفعہ۱: ذیلی دفعہ۱: ۱۵/اگست ۱۹۴۷ سے ہندوستان میں دو آزاد مملکتیں قائم کی جائیں گی جنہیں بالترتیب ہندوستان اور پاکستان کے نام سے جانا جائے گا۔

ذیلی دفعہ۲: مذکورہ مملکتوں کو اس ایکٹ میں بعد ازاں ''نئی مملکتیں'' اور اگست کے مذکورہ پندرہویں دن کو ''مقررہ دن'' کہا جائے گا۔

دفعہ۲: ذیلی دفعہ۱: اس دفعہ کی ذیلی دفعہ۳ اور۴ میں رکھی گئی گنجائشوں کے ماتحت ہندوستان کی عملداری، تاجِ برطانیہ کے زیرِ سایہ، اُن حدود پر مشتمل ہوگی جو مقررہ دن سے پہلے برطانوی ہند کی حدود میں شامل تھیں، ماسوا اُن حدود کے جو اس دفعہ کی ذیلی دفعہ۲ کے تحت پاکستان کی عملداری میں ہوں گی۔

ذیلی دفعہ۲: اس دفعہ کی ذیلی دفعہ۳ اور۴ میں رکھی گئی گنجائشوں کے ماتحت پاکستان کی عملداری اُن عملداریوں پر مشتمل ہوگی جو (الف) مقررہ دن کو مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب میں شامل ہوں اور جو بعد ازاں آنے والی دفعات کے تحت تشکیل دی گئی ہوں؛ (ب) جو اس قانون کے منظور ہونے والے دن سندھ اور چیف کمشنر کے برطانوی بلوچستان کی حدود میں شامل ہوں؛ اور (ج) جو اس قانون کے نفاذ کے دن (شمال مغربی صوبہ سرحد) کا حصہ ہوں بشرطیکہ اس قانون کے لاگو ہونے سے پیشتر یا بعد ازاں مگر مقررہ دن سے پہلے، اس سلسلے میں

گورنر جنرل کے اختیارات کے تحت اعلان کردہ ریفرنڈم میں، جو اس قانون کے نفاذ والے دن یا اس سے ذرا پہلے شمال مغربی صوبہ سرحد میں منعقد ہوا ہو، پڑنے والے صحیح ووٹ اُن نمائندوں کے حق میں ہوں جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں حصہ لے رہے ہوں۔

ذیلی دفعہ۳: اس دفعہ میں درج کوئی شق کسی علاقے کو کسی بھی وقت دونوں نئی مملکتوں میں شامل یا خارج ہونے سے باز نہیں رکھے گی تاوقتیکہ (الف) وہ علاقہ جو اُن عملداریوں کا حصہ نہ ہو جس کی صراحت مذکورہ ذیلی دفعہ (۱) میں یا بشرط اطلاق ذیلی دفعہ (۲) میں ہے، اور جو مقررہ دن کے بعد دونوں میں سے کسی ایک میں شامل کر لی گئی ہو، مذکورہ مملکت کی مرضی کے بغیر اُس سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔

ذیلی دفعہ۴: اس حصے کی ذیلی دفعہ۳ کی عمومیت سے متاثر ہوئے بغیر، اس حصے کی کوئی چیز ہندوستانی ریاستوں کو دونوں نئی مملکتوں میں سے کسی ایک سے الحاق سے نہیں روکے گی۔

بنگال اور آسام

دفعہ۳: ذیلی دفعہ۱: مقررہ دن کے بعد سے (الف) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت قائم شدہ صوبہ بنگال کالعدم ہو جائے گا اور اس کی جگہ دو نئے صوبے، مشرقی بنگال اور مغربی بنگال تشکیل دیے جائیں گے۔

ذیلی دفعہ۲: اس قانون کے لاگو ہونے سے پہلے یا بعد، مگر مقررہ دن سے پہلے، اگر گورنر جنرل اعلان کرے کہ اس سلسلے میں ہونے والے ریفرنڈم میں، جو اس قانون کے لاگو ہونے کے وقت یا اس سے ذرا پہلے منعقد ہوا ہو، صحیح ووٹوں کی اکثریت ضلع سلہٹ کو مشرقی بنگال کا حصہ بنانے کے حق میں ڈالی گئی ہے، تو اُس دن سے صوبہ آسام کا یہ حصہ اس قانون کی دفعہ ھٰذا کی ذیلی دفعہ۳ کے تحت مشرقی بنگال کا حصہ بن جائے گا۔

ذیلی دفعہ۳: مذکورہ نئے صوبوں کی حدود اور، اس دفعہ کی ذیلی دفعہ۲ میں مذکورہ صورت میں، مقررہ دن کے بعد صوبہ آسام کی حدود وہ ہوں گی جو مقررہ دن کو یا اس کے بعد گورنر جنرل کے مقرر کردہ باؤنڈری کمیشن کی طرف سے متعین کی جائیں گی۔ مگر جب تک اس طرح یہ حدود متعین ہوں (الف) اس قانون کے جدول اول میں صراحت کردہ بنگال کے اضلاع اور اس

دفعہ کی ذیلی دفعہ ۲ کے تحت مذکورہ صورت میں صوبہ آسام کا ضلع سلہٹ مشرقی بنگال کے صوبے کی تشکیل کرنے والی عملداریوں میں شامل سمجھی جائیں گی (ب) اس قانون کے لاگو ہونے والے دن، صوبہ بنگال کی باقی ماندہ عملداریاں مغربی بنگال کا حصہ سمجھی جائیں گی۔ (ج) اس دفعہ کی ذیلی دفعہ ۲ میں درج صورتحال میں ضلع سلہٹ صوبہ آسام کا حصہ نہیں رہے گا۔

پنجاب

دفعہ ۳: ذیلی دفعہ ۱: مقررہ دن کے بعد سے (الف) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت قائم شدہ صوبہ پنجاب کالعدم ہو جائے گا اور اس کی جگہ دو نئے صوبے، مغربی پنجاب اور مشرقی پنجاب تشکیل دیے جائیں گے۔

ذیلی دفعہ ۲: مذکورہ نئے صوبوں کی حدود وہ ہوں گی جو مقررہ دن سے پہلے یا بعد، گورنر جنرل کے مقرر کردہ باؤنڈری کمیشن کی طرف سے متعین کی جائیں گی۔ مگر جب تک اس طرح یہ حدود متعین ہوں (الف) اس قانون کے جدول دوم میں صراحت کردہ تمام اضلاع صوبہ مغربی پنجاب کی تشکیل کرنے والی عملداریوں میں شامل سمجھی جائیں گی (ب) اس قانون کے لاگو ہونے والے دن، صوبہ پنجاب کی باقی ماندہ عملداریاں مغربی پنجاب کا حصہ سمجھی جائیں گی۔

مقررہ دن کے بعد سے:

(۱) سلطنت متحدہ (United Kingdom) میں قائم ملک معظم کی حکومت پر، مقررہ دن سے قبل برٹش انڈیا میں شامل عملداریوں، کی حکومت کے سلسلے میں کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

(۲) ہندوستانی ریاستوں پر سے ملک معظم کا اقتدار اعلیٰ ختم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تمام معاہدے اور میثاق، جو اس قانون کے لاگو ہونے والے دن تک، ملک معظم اور ہندوستانی رجواڑوں کے درمیان مؤثر تھے، وہ تمام امور جو ہندوستانی ریاستوں کے سلسلے میں ملک معظم کی طرف سے نمٹائے جاتے تھے، وہ تمام ذمہ داریاں جو ملک معظم نے ہندوستانی ریاستوں یا ان کے حکمرانوں کے سلسلے میں قبول کی تھیں، اور تمام اختیارات، حقوق، اقتدار اور دائرۂ اختیار جو ملک معظم کو حاصل تھے، ختم ہو جائیں گے۔

جولائی ۱۹۴۷ء

بحوالہ: عزیز بیگ The Quiet Revolution (1959) p 237-40

ڈھاکا میں قائداعظم کی تقریر

''میرے نوجوان دوستو! یہاں پر موجود طالب علموں! مجھے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے کچھ کہنے کی اجازت دیجیے، جس کے دل میں ہمیشہ آپ کے لیے محبت اور چاہت کا جذبہ موجزن رہا ہے اور جو دس سال تک خلوص اور وفاکشی کے ساتھ آپ کی خدمت کرتا رہا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کو خبردار کروں کہ یہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگی اگر آپ کسی ایک یا دوسری سیاسی پارٹی کا آلہ کار بن گئے۔ یاد رکھیے کہ ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو چکی ہے، اب ہماری اپنی حکومت ہے۔ ہم ایک آزاد اور خودمختار مملکت بنا چکے ہیں۔ اس لیے اب ہمیں آزاد لوگوں کی طرح ہی عمل کرنا چاہیے اور اسی طریقہ پر اپنے معاملات کا انتظامی حل کرنا چاہیے کیونکہ ہم پر اب کسی غیر ملکی طاقت کا کوئی ظلم یا دباؤ نہیں ہے۔ ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ دی ہیں اور قید کی بیڑیاں کاٹ دی ہیں۔ میرے نوجوان دوستو! میری نظر میں پاکستان کے اصل خالق آپ ہیں۔ کسی کا آلہ کار نہیں بنیں اور نہ کسی کو اجازت دیں کہ وہ آپ کو گمراہ کر سکے۔ اپنے اندر مکمل اتحاد اور یکجہتی پیدا کریں۔ آپ جو کچھ کر کے دکھا سکتے ہیں، اُس کی مثال قائم کیجیے۔ اپنے ساتھ، اپنے ماں باپ کے ساتھ اور اپنے وطن کے ساتھ۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اب آپ کی توجہ کا محور صرف اور صرف پڑھائی ہونا چاہیے۔ اگر آج آپ نے اپنی توانائیاں ضائع کر دیں تو یاد رکھیے کہ آپ ہمیشہ کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔ جب آپ اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے باہر آئیں گے، تو وہ وقت ہوگا جب آپ اپنے لیے اور اپنے وطن کی ترقی کے لیے اپنے حصے کا کام آزادانہ طور پر کر سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ واضح طور پر آپ کو اُن خطرات سے آگاہ کر دوں جو آج بھی پاکستان پر منڈلا رہے ہیں۔

''پاکستان کے قیام کو روکنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد، اپنی شکست سے بوکھلا کر

پاکستان کے دشمنوں کا ہدف اب مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر اس مملکت میں انتشار پیدا کرنا، بن گیا ہے۔ اور اب یہ لوگ صوبہ پرستی کو ہوا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب تک آپ اپنی ملکی سیاست سے اس زہر کو نکال کر پھینک نہیں دیتے، اُس وقت تک آپ خود کو متحد کر کے ایک حقیقی قوم کی حیثیت میں نہیں ڈھال سکتے۔ ہم کو چاہیے کہ ہم بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان وغیرہ کی باتیں نہ کریں۔ بلاشبہ یہ سب ایک قوم کی اکائیاں ہیں۔ لیکن مجھے بتلایے کہ کیا آپ اُس سبق کو بھول گئے ہیں جو آج سے تیرہ سو برس پہلے ہم کو پڑھایا گیا تھا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ آج آپ سب کی حیثیت باہر سے آکر بسنے والوں کی ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ بنگال کے اصل باشندے کون تھے؟ یقیناً وہ نہیں تھے جو آج یہاں رہ رہے ہیں۔ تو پھر کیا فائدہ کہ ہم اپنے آپ کو بنگالی، سندھی، پٹھان یا پنجابی کہلوائیں۔ نہیں! ہم مسلمان ہیں اور بس!

اسلام تو ہم کو یہی سکھاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے، اگر میں یہ کہوں کہ آپ کچھ بھی ہوں، کیسے بھی ہوں، بہرحال مسلمان ہیں۔ اب آپ ایک قوم سے وابستہ ہیں۔ آپ نے ایک سلطنت بنالی ہے، ایک وسیع و عریض سلطنت۔ جو آپ کی ہے۔ یہ نہ کسی پنجابی کی ہے، نہ کسی سندھی کی، نہ کسی پٹھان کی اور نہ کسی بنگالی کی، یہ فقط آپ کی ہے۔ اب مرکزی حکومت بھی آپ کی ہے جہاں (وفاق کی) مختلف اکائیوں کو نمائندگی حاصل ہے۔ اس لیے اگر آپ اپنی تعمیر ایک قوم کی حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں تو خدارا! صوبائیت سے چھٹکارا حاصل کیجیے۔ صوبائیت ایک لعنت ہے، اُسی طرح جیسے فرقہ پرستی.... شیعہ، سنّی وغیرہ۔

ہم سے پہلے والی حکومت کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ اس سلسلے میں کیوں فکرمند ہوتے؟ وہ تو یہاں ملک کا انتظام سنبھالنے، امن وامان برقرار رکھنے، اپنی تجارت چمکانے اور ہندوستان کا بھرپور استحصال کرنے آئے تھے۔ لیکن اب ہم ایک یکسر مختلف صورتحال سے دوچار ہیں۔ میں آپ کو امریکا کی مثال دیتا ہوں۔ جب اس نے برطانوی راج سے چھٹکارے اور خود کو ایک آزاد مملکت کا درجہ دینے کا اعلان کیا، اس وقت وہاں کتنی قومیں اور نسلیں آباد تھیں؟ ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، انگریز اور ولندیزی۔ -- یہ سب وہاں آباد تھے۔ انہیں بھی

بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ خیال رہے کہ ان کی قومیں تو زمین پر موجود تھیں اور وہ عظیم قومیں تھیں۔ آپ تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ آپ کو تو پاکستان ابھی ملا ہے۔ جبکہ ایک فرانسیسی وہاں (امریکا میں) کہہ سکتا تھا، ''میں ایک فرانسیسی ہوں اور میری قوم عظیم ہے۔'' اسی طرح دوسری قومیں بھی کہہ سکتی تھیں۔ لیکن ہوا کیا؟ وہ سمجھ دار تھے، انہوں نے بات کو سمجھا، اپنی مشکلات کا اندازہ کیا اور بہت تھوڑی مدت میں اپنے مسائل کو حل کر لیا اور ہر طرح کے تعصب اور گروہ بندی سے جان چھڑالی۔ آج وہ خود کو جرمن، فرانسیسی، انگریز یا ہسپانوی نہیں.... امریکن کہتے ہیں۔ وہ بڑے جذبے کے ساتھ کہتے ہیں، ''میں امریکن ہوں'' یا ''ہم امریکن ہیں''۔ سو اب آپ کو بھی اس طرح سوچنا چاہیے کہ آپ کا ملک پاکستان ہے اور آپ پاکستانی ہیں۔

...۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء

قائداعظم ڈھاکا، صوبہ مشرقی بنگال میں۔ ۱۹۴۸ء: ریڈیو پاکستان پر قوم سے خطاب (اوپر دائیں)۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں اساتذہ و طلبہ سے خطاب (اوپر بائیں)۔ سیاستدانوں اور معززین سے ملاقات (نیچے)

ملک غلام محمد

پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل
جنہوں نے پہلی دستور ساز اسمبلی برطرف کی (۱۹۵۴ء) جبکہ دستوری مسودہ اسمبلی میں پیش ہونے کے لیے تیار ہو چکا تھا

چوہدری محمد علی

متحدہ پاکستان کے چوتھے وزیراعظم
جنہوں نے ملک کو پہلا دستور دیا (۱۹۵۶ء)

اسماعیل ابراہیم چندریگر

متحدہ پاکستان کے چھٹے وزیراعظم

ملک فیروز خان نون

ساتویں وزیراعظم۔ پہلے مارشل لا نے ان کی حکومت برطرف کی اور ایوب خان کو وزیراعظم بنا دیا، جو ڈھائی ہفتے بعد صدر پاکستان بن بیٹھے

صدر ایوب خان کے نام
سابق وزیراعظم حسین شہید سہروردی کا
جیل سے مکتوب (۱۹۶۲ء)

جناب صدر،

مجھے ۳۰ جنوری ۱۹۶۲ء کو حراست میں لیا گیا تھا، میں اُس وقت سے، سکیورٹی آف پاکستان ایکٹ ۱۹۵۲ء کے تحت، کراچی کی سینٹرل جیل میں قید ہوں۔ ۵ فروری ۱۹۶۲ء کو مجھے حراست کی وجوہ سے آگاہ کیا گیا جو اتنی غیرواضح اور مبہم ہیں کہ ان کے بارے میں اپنا مؤقف پیش کرنا ناممکن ہے، سوائے اس کے کہ میں ان کے جھوٹا ہونے کے ثبوت کے طور پر اپنی ماضی کی خدمات کا حوالہ پیش کرتے ہوئے ان کو مسترد کردوں۔ گوکہ اس ضمن میں اپنی وکالت کرنا ناممکن ہے تاہم میں اپنا حق سمجھتے ہوئے آپ سے مخاطب ہوں۔

معذرت چاہتا ہوں اگر میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی ہو، لیکن، جناب صدر، میرے خلاف ہوئے بیانات اور تحقیر آمیز الزامات جو میری حب الوطنی کو چیلنج کر رہے ہوں، آپ کی ادنیٰ سی بھی توجہ کے کیسے مستحق ہو سکتے ہیں جبکہ آپ مجھے بہت قریب سے جانتے ہیں۔ میں اپنی حراست کی ''وجوہ'' کا حوالہ نہیں دوں گا، جو اتنی جھوٹی اور بے بنیاد ہیں کہ وہ میری گرفتاری کے علم کی اصل وجوہ نہیں ہو سکتیں۔ آپ کے ذہن کو یقیناً کچھ دوسرے الزامات سے زہر آلود کیا گیا ہے۔ میری گرفتاری کے اگلے ہی دن آپ نے پریس کو بڑی صاف گوئی سے اُن وجوہ سے آگاہ کیا تھا جو میری گرفتاری کا سبب بنیں، لیکن یہ وہ وجوہ نہیں تھیں جو مجھے سرکاری طور پر بتائی گئی ہیں۔ لہٰذا میری گرفتاری کا سبب وہ الزامات نہیں ہیں جن کی فہرست مجھے سرکاری طور پر مہیا کی گئی ہے۔

اب میں عرض کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا ''وجوہ'' کس طرح سے بے بنیاد ہیں۔

پہلی وجہ:

''پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک، بالخصوص پچھلے تین برسوں میں آپ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک پاکستان مخالف عناصر کے ساتھ وابستہ ہیں۔''

مجھے نہیں معلوم، لیکن میرا خیال ہے کہ مجھ سے وزیر قانون اور بعد ازاں وزیر اعظم مقرر ہونے سے پہلے کی سرگرمیوں کے بارے میں جواب طلب کیا جا رہا ہے۔ جب ہم اکٹھے کام کر رہے تھے، اُس وقت تو میں نے آپ کے منہ سے اپنی حب الوطنی کے مشکوک ہونے کے بارے میں ایک لفظ نہیں سنا۔ کاش کہ آپ کو معلوم ہوتا، اور تب ہی یہ بات آپ کی سمجھ میں بھی آتی کہ اگر میں تقسیم کے وقت ہندوستان میں نہیں رُکتا تو بنگال بھی اُسی تباہی کا شکار ہو جاتا جس کے سبب، پنجاب میں خون کی ندیاں بہہ گئی تھیں۔ اگر بنگال بھی اسی طرح کے قتلِ عام کا اکھاڑہ بن جاتا تو یقیناً کسی مسلمان کو ہندوستان میں رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور تھوک کی تعداد میں آنے والے مسلمانوں کے قافلے پاکستان کے لیے ایک ناممکن صورتحال پیدا کر دیتے۔ جہاں تک گزشتہ تین برسوں کا تعلق ہے، اس بارے میں الزام انتہائی جھوٹا اور تحقیر آمیز ہے۔ اس لیے بھی کہ میں نے سیاسی سطح پر ہر قسم کے رابطے منقطع کیے ہوئے ہیں اور میں پاکستانی سیاست کے معاملات پر کوئی بات کرنے سے انکار کر دیتا ہوں۔ پہلے میں بیرونِ ملک سرگرمیوں کے بابت الزام کی بات کرتا ہوں۔ ان الزامات کے بارے میں مجھے کسی قسم کی تفصیلات مہیا نہیں کی گئی ہیں۔ تفصیلات کے بغیر میں اس الزام کا کیا جواب دے سکتا ہوں۔ آپ کے انقلاب کے بعد میں صرف ایک بار، گزشتہ سال ۱۳رفروری سے ۱۳رنومبر تک، ملک سے باہر رہا ہوں۔ میں نے ملک سے باہر جاتے وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں سیاسی عناصر سے ملاقات نہیں کروں گا۔ اگر کسی سے ملاقات ہو بھی گئی تو پاکستان سے متعلق معاملات تو بالکل بھی زیرِ بحث نہیں لاؤں گا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ کیا عجب کہ مجھے ملک سے باہر جانے کی اجازت دی ہی اس لیے گئی تھی کہ مجھ پر یہ الزام لگانے میں آسانی ہو اور ملک سے باہر میری ملاقاتوں کو میری شہادت کو جھٹلانے میں استعمال کیا جا سکے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ پاکستان مخالف

عناصر ہیں کون، جن سے میں ملا تھا؟ یقیناً وہ آپ کے سفیر تو ہونے سے رہے جن سے میں ملتا رہا تھا۔ میں بڑے اعتماد سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جسے پاکستان مخالف کہا جا سکے اور ایسے لوگوں سے کسی قسم کا تعلق بجائے خود تو کوئی جرم نہیں ہے اور نہ اس سے پاکستان کی سلامتی متاثر ہوتی ہے۔

اب رہا سوال ملک کے اندر 'مخالف پاکستان' عناصر سے وابستگی کا، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مخالف پاکستان عناصر کیا ہوتے ہیں اور یہ ہیں کون؟ ان کو بالصراحت متعین کرنا مشکل تو نہیں ہونا چاہیے۔ کیا اس سے مراد پاکستانی ہیں؟ آپ وابستگی کی بات کرتے ہیں، میں نے تو کسی ایسے پاکستانی سے ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں کیا جسے پاکستان مخالف کہا جا سکے۔ آخر ایک شخص جو مسلمان ہو، جو مسلمانوں سے محبت کرتا ہو، جو بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کی سلامتی کی فکر اور تشویش میں مبتلا ہو، کیوں مشرقی پاکستان اور اس سے محبت کرنے والی مسلم آبادی کو بھارت کا حلقہ بگوش بنانا چاہے گا؟ کیا آپ مجھ پر ملک توڑ کر علیحدہ ہونے کا الزام لگا رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے غیر ملکی دورے سے پہلے اس طرح کی کوئی بات سنی بھی نہیں تھی اور پھر سنی بھی تو آپ کے منہ سے! مجھے تو معلوم بھی نہیں کہ کہیں اس طرح کی کوئی سوچ بھی پائی جاتی ہے۔ یاد رکھیے، مسلمانوں کے لیے پاکستان ایک ہے اور ناقابلِ تقسیم! دونوں بازوؤں کو اکٹھا رہنا چاہیے۔ اسی کے لیے تو ہم نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا اور اسی کی بہبود کی فکر کرتے ہوئے ہم بوڑھے ہو گئے۔ میرا ایمان ہے کہ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے کی صورت میں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ اس پر پولیس ایکشن کے ذریعے قبضہ کر کے اسے برباد کر دیا جائے گا۔ ملک توڑ کر علیحدگی کی بات کرنے والوں کے سامنے میرا یہی ردعمل ہے۔ میں ایک بار پھر زور دے کر کہتا ہوں کہ ہمیں متحد رہنا چاہیے، اس لیے کہ ہمارا تحفظ صرف مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں ہے۔

واضح رہے کہ مغربی پاکستان کو اپنی اقلیتی نمائندگی پر کوئی شکایت نہیں تھی، اس کے باوجود میں نے مشرقی پاکستان کو نمائندگی میں مساوات (Parity) کے اصول کو قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ گو کہ پچھلی تمام رپورٹوں میں مساوات پر اصرار کیا گیا تھا مگر کوئی مشرقی پاکستان کو اپنی اکثریتی نمائندگی کا حق چھوڑ کر مساوات پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ آج کے جمہوری معاشروں میں لوگ اکثریتی

نمائندگی کی تمنا کرتے ہیں اور حق خود اختیاری کا اصول اپنی تمام خرابیوں کے باوجود اکثریت کی نمائندگی پر ہی قائم ہے۔ میں بہر حال، اس خیال کا حامل ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ تعاون ملک کی بقا اور ترقی کے لیے لازمی ہے۔ اور یہ کہ مساوات کے اصول سے ہم صوبائیت کے عفریت سے جان چھڑا سکیں گے۔ اس طرح ملک کے دونوں بازوؤں میں صوبائی گروپوں کی جگہ مشترکہ سیاسی جماعتیں پروان چڑھ سکیں گی۔ جب میں وزیر قانون تھا تو میں نے اُس وقت مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تھا اور لاتعداد میٹنگوں میں لوگوں کو آمادہ کیا تھا کہ وہ مساوات کے اصول کی حمایت کریں۔ ۱۹۵۵ء میں پہلی بار دستور ساز اسمبلی اسی اصول پر منتخب ہوئی تھی۔

مجھے مشرقی پاکستان کا غدار کہا گیا۔ مجھ پر مشرقی پاکستان کو بیچنے کا الزام لگایا گیا لیکن میں نے میدان نہیں ہارا اور ایک متحدہ پاکستان کی خاطر کامیابی حاصل کی۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں ملک توڑ کر علیحدگی کی بات کرنے والوں میں شامل ہو سکتا ہوں؟ افسوس، جناب صدر، مجھے ان رکیک الزامات کے تحت قید کر کے آپ نے میری افادیت ہی ختم کر دی۔ مجھے کوئی عہدہ حاصل کرنے کی خواہش کبھی نہیں رہی، نہ میں آج کوئی عہدہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ دونوں بازوؤں کو اکٹھا رکھنے میں، میں اب بھی مدد کر سکتا ہوں، اگر کبھی موقع آیا تو میرے الفاظ ثابت کریں گے کہ دونوں بازوؤں کو اکٹھا رہنے میں ہی فائدہ ہے اور ہمیں صوبائیت سے چھٹکارا پانا چاہیے۔

جناب صدر، میں بڑے ادب سے گزارش کروں گا کہ جو کچھ میرے بدخواہ تسلسل سے الاپتے ہیں، وہ آپ کے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کے وطن کے طور پر قائم ہوا تھا اور یہی ایمان ہمیں برسرِ پیکار رکھے ہوئے تھا۔ پاکستان کے حصول کے لیے ہم نے بنگال میں، بالخصوص مغربی بنگال کے مسلمانوں نے، ہندوؤں کے ہاتھوں شدید تباہیاں برداشت کی ہیں۔ پاکستان ہمارا ملک ہے؛ کوئی پناہ گاہ نہیں! یہاں آنا ہمارا حق تھا اور ہم آ گئے۔ جی ہاں ہم اپنے ہی ملک میں آئے تھے، اُس ملک میں جس کی تخلیق میں ہمارا بھی کردار ہے۔ یہاں نیشنلٹی ایکٹ منظور ہونے کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ایک پاکستانی شہری ہندوستان میں بسا رہے۔ لہٰذا میں نے یہاں آ کر آباد ہونا طے کیا۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ذہن پر زور ڈالیں اور یاد کریں کہ میں فروری ۱۹۴۹ء تک

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا رکن تھا؛ لہٰذا میرے لیے پاکستان میں سیاسی پناہ لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے اس اعلان کے بعد کہ میں ۵ مارچ ۱۹۴۹ء تک لازماً پاکستان منتقل ہو جاؤں گا، مسلم لیگ کی ایما پر مسٹر تمیزالدین خان نے ۲۶ فروری ۱۹۴۹ء کو میری اسمبلی کی رکنیت ختم کر دی۔ قائداعظم ہوتے تو یقیناً ایسا نہیں کرتے۔ کیا آپ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے سیاسی پناہ لی تھی؟ نہیں میں نے سیاسی پناہ نہیں لی بلکہ میں مہاجر ہوں، جیسے قائداعظم مہاجر تھے اور لیاقت علی خان بھی مہاجر ہی تھے۔ اُن لاکھوں لوگوں کی طرح جو اپنے اس گھر کی طرف لوٹ آئے تھے جس کی قائداعظم نے ضمانت دی تھی۔

جنابِ صدر! آپ مجھے معاف کیجیے گا، اگر میں یہ کہوں کہ میری گرفتاری کا اصل سبب میرے بارے میں آپ کا یہی مذکورہ بالا بیان ہے تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔ آپ کو خدشہ ہے کہ میں اگر آزاد رہا تو میں اس دستور میں ضرور مداخلت کروں گا جو آپ نافذ کرنے جا رہے ہیں، ورنہ آپ کے بیان میں اس بات کا حوالہ چہ معنی دارد! میرے خلاف قدم اٹھانے سے پہلے آپ نے اپنے آپ کو تو یقین دلایا ہوتا! یہ طے ہے کہ میں اُس دستور کو خوش آمدید نہیں کہوں گا جو آپ پیش کرنے جا رہے ہیں۔ لیکن کیا یہ میری گرفتاری کے لیے کافی سبب ہے۔ اخباری خبروں کو ایک طرف رکھیں اور بتائیں کہ آپ کیا کریں گے، اگر پاکستان کے ننانوے فیصد عوام اس دستور کے بارے میں وہی محسوس کریں جو میں محسوس کرتا ہوں؟

عمومی طور پر ہم کمیونسٹوں اور اُن کے ساتھیوں کو مخالف پاکستان کہتے ہیں۔ گزشتہ تین برسوں میں اُن کے ساتھ وابستگی تو بڑی دور کی بات ہے، میں نے تو ان سے کسی قسم کا رابطہ یا تعلق تک نہیں رکھا۔ اگر آپ کا مطلب غیر ملکیوں سے ہے تو کیا اِس میں صرف سفارتی شخصیات شامل ہیں یا غیر سفارتی بھی۔ اِن کی نشاندہی کرنے میں کوئی مشکل تو نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ میں کسی ایک ایسی غیر سفارتی شخصیت کو نہیں جانتا جو مخالفِ پاکستان ہو یا اس کا تعلق اس ملک سے ہو جسے بالعموم مخالفِ پاکستان کہا جاتا ہے۔ اگر مراد ڈپلومیٹ سے ہے تو میں کسی بھی مخالف پاکستان عنصر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض سماجی تقریبات میں دوسرے پاکستانیوں کی طرح میری بھی اُن لوگوں سے کوئی ملاقات ہوئی ہو

جنہیں آپ مخالف پاکستان گردانتے ہیں لیکن اس طرح کی ملاقات کو اس طرح کی وابستگی نہیں کہا جاسکتا۔ جیسا کہ پہلی ''وجہ'' میں بتایا گیا۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میری حب الوطنی شک وشبہ سے بالاتر ہے اور اس طرح کی کوئی ملاقات اسے داغدار نہیں کرسکتی۔

میں نے بڑے دکھ کے ساتھ نوٹ کیا ہے کہ آپ نے مبینہ طور پر ڈھاکا میں میرے لیے کہا ہے کہ مجھ سے بعید نہیں کہ میں پاکستان سے مخاصمت رکھنے والوں کی مالی امداد بھی قبول کرلوں (یہ الزام ان وجوہ میں شامل نہیں ہے جو مجھے سرکاری طور پر مہیا کی گئی ہیں)۔ معاف کیجیے گا جنابِ صدر، اس گھناؤنے الزام کا آپ کے پاس کیا جواز ہے۔ پتا نہیں آپ کے سامنے کس طرح کی جھوٹی رپورٹیں پیش کی گئی ہیں جس نے آپ کو اس طرح کا بیان دینے پر آمادہ کیا۔ کسی کے خلاف اس سے زیادہ قابل مذمت بیان اور کیا دیا جاسکتا ہے؟ اور ایسے شخص کے پاس اس کی تردید کا کیا موقع ہے، سوائے اس کے کہ وہ آپ کے احساسِ عدل وانصاف کی دُہائی دے۔

ٹھیک ہے، میں ایک غریب آدمی ہوں جنابِ صدر!.... اور غریب کو سب ہی چپت لگا کر چلے جاتے ہیں.... لیکن میں اس طرح کی گندی سرگرمیوں میں الجھنے کی حماقت نہیں کرسکتا۔ میری اشک شوئی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ پاکستان اور پاکستان سے باہر آپ کے اس بیان پر کوئی یقین نہیں کرے گا، سوائے ان لوگوں کے جنہیں کسی مجبوری سے اس کو سچ ماننا پڑے۔ آپ نے پریس سے جو کچھ کہا ہے اُس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ میری گرفتاری جھوٹے الزامات پر مبنی ہے۔ حیرت ہے آپ نے پریس میں مجھ پر اتنا واضح الزام لگایا ہے جس کے ثابت ہونے یا نہ ہونے سے بہت کچھ فرق پڑتا ہے، لیکن اس کا گرفتاری کی اُن وجوہ سے کوئی تعلق نہیں ہے جو مجھے سرکاری طور پر مہیا کی گئی ہیں۔

دوسری وجہ:

میں اپنے ذاتی اثر ورسوخ اور دوستیوں کو استعمال کرکے پاکستان کے دوست ملکوں کی ہمدردیاں ختم کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ میں اتنا وسیع ذاتی اثر ورسوخ رکھتا ہوں۔ جبکہ یہ اثر ورسوخ موجودہ دورِ حکومت میں ناپید ہوچکا ہے۔ ''دوستی'' پتا نہیں آپ کس کا حوالہ دے رہے

ہیں۔ بظاہر تو یہ پاکستان کے کسی دوست ملک کے بے نام سفیر کا تذکرہ ہو سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ مجھے اپنی وزارت کے ختم ہونے کے بعد اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ گو کہ ملک کا کوئی بھی باشندہ غیر ملکی سفیر کا دوست ہو سکتا ہے اور اقتدار سے ہٹنے کے بعد بھی ان احساسات کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ مگر یہ ڈپلومیٹ حضرات اُن لوگوں سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں جو اقتدار میں ہوں؛ اقتدار سے باہر لوگوں کو یہ کم ہی گھاس ڈالتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کیا اُن میں سے کوئی یہ کہہ سکتا ہے.... ماسوائے ان کے جو آپ کی خوشامد کرنا چاہتے ہوں.... کہ میں نے کبھی ان کے سامنے پاکستان کے خلاف کوئی ایسی بات کی ہو جس سے پاکستان کے ساتھ ان کی دوستی میں کوئی فرق پڑتا ہو۔ بات کرنا تو درکنار میں نے تو کبھی پاکستان کے خلاف سوچا بھی نہیں۔ اس کے برعکس مجھے جب بھی پاکستان کے بارے میں کوئی بات کہنے کا موقع ملتا ہے۔۔ گو کہ ایسے مواقع کم آتے ہیں۔۔۔ میں ان پر ہمیشہ زور دیتا ہوں کہ وہ پاکستان کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دیں تا کہ پاکستان بیرونی امداد کا محتاج نہ رہے۔

مجھے کہنے دیجئے جناب صدر، کہ آپ نہیں جانتے، پاکستان میری زندگی ہے۔ میں نے اس کو قائم کرنے میں ایک بڑا کردار ادا کیا ہے۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں بنگال وہ واحد صوبہ تھا جس نے قائداعظم کی مسلم لیگ کو وزارت تحفہ میں پیش کی۔ بنگال قائداعظم کے ہاتھ میں ایک ایسا مہرہ تھا جس کی وجہ سے کانگریس کو ملک کی تقسیم قبول کرنا پڑی۔ مسلم لیگ کو بنگال کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے اور اہل بنگال کو پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں شامل کرنے کے لیے میں نے اپنی زندگی، صحت اور سلامتی داؤ پر لگا کر دن رات محنتِ شاقہ کی۔ میں بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کا سیکرٹری تھا جس کے کل کام کی ذمہ داری میرے کاندھوں پر آ پڑی تھی۔ مقامی رہنماؤں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے کچھ مدد ضرور ملی، اس کے باوجود دور دراز کے دیہاتوں میں مجھے مسلمانوں سے بات کرنے جانا پڑا۔ یہ طویل مسافتیں میں نے بیل گاڑیوں اور چپو سے چلنے والی کشتیوں پر طے کیں۔ وہیں رات گزار دی جہاں چھت نظر آ گئی، جو میسر آیا وہی کھالیا۔ پاکستان کے حق میں دلائل دیتے ہوئے، جذبات ابھارتے ہوئے اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے میں نے یہ جدوجہد جاری رکھی۔ میں شدید ذہنی اور جسمانی دباؤ کا شکار رہا

اور مرتے مرتے بچا۔ میں نے اپنے خلاف اپنے مخالفین کے وار برداشت کیے اور یہ سب کچھ میں نے صرف پاکستان کے لیے کیا؛ جبکہ دوسرے لوگ فارغ بیٹھے تھے۔ پھر ان موقع پرستوں نے میری بوئی ہوئی فصل کاٹی۔ بہرحال میں بنگال کو مسلم لیگ کے نظریے کی طرف مائل کرنے میں کامیاب رہا اور انہیں پاکستان کے حق میں صف آرا کر دیا۔ آپ کو نہیں معلوم جنابِ صدر، برصغیر کے حالات میں اس کا مطلب برسوں کی جدوجہد کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اپنی زندگی کے بہترین دس سال میں نے اس جدوجہد میں گزار دیے جب کہیں جا کر ۱۹۴۶ء میں فتح سامنے آئی۔ مجھ پر یہ الزام لگانا کہ میں ایسی بات کروں گا جس سے پاکستان کے دوستوں کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ختم ہو جائیں، جنابِ صدر ایک ایسا جھوٹ ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ میری تو خواہش ہے کہ یہ سارے دوست ممالک کھل کر پاکستان کا ساتھ دیں اور جب ضرورت پڑے آگے بڑھ کر ہماری مدد کریں۔

تیسری وجہ:

میں نے پچھلے تین برسوں میں پاکستان کے باہر ایسے عناصر کا کھل کر ساتھ دیا جو موجودہ دورِ حکومت کی اصلاحات کے خلاف تھے۔

یہ پھر ایک مبہم بات ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہوگئی جیسے کوئی پوچھے کہ تم نے آخری بار اپنی بیوی کی پٹائی کب کی تھی۔ اس طرح کے سوالوں کے جواب میں کچھ باتیں.... کھلی نہیں تو خفیہ ہی سہی.... فرض کر لی جاتی ہیں پھر ان مفروضہ باتوں کی تردید و تائید کا کھیل جاری رہتا ہے۔ اب وہ کون سے عناصر ہیں جو مختلف اصلاحات کی مخالفت کر رہے ہیں، یہ بات بذاتِ خود اتنی مبہم ہے اور یہ الزام اتنا بے معنی ہے کہ میں حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں۔ اصلاحات سے آپ کی مراد کہیں آپ کا اپنا لایا ہوا انقلاب تو نہیں ہے۔ یعنی موجودہ دور کی اصلاحات نہیں بلکہ موجودہ دور خود ایک اصلاح ہے۔ یہ یقیناً کوئی الزام نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو پتا ہوگا کہ آپ کے انقلاب کے بارے میں لوگوں کی مختلف آرا ہیں۔ چند دستور پسند لوگوں کا خیال ہے کہ ۱۹۵۶ء کے دستور میں حکومت کے پاس اتنے اختیارات تھے کہ یہ ساری اصلاحات بغیر دستور کو منسوخ کیے اور بغیر کسی انقلاب کے نافذ کی جا سکتی تھیں۔

میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ فوجی حکومت قائم ہوگئی.... کسی جواز کے ساتھ یا بغیر کسی جواز کے.... اور فوج کے ارباب و اختیار نے کنٹرول سنبھال لیا تو پھر ان کو، جتنے بہتر طریقے سے ممکن ہو، اپنے ملک کی خدمت کرنے کا مکمل موقع ملنا چاہیے۔ اس وقت تک جب تک کہ اللہ کے حکم سے ملک میں جمہوریت دوبارہ نہ قائم ہو جائے۔ اس بات کو جھٹلانا حماقت ہوگی کہ ملک بحیثیت مجموعی جمہوریت کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ آپ خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہیں اور آپ نے اس بات کا وعدہ بھی کیا ہے۔ میں خود بھی یہ چاہتا ہوں کہ ملک میں جمہوریت قائم ہو لیکن اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اس کوشش سے وابستہ ہوں یا نہیں۔ جمہوریت کے ساتھ میری وابستگی ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔ جس کا کھلے یا چھپے اُن عناصر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں جن کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اُن بہت ساری اصلاحات کو تسلیم نہیں کرتا جو موجودہ دورِ حکومت میں نافذ کی گئی ہیں اور جو محض اس وجہ سے قابلِ عمل ہو پائی ہیں کہ آپ نے بہت زیادہ اختیارات حاصل کیے ہوئے ہیں۔ یہ ایسی اصلاحات ہیں جو کسی جمہوری حکومت کے لیے بغیر کسی طویل جدوجہد اور کشمکش کے نافذ کرنا ممکن نہیں تھیں۔ ماسوا اس کے کہ اسے بھی اتنے وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے جو آپ نے لیے ہوئے ہیں۔

چوتھی وجہ:

مجھ پر الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مختلف شہروں میں ایسے خفیہ سیل (Cell) قائم کیے ہوئے ہیں جو موجودہ حکومت کے کارناموں اور کارکردگی کے خلاف بانیانہ پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

ایسا ہی خوب ذہن رسا پایا ہے۔ پہلی بات، اچھی طرح سمجھ لیجیے، کہ میری پرورش ایک قانونی اور دستوری روایات کے حامل ماحول میں ہوئی ہے۔ اور میں بالخصوص قائداعظم کی دستوری روایات کی پابندی کرتا ہوں۔ میں کوئی کام زیرِ زمین یا خفیہ نہیں کرتا۔ میرے پاس نہ اتنی صلاحیت ہے نہ مشینری اور نہ ہی علم یا تجربہ جو اس طرح کے سیل قائم کر سکوں۔ جب آپ نے سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی تو وہیں میری پارٹی اور دوسری سیاسی جماعتیں ختم ہو گئیں۔ یہ تسلیم ہے کہ لوگ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگانے کے بعد بھی سیاسی ذہن سے سوچنا بند نہیں

کرتے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لوگ جس پارٹی سے متعلق ہوتے ہیں اس کے بارے میں اچھے گمان بھی رکھتے ہیں۔ لیکن سیاسی جماعتوں پر پابندی کا جو حکم آپ نے نافذ کیا تھا میرے لیے وہی کافی تھا اور میری پارٹی ختم ہو چکی ہے اور اس کے تمام لیڈر اب لیڈر نہیں رہے۔ یہ انتہائی احمقانہ بات ہے کہ میں اپنی پارٹی کے لیے مختلف شہروں میں خفیہ سیل قائم کروں۔ اپنی قانونی پریکٹس کے دوران میرا کراچی (جہاں میں مستقلاً قیام پذیر ہوں) لاہور، ڈھاکا اور چٹاگانگ وغیرہ آنا جانا رہتا ہے۔ مجھے میرے موکل اور دوست اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے رہتے ہیں جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ میری خدمت کرنا چاہتے ہیں لیکن میں جانے سے منع کر دیتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ اگر میں ان کے ہاں گیا تو مجھ پر خفیہ سیل قائم کرنے کا الزام لگ جائے گا بلکہ میں صرف اس لیے نہیں جاتا کہ مجھے اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات میں سے وقت نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انہی الجھنوں سے بچنے کے لیے میں ممکنہ حد تک تعلقات کم سے کم رکھتا ہوں۔ اگر میں ان خفیہ سیلوں کو قائم کرنے میں کوئی دلچسپی رکھتا تو پھر یہ دورے اور دعوتیں، جن کے لیے میں منع کرتا رہا ہوں، اس کام کے لیے بڑے مفید ہو سکتے تھے۔

پانچویں وجہ:

اس الزام کے دو حصے ہیں۔

پہلا حصہ: مجھ پر الزام لگایا گیا ہے کہ میں اپنے ماننے والوں اور کالعدم عوامی لیگ کے کارکنوں میں موجودہ دورِ حکومت کے خلاف مستقلاً نفرت اور توہین آمیز جذبات پھیلاتا رہتا ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں آخر ایسا کیوں کروں گا۔ نفرت اور توہین تو بہت بڑے بڑے الفاظ ہیں...... اور بڑے بڑے الفاظ ہی نفرت اور توہین کے جذبات پیدا کرتے ہیں! عدالت میں اس الزام کو فوجداری دفعہ کے تحت پیش کیا گیا ہے، ظاہر ہے، اس پر کوئی فیصلہ آنے سے پہلے پورے سیاق وسباق کا بڑی احتیاط سے جائزہ لینا پڑے گا۔ مسترد شدہ بیانات کے ڈھیر سے ردی کی ٹوکری بھر چکی ہے لیکن اس الزام کے خلاف کوئی شہادت پیش نہیں کی جا سکی۔ اس لیے بھی کہ یہ الزام بجائے خود انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میرے دوست اور کالعدم عوامی لیگ کے کارکن اپنے خلاف قائم مقدمات کی وجہ سے مجھ سے اکثر ملتے رہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں

ان بے چاروں سے نفرت اور توہین انگیزی کی تبلیغ کیوں کروں گا۔ اس کا کیا موقع ہے اور اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ کیا اس طرح کے مضحکہ خیز الزام کی تردید کرنے کی واقعی ضرورت ہے؟ کیا میں اتنا گر گیا ہوں کہ اس طرح کے بے معنی معاملات میں الجھا رہوں۔ جو لوگ مجھے عدالتوں میں پیشہ وارانہ فرائض انجام دیتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ اس الزام کی تصدیق نہیں کر سکتے۔

دوسرا حصہ: میں لوگوں سے وعدہ کرتا رہتا ہوں کہ موجودہ اصلاحات سے لوگوں کے جو مفادات متاثر ہوئے ہیں، مَیں ان کا ازالہ کر دوں گا۔ خدا کے واسطے! مجھے بتلایا جائے کہ وہ کیا مفادات ہیں جو آپ کی اصلاحات سے متاثر ہوئے، مَیں ان کا ازالہ کروں گا۔ میرے خیال میں تو مغربی پاکستان کے بڑے زمینداروں کے مفاد کو ہی زک پہنچی ہے۔ جناب صدر! آپ کو پتا ہے یا نہیں کہ اسی طرح کی، بلکہ اس سے زیادہ سخت زرعی اصلاحات عوامی لیگ کے پروگرام کا نمایاں حصہ تھیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے جاگیرداروں کے خلاف مستقل اور طویل جدوجہد کے ذریعے بنگال کے مزارعین کے حقوق کو یقینی بنایا ہے اور یہ کام سب کے سامنے ہے۔ کیا آپ کے ماتحتوں میں کوئی ہے جو یہ بتائے کہ میں نے کس جاگیردار سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے نقصانات کا ازالہ کر دوں گا۔

چھٹی وجہ:

الزام یہ ہے کہ میں نے آج تک پاکستان کے تصور کو قبول نہیں کیا ہے۔

: جناب صدر آپ مجھے جانتے ہیں اور جب میں وزیراعظم تھا تو آپ نے میرے ساتھ کام بھی کیا ہے۔ کیا آپ اس طرح کی لغویات کو قبول کر لیں گے؟ میں نے پاکستان کے تصور کو پروان چڑھانے کے لیے کیا کچھ کیا ہے اور اس کے لیے کیا قربانی دی ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں اور میں ہی بتا سکتا ہوں۔ میں کہوں گا کہ دہلی میں ہونے والے مسلم لیگ کے کنونشن میں اپنی تقریر کا واحد عنوان ہی یہ تھا کہ پاکستان میری زندگی ہے۔ یہ الزام آپ کی انتظامیہ میں بیٹھے ہوئے "ملازمت کے ڈھیروں" کی عکاسی کرتا ہے جو شاید آپ کے نوٹس میں نہیں ہے۔

ساتویں وجہ:

۔۔۔وہ خارجہ پالیسی پر نامعقول تنقید کر کے، جس کی تشکیل میں آپ کا (یعنی میرا)

قائدانہ کردار رہا ہے، حکومت کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔

میں اربابِ اختیارات کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے کم از کم خارجہ پالیسی کی تشکیل میں میرا کردار تو تسلیم کیا۔ جبکہ خارجہ پالیسی تو اس حکومت کی ہوتی ہے جو اقتدار پر قابض ہو۔ وہی اس کی تشکیل کرتی ہے، وہی اس میں ترمیم کرتی ہے اور بدلتے ہوئے حالات میں وہی اس کا اطلاق کرتی ہے۔

اب جنابِ صدر مجھے اجازت دیجیے کہ میں یہ کہوں کہ آپ نے اخبارات کو میری گرفتاری کی جو وجوہات بتائی ہیں، وہ ان سے بالکل مختلف ہیں جو کاغذ کے ذریعے مجھے مہیا کی گئی ہیں۔ جو وجوہات آپ نے دی ہیں، وہی میری گرفتاری کی اصل وجوہات ہوں گی۔ رہا سوال ان وجوہات کا جو مجھے سرکاری طور پر مہیا کی گئی ہیں، ایسا لگتا ہے کہ انہیں دفتر میں بیٹھ کر گھڑا گیا ہے۔

اپنے بیان کے پہلے حصے میں آپ نے کہا ہے کہ میں ابتداً مشرقی پاکستان اور پھر پورے پاکستان میں انتشار پھیلانا چاہتا ہوں۔ ''مشرقی پاکستان میں انتشار'' سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا میں مشرقی پاکستان کو مختلف گروپوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیا آپ کے بقول میں پاکستان کے دشمنوں سے پیسہ وصول کر کے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مشرقی پاکستان میں انتشار پھیلا رہا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں بھارت سے پیسے وصول کر رہا ہوں۔ جنابِ صدر سینے پر ہاتھ رکھ کر، اس دنیا میں اور اس کے بعد کی دنیا میں اللہ کو گواہ کر کے بتائیے، اگر یہ بات سچی ہوتی تو کیا میں زندہ رہ جاتا؟ کیا آپ کو پتا ہے کہ ہندو انڈیا اور بنگال میں میری جان کے درپے تھے اور ان کے لیے مجھے قتل کرنے سے بڑھ کر کوئی اور مقدس کام نہ ہوتا۔ میرے نصیب میں شاید کسی انتہا پسند ہندو کا خنجر ہی ہوگا۔ ہندو انڈیا یا ہندو بنگال کا ساتھ دینے کا صرف تصور بھی پاکستان کے ساتھ نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا کے ساتھ غداری کے مترادف ہوگا۔ ہندوؤں سے تعلق اپنے آپ کو قربان گاہ میں پیش کرنے کے مترادف ہے۔

آپ کے خیال میں کیا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بھارت میں عسکریت پسند ہندوؤں کا عروج، مجھے بہت سے لوگوں سے زیادہ صاف دکھائی دے رہا ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے شدید خطرہ ہیں اور ان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے۔

بھارت بنگلہ دیش معاہدہ

برائے تعاون، دوستی اور امن

١٩ مارچ ١٩٧٢ء

امن، سیکولرازم، جمہوریت، سوشلزم اور قوم پرستی کے مشترکہ نظریات سے سرشار؛

قومی قربانیوں کے ذریعے پروان چڑھنے والے دوستی کے مضبوط رشتے جو آزاد، مقتدر اور خودمختار بنگلہ دیش کے منصۂ شہود پر آنے کا سبب بنے، ان نظریات کے حصول کے لیے مشترکہ جدوجہد کے حامل؛

برادرانہ اور ہمسائیگی کے تعلقات برقرار رکھنے کے لیے پرعزم، اپنی سرحدوں کو لازوال امن اور دوستی کی سرحدوں میں تبدیل کرنے کے خواہاں؛

غیر وابستگی، پرامن بقائے باہمی، باہمی تعاون، اندرونی معاملات میں عدم مداخلت، خودمختاری اور علاقائی سالمیت کے بنیادی اُصولوں سے پیوستہ؛

امن، استحکام اور سلامتی کے تحفظ کے لیے پرعزم، تمام ممکنہ ذرائع سے اپنے اپنے ملک کی ترقی کے خواہاں؛

دوستی کے موجودہ رشتوں کی توسیع اور اسے مزید استحکام بخشنے کے لیے پرعزم؛

اس بات کے قائل کہ اس دوستی اور تعاون کو مزید پروان چڑھانا دونوں ریاستوں کے علاوہ ایشیا اور دنیا میں دائمی امن کے مفاد میں ہے؛

عالمی امن اور سلامتی کو پروان چڑھانے میں اپنا حصہ ڈالنے، بین الاقوامی کشیدگی کو کم کرنے کی کوششوں میں شرکت کرنے اور نوآبادیاتی نظام، نسل پرستی اور سامراج کی باقیات کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے پرعزم؛

اس بات کے قائل کہ آج کی دنیا میں بین الاقوامی مسائل صرف تعاون سے ہی حل ہو سکتے ہیں، تصادم یا جھگڑے سے نہیں؛

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے اغراض و مقاصد کی پیروی کرنے کے لیے مستعد؛

ایک فریق عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش اور دوسرا فریق جمہوریۂ بھارت یثاق ہٰذا کی تکمیل کرتے ہوئے طے کرتے ہیں کہ:

آرٹیکل ۱:

معاہدے کے فریق دونوں ممالک، اُن نظریات سے جذبہ لے کر جن سے متاثر ہو کر دونوں ممالک کے عوام نے مشترکہ جدوجہد میں حصہ لیا اور قربانیاں دیں، سنجیدگی سے اعلان کرتے ہیں کہ دونوں ممالک اور ان کے عوام کے درمیان مستقل امن اور بھائی چارہ قائم رہے گا۔ ہر فریق دوسرے فریق کی آزادی، خودمختاری اور علاقائی سالمیت کا احترام کرے گا، اور دوسرے فریق کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے احتراز کرے گا۔

معاہدے کے فریق دونوں ممالک، دوستی کے موجودہ رشتوں، اچھی ہمسائیگی اور ہمہ جہت تعاون کو مساوات اور باہمی مفاد سمیت مذکورہ بالا اصولوں کی بنیاد پر مزید فروغ دیں گے۔

آرٹیکل ۲:

ریاستوں اور ان کے عوام کے درمیان، بلا لحاظ نسل و مذہب، اصولِ مساوات پر کامل عقیدے کے زیرِ اثر، معاہدے کے فریق دونوں ممالک نوآبادیاتی نظام اور نسل پرستی کی تمام شکلوں اور مظاہر کی مذمت کرتے ہیں اور اپنے اس عزم کی تجدید کرتے ہیں کہ وہ اس نظام کو مکمل طور پر جڑ سے ختم کر دیں گے۔

معاہدے کے فریق دونوں ممالک، ان مقاصد کے حصول کے لیے دوسری ریاستوں سے تعاون کریں گے۔ اور نوآبادیاتی نظام اور نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد میں عوام کی جائز تمناؤں کا بھرپور ساتھ دیں گے۔

آرٹیکل ۳:

معاہدے کے فریق دونوں ممالک، غیر وابستگی اور پرامن بقائے باہمی کی پالیسیوں پر اپنے

بھرپور اعتماد کا اعادہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عالمی کشیدگی کم کرنے، بین الاقوامی امن کو برقرار رکھنے اور قومی خودمختاری و آزادی کو مضبوط کرنے میں یہ پالیسیاں اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آرٹیکل ۴:

معاہدے کے فریق دونوں ممالک ایسے بڑے عالمی مسائل کی بابت .... جو دونوں ریاستوں کے مفادات کو زک پہنچانے والے ہوں .... ہر سطح پر اجلاسوں اور تبادلہ خیال کے ذریعے، ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہیں گے۔

آرٹیکل ۵:

معاہدے کے فریق دونوں ممالک باہمی مفاد میں معاشی، سائنسی اور تکنیکی میدان میں ہمہ جہت تعاون کے فروغ اور وسعت دینے کے عمل کو جاری رکھیں گے۔ دونوں ممالک تجارت، ذرائع آمد و رفت اور مواصلات کے شعبوں میں مساوات، باہمی مفاد اور پسندیدہ ترین ملک کے اصولوں کی بنیاد پر باہمی تعاون کو فروغ دیں گے۔

آرٹیکل ۶:

معاہدے کے فریق دونوں ممالک مزید اتفاق کرتے ہیں کہ وہ سیلاب کو کنٹرول کرنے، دریاؤں کے طاس اور آبی برقیاتی وسائل کے ترقیاتی امور میں مشترکہ تحقیق اور کارروائیاں کریں گے۔

آرٹیکل ۷:

معاہدے کے فریق دونوں ممالک فن، ادب، تعلیم، ثقافت، کھیل اور صحت کے شعبوں میں تعلقات کو فروغ دیں گے۔

آرٹیکل ۸:

دونوں ممالک کے درمیان پائے جانے والے دوستانہ روابط کی روشنی میں معاہدے کا ہر فریق باضابطہ اعلان کرتا ہے کہ وہ کسی ایسے فوجی اتحاد میں شامل ہوگا نہ اس کا حصہ بنے گا جو فریق ثانی کے خلاف ہو۔

آرٹیکل ۹:

معاہدے کا ہر فریق، دوسرے فریق کے خلاف ہر قسم کی جارحیت سے احتراز کرے گا اور

اپنی سرزمین پر ایسی کسی سرگرمی کی اجازت نہیں دے گا جو دوسرے فریق کو فوجی نقصان پہنچانے کا سبب بنے یا اس کی سلامتی کو خطرہ لاحق کر دے۔

آرٹیکل ۱۰:

اس معاہدے کا ہر فریق ایسے کسی تیسرے فریق کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کرے گا جو دوسرے فریق کے ساتھ مسلح تصادم میں حصہ لے رہا ہو۔

ایسے کسی موقع پر جب کسی فریق پر حملہ ہو گیا ہو یا اس پر حملے کا خطرہ ہو، معاہدے کے دونوں فریق ممالک فوری طور پر ایک دوسرے سے مشاورت شروع کر دیں گے تاکہ اس خطرے سے نمٹنے کے لیے مناسب اور مؤثر اقدامات کیے جا سکیں اور اپنے ملکوں میں امن کے قیام کو یقینی بنا سکیں۔

اس معاہدے کا ہر فریق پوری ذمہ داری سے اعلان کرتا ہے کہ وہ خفیہ یا علانیہ کسی ایک یا زیادہ ریاستوں کے ساتھ کسی ایسے معاملے میں ملوث نہیں ہو گا جو میثاق ہٰذا سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

آرٹیکل ۱۱:

اِس میثاق پر پچیس سال کی مدت کے لیے دستخط کیے گئے ہیں اور یہ معاہدے کے فریق دونوں ممالک کی باہمی رضامندی سے قابلِ تجدید ہو گا۔ دستخط ہونے کے فوراً بعد سے اس میثاق پر عملدرآمد شروع ہو جائے گا۔

آرٹیکل ۱۲:

اس معاہدے کی کسی دفعہ کی تشریح و تعبیر میں معاہدے کے فریق دونوں ممالک کے درمیان پیدا ہونے والا کوئی اختلاف پُرامن ذرائع سے باہمی احترام اور رضامندی سے دوطرفہ بنیادوں پر طے کیا جائے گا۔

مسلم قوم پرستی بمقابلہ بنگالی قوم پرستی

بنگلہ دیش کی تاریخ کی تعبیر

کتاب کا نام: ہسٹری آف بنگلہ دیش۔۱۷۰۴ء سے ۱۹۷۱ء تک (تین جلدیں)

ایڈیٹر: پروفیسر سراج الاسلام

ناشر: ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگلہ دیش، ڈھاکا

اشاعت کا سال: ۱۹۹۲ء

صفحات: ۵۹۶، ۷۹۷ اور ۸۲۰

ہر جلد کی قیمت: ایک ہزار ٹکا (۵۰/امریکی ڈالر)

زیرِ نظر کتاب کی تیاری میں کئی دانشوروں نے حصہ لیا ہے جنہیں غیر ملکی تاریخ دانوں کی مدد بھی حاصل رہی ہے۔ لیکن کئی سال کی محنت کے اس ثمر کو دیکھ کر ملال ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے ابواب میں طریقہ کار اور علمی غلطیوں کے ساتھ ساتھ حقائق کو بھی سیاسی مصلحتوں کے تحت مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے جو علمی بددیانتی ہی کہلائے گی۔

اس کتاب میں، جو پاکستان کے ٹوٹنے اور بنگلہ دیش کے قیام کا جواز پیش کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس مفروضے کو بنیاد بنایا گیا ہے کہ اس خطہ میں ہمیشہ بنگالی قوم پرستی موجود اور متحرک رہی ہے جو زبان کی بنیاد پر تھی اور یہ قوم پرستی اس علاقے میں بسنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں میں مشترک تھی۔ بنگال میں ہندو اور مسلمان الگ الگ ثقافتی شناخت کے حامل رہے ہیں، اس نظریے کو پوری کتاب میں یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے مدیر کا منصوبہ ذرا تفصیل سے بیان کرنے دیجیے۔

اس کتاب کی تیاری کی نگرانی کرنے والے دانشوروں کی کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر اے آر ملک تھے جو راجشاہی یونیورسٹی میں تاریخ کے سابق پروفیسر تھے۔ ۱۹۷۱ء میں وہ چٹا گانگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے پاکستان کے خلاف تحریک میں حصہ لینے کے لیے یونیورسٹی کے اساتذہ کا ایک وفد لے کر بھارت چلے گئے۔ بعد میں وہ نئی دہلی میں بنگلہ دیش کے ہائی کمشنر اور شیخ مجیب کی کابینہ کے رکن بھی رہے۔ کمیٹی کے دیگر ارکان میں ڈھاکا اور چٹا گانگ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر عبدالکریم، ڈھاکا یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے والے پروفیسر صلاح الدین احمد، پروفیسر صوفیہ احمد، پروفیسر کے ایم محسن، پروفیسر اے کے ایم زکریا، پروفیسر وکیل احمد اور پروفیسر سید انور حسین شامل ہیں۔ تینوں جلدوں کے مدیر ڈھاکا یونیورسٹی کے پروفیسر سراج الاسلام ہیں جن کی معاونت ڈاکٹر ہارون الرشید نے کی۔

تینوں جلدوں کا مشترکہ پیش لفظ ڈاکٹر اے آر ملک نے لکھا ہے اور بنگلہ دیش کی تاریخ کے نقطۂ آغاز کے طور پر سال ۱۷۰۴ء کو منتخب کرنے کا جواز پیش کیا ہے۔ اس کے بعد پانچ صفحات تشکر کے ہیں۔ ہر جلد میں پہلا باب پروفیسر سراج الاسلام نے لکھا ہے جس میں اس جلد کے متن کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ پہلی جلد سیاسی تاریخ، دوسری معاشی تاریخ اور تیسری ثقافتی تاریخ کے بارے میں ہے۔

ہر جلد تعارف سمیت ۲۰ر ابواب پر مشتمل ہے جو مختلف دانشوروں نے لکھے ہیں۔ پہلی جلد میں ایک بھارتی اور تین امریکی دانشوروں کے لکھے ہوئے ابواب شامل ہیں۔ دوسری جلد میں ۶ر ابواب غیر ملکیوں نے لکھے ہیں جن میں ایک برطانوی، ایک ولندیزی اور تین بھارتی شامل ہیں۔ تیسری جلد میں تین ابواب بھارتی اسکالرز کے ہیں۔

کتاب میں مضامین لکھنے والوں کی کوئی باضابطہ اور علیحدہ فہرست نہیں دی گئی ہے جس کے باعث مطالعے کے دوران آگے پیچھے اور ہر باب کے شروع میں زیریں حاشیے (Footnote) میں دیکھنا پڑتا ہے۔

کتاب کی طباعت اور جلد سازی عمدہ اور پرکشش ہے۔ کتاب کی پرکشش ہیئت دیکھ کر

جب کوئی کتاب کھولتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ مواد اس معیار کا نہیں ہے۔ قاری کو مایوسی ہوتی ہے۔ کتاب کو دیکھ کر قاری کو بنگلہ دیش میں بڑے پیمانے پر پیدا ہونے والے ایک جنگلی پھل کا خیال آتا ہے جو باہر سے انتہائی پرکشش ہوتا ہے مگر جب کھایئے تو ذائقے میں تلخی نمایاں ملتی ہے۔

اس خیال کی بہت سی وجوہات ہیں جس میں سب سے نمایاں وجہ غیر معیاری انگریزی کا استعمال ہے۔ امریکا اور برطانیہ کے دانشوروں کو چھوڑ کر، مدیر سمیت دیگر تمام مصنفین نے زبان و بیان کے استعمال میں جس آزاد خیالی بلکہ بے راہ روی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ قاری کو پریشان کر دیتا ہے۔ بنگالی پڑھنے والوں کے لیے الگ ایڈیشن چھاپا گیا ہے۔ یعنی انگریزی ایڈیشن ان کے لیے ہے جو ہیں ہی انگریزی پڑھنے والے، اور گرامر اور محاورے کی غلطیاں ان کے نازک طبائع پر کس طرح گراں گزریں گی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔

تینوں جلدوں کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ایڈیٹوریل بورڈ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ انہیں اس کتاب میں کیا پیش کرنا ہے۔ سراج الاسلام کے لکھے ہوئے تعارف اور ہر جلد کے آخری باب میں جو خلاصہ پیش کیا گیا ہے، اس میں بنگالی قوم پرستی کو حقیقت مانتے ہوئے قاری پر بعض حقائق مسلط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کبھی وہ بنگلہ دیش کو برطانوی راج سے قبل کے صوبہ بنگال کی حیثیت سے شناخت کرتے ہیں جس میں بہار اور اڑیسہ کے علاقے بھی شامل تھے اور کبھی بنگال پریزیڈنسی کی بات کرتے ہیں جس کی یہی حدود تھیں۔ اسی طرح وہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند سے قبل کے بنگال کی بات کرتے ہیں۔ کہیں مشرقی پاکستان کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور کہیں پاکستان سے علیحدگی کے بعد موجودہ بنگلہ دیش کی جغرافیائی حدود کی بات کی گئی ہے۔

مذہبی اور ثقافتی فرق کو نظر انداز کر کے بنگالی قوم پرستی کی تلاش میں سراج الاسلام اور ان کے تحت کام کرنے والے دانشوروں نے پورا بنگال کھنگال ڈالا مگر اپنے دعووں کے ثبوت میں صرف ۷۱۔۱۹۷۰ء کی شیخ مجیب الرحمٰن کی احتجاجی تحریک کو ہی پیش کر سکے ہیں۔ یہ احتجاجی تحریک یقینی طور پر تاریخی نوعیت کی تھی مگر ان کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ مغربی بنگال میں ایسی کوئی تحریک کیوں نہیں اٹھی۔ اسی طرح یہ سوال بھی اہم ہے کہ بنگالی قوم پرستی کی علامت کے طور پر ابھرنے والی ریاست بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھی بھارت کے کسی بھی

بنگالی ہندوؤں نے بھارتی یونین سے علیحدہ ہونے اور بنگالی قومی ریاست میں آباد ہونے کی خواہش کیوں ظاہر نہیں کی؟ انہوں نے اس حقیقت کو بھی تسلیم نہیں کیا کہ ۱۹۰۵ء میں مسلمانوں کا مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل الگ صوبے کے قیام کے لیے تحریک چلانا، پھر دل و جان سے پاکستان کے قیام کی تحریک میں شامل ہو جانا اور آخر میں پاکستان سے الگ ہونے کی تحریک چلانا مکمل اور قطعی طور پر مسلم قوم پرستی کا اظہار تھا۔

بنگالی قوم پرستی اور بنگلہ دیش کے قیام پر منتج ہونے والی علاقائی مسلم قوم پرستی کی بحث نے ۱۹۷۱ء سے کئی ذہنوں کو الجھن میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس نکتے سے اب سبھی متفق دکھائی دیتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں اگر مشرقی بنگال پاکستان کا حصہ نہ بنا ہوتا تو وہ آج بھارتی یونین کا حصہ ہوتا۔ کچھ لوگ بنگلہ دیش کے قیام کو بھی قرارداد لاہور کی اس تصریح کے تناظر میں دیکھتے ہیں کہ بھارت کے شمال مشرقی اور شمال مغربی حصوں میں مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ریاستیں معرض وجود میں آنی چاہئیں۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر حقیقت یہی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی بنگال کے مسلم قانون سازوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ نہ دیا ہوتا تو آج بنگلہ دیش کہلائے جانے والے علاقے پر بھارت کا تصرف ہوتا۔ کانگریس نے ایسے کسی بھی منصوبے کی سختی سے مخالفت کی تھی جس کے نتیجے میں بھارت یا پاکستان کی حدود سے باہر کوئی آزاد بنگالی ریاست معرض وجود میں آئے۔ یہ منصوبہ حسین شہید سہروردی اور ابوالہاشم نے پیش کیا تھا۔ اس منصوبے کو قائداعظم محمد علی جناح اور سرت بوس جیسے رہنماؤں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ مگر گاندھی جی اور پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس کی مخالفت کی تھی۔ ملک کا ایک حصہ ہزار میل دور ہونے کے خوف سے خواجہ ناظم الدین اور فضل الرحمٰن جیسے کٹر مسلم لیگی بھی آزاد بنگالی ریاست کے قیام کے حق میں تھے۔ اگر یہ منصوبہ روبہ عمل ہوتا تو یقیناً ایک حقیقی بنگالی ریاست معرض وجود میں آئی ہوتی۔ بنگالی ہندوؤں نے حقیقی بنگالی قوم پرستی کے جذبے کا مظاہرہ کرنے کے بجائے گاندھی جی اور نہرو کی بات سنی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود کو بھارت کا حصہ سمجھتے تھے اور زبان کی بنیاد پر مسلمانوں سے ان کا رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

ان تمام حقائق کو نظر انداز کر کے سراج الاسلام پہلی جلد کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ بنگالی

قوم پرستی کی تحریک کو ہر حال میں بنگلہ دیش کے قیام پر ہی منتج ہونا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک بنگالی قوم پرستی تحریک کا کہیں وجود ہی نہیں تھا تو سراج الاسلام نے اسے آخر کہاں سے دریافت کیا ہے؟

ہر جلد کے آخری ابواب میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ سراج الاسلام کے پیش کردہ نکات کی سراسر نفی کرتا ہے۔ اے آر ملک اور سید انور حسین نے بنگالی قوم پرستی کے سیاسی پہلو بیان کیے ہیں۔ رحمان سبحان نے معاشی پہلو کی تشریح کی ہے اور چٹا گانگ یونیورسٹی کے محمد شاہ نے ثقافتی پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ اے آر ملک اور رحمان سبحان نے بنگلہ دیش کے قیام کے لیے کی جانے والی جدوجہد کو درست ثابت کرنے کے لیے بنگالی قوم پرستی سے کہیں بڑھ کر مغربی پاکستان کی جانب سے امتیازی سلوک اور مشرقی پاکستان میں وسیع تر خود مختاری کی خواہش کو بحث کی بنیاد بنایا ہے۔ اے آر ملک نے ۱۹۴۷ء سے پہلے کی بات ہی نہیں کی۔ ان کی پوری بحث ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کی مدت پر محیط ہے۔ مگر سراج الاسلام کا دعویٰ ہے کہ بنگالی قوم پرستی ہمیشہ موجود رہی ہے۔ رحمان سبحان نے بھی خود کو پاکستان کے قیام سے ۱۹۷۱ء تک کے عہد تک محدود رکھا ہے۔ محمد شاہ نے بنگالی زبان اور ادب کے حوالے سے مشترکہ ثقافتی شناخت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنگالیوں میں ہندو قوم پرستی کے بانی تصور کیے جانے والے بنکم چندر چیٹر جی کے ناولوں میں مسلمانوں سے جس شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے، اس کا تاثر زائل کرنے میں محمد شاہ کو بہت محنت کرنا پڑی ہے۔ اُنہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر قیامِ پاکستان کے بعد کے عہد میں زبان اور ثقافت پر سیاسی اثرات کا جائزہ لینے میں عافیت محسوس کی۔ محمد شاہ نے مسلم علیحدگی پسندی کو بنگالی قوم پرستی سے الگ کرنے کے لیے اس کا رشتہ انیسویں صدی کے مسلم صوفیا سے جوڑنے کی کوشش کی ہے جنہوں نے مسلمانوں کی زندگی سے ہندوانہ اثرات زائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یوں گویا انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کبھی اپنی الگ الگ حیثیت کا احساس اور شعور تھا ہی نہیں۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صدیوں سے جاری فکری ہم آہنگی کا ذکر کیا ہے۔ اس ہم آہنگی کی انہوں نے تشریح نہیں کی۔ کیا قاری سے، تمام تضادات کے باوجود، یہ توقع کی

جاری ہے کہ وہ اس دعوے کو تسلیم کرلے کہ بنگال کے ہندو اور مسلمان صدیوں تک مشترکہ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے رہے ہیں، یکساں رسوم ادا کرتے رہے ہیں اور ایک جیسے کھانے کھاتے رہے ہیں؟ پندرہویں صدی میں مسلم حکمرانی کے خلاف چیتنیا کی بغاوت کو وہ کیا نام دیں گے؟ اسی طرح اسی پندرہویں صدی میں وہ گنیش کے اُٹھ کھڑے ہونے اور ہندوؤں کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کو کیا نام دیں گے؟

یہ بات قابلِ غور ہے کہ محمد شاہ کے رشحاتِ قلم میں جن حقائق کو مسخ کیا گیا ہے ان کا تعلق دو حقیقتوں سے ہے۔ ایک مسلم قوم پرستی ہے اور دوسری ہے مسلم علیحدگی پسندی۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک برصغیر میں کسی آزاد مسلم ریاست کا کوئی تصور نہیں ابھرا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ تصفیے کی تمام کوششیں ناکام ہو جانے پر مسلمانوں نے اپنی آزاد ریاست کے قیام کا خواب دیکھا اور اسے شرمندہ تعبیر بھی کیا۔ مگر یہ کہنا سراسر بے بنیاد اور غیر حقیقی ہوگا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنی اپنی ثقافتی شناخت کا احساس نہیں تھا۔

محمد شاہ نے حقائق کو جس انداز سے مسخ کیا ہے وہ پوری کتاب میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے تاپن رے چودھری کی کتاب ''یورپ ری کنسیڈرڈ'' کا حوالہ دیا ہے۔ یہ کتاب انیسویں صدی عیسوی میں ہندو قوم پرستی کے احیا سے متعلق ہے۔ ہندو نشاۃ ثانیہ میں بنکم چندرا، مدھوسدن، رابندرا ناتھ، بھودیو مکھوپادھیائے اور سوامی دویکانند جیسے لوگ سامنے آئے جنہوں نے ہندوؤں کی شناخت اور قوم پرستی کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے مسلمانوں کو اپنے قومی دھارے سے بالکل خارج کر دیا۔ مگر یہ سب کچھ ایسا نہیں تھا کہ مسلمان اس رجحان کے خلاف شکایت کرتے۔ ظاہر ہے کہ بنگال میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو فرق موجود تھا یہ سب کچھ اسی بنیاد پر ہو رہا تھا۔ مگر تاریخ میں موجود اس فرق کو تسلیم کرنے کا مطلب اس بنیاد کو تباہ کرنا ہے جس پر سراج الاسلام، اے آر ملک اور ان کے ساتھیوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔

اس موقع پر مدیر کے ذہن میں پائے جانے والے ایک اور گہرے خلفشار کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اے آر ملک نے بنگلہ دیش کی تاریخ کے آغاز کا تعین کرنے کے لیے ۱۷۰۴ء کا سن اس

لیے منتخب کیا ہے کہ اس سال بنگال کا دارالحکومت ڈھاکا سے مرشد آباد (کلکتہ) منتقل کیا گیا تھا۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اس سے پہلے کے معاملات پر تفصیلی بحث ۱۹۴۰ء کے عشرے میں ڈھاکا یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب "ہسٹری آف بنگال" میں موجود ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ بات ذہن نشین کرنا ہوگی کہ ۱۷۰۴ء میں موجودہ بنگلہ دیش کی جغرافیائی حدود رکھنے والا کوئی علاقہ آزاد اور خود مختار ریاست کی حیثیت سے موجود نہ تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ بنگلہ دیش اور پورے بنگال کو خلط ملط کر رہے ہیں۔ اور اگر باتوں کو دہرانے سے بچنے کے لیے کچھ حذف کیا گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ ڈھاکا یونیورسٹی کی "ہسٹری آف بنگال" کی دوسری جلد میں نواب سراج الدولہ کے زوال اور برطانوی راج کے آغاز کا ذکر موجود ہے۔ ایسے میں یہ ذکر دوبارہ کیوں چھیڑا گیا ہے؟

بنگالیوں کی معاشرتی اور معاشی زندگی پر بحث کرنے والے ابواب میں بنگال اور بنگلہ دیش کا فرق نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب مصنفین ۱۹۷۱ء کا ذکر کرتے ہیں اور پھر تعصب کی رو میں بہتے ہوئے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

اگر مصنفین کا مقصد یہ تھا کہ بنگلہ دیش کی شکل میں موجود آزاد بنگالی ریاست کی تاریخ کو شرح و بسط سے بیان کریں تو اس کے لیے نقطہ آغاز ۱۶۱۰ء ہونا چاہیے تھا جب اسلام خان نے بنگال کا دارالحکومت راج محل سے ڈھاکا منتقل کیا تھا۔ کتاب کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفین اور مدیر خود بھی سمجھ نہیں پائے کہ بنگلہ دیش کی تاریخ کو پورے بنگال کی تاریخ سے کیسے الگ کریں۔ پورے بنگال میں تو مغربی بنگال بھی شامل ہے مگر وہاں مسلم قوم پرستی نام کی کوئی چیز نہ تھی اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے مصنفین تیار نہیں۔ کتاب کے مختلف ابواب کے درمیان منطقی ربط بھی نہیں پایا جاتا۔ آر سی مجمدار اور جادو ناتھ سرکار کی کتاب "ہسٹری آف بنگال" اور مہر علی کی کتاب "ہسٹری آف دی مسلمز آف بنگال" میں سے کسی ایک کے پلان کو قبول کرنے کا آپشن تھا۔ آر سی مجمدار اور جادو ناتھ سرکار نے اپنی کتاب میں کہیں بھی نہیں لکھا کہ بنگال میں کوئی مشترکہ قوم پرستی موجود تھی۔ مصنفین اور مدیر نے جو منصوبہ منتخب کیا ہے، اسے دُرست ثابت کرنے کی دُھن میں انہوں نے ہر گام حقائق مسخ کیے ہیں۔ سراج الاسلام نے ہر

جلد کے تعارف میں اور پھر ہر جلد کے آخری باب میں جس بنگالی قوم پرستی کی بات کی ہے وہ متین الدین احمد خان اور عبدالکریم نے اپنے مضامین میں بھی بیان کی ہے۔ پہلے باب میں مغل دور اور دوسرے میں مذہبی تحاریک کا ذکر کیا گیا ہے۔ کسی میں بھی بنگالی قوم پرستی یا مشترکہ ثقافت کی آغاز کا کوئی ذکر شامل نہیں۔

''ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا'' (جلد اول) میں آر سی مجمدار نے لکھا ہے کہ انیسویں صدی میں بنگال اور مغربی بھارت میں جو قوم پرستی نمودار ہوئی وہ مزاج کے اعتبار سے خالص ہندو تھی۔ نبوگوپال نے لکھا ہے کہ بھارت میں قوم پرستی کی بنیاد ہندو دھرم پر تھی۔ انہی کے الفاظ میں کہیے تو ''ہندو قوم پرستی بنگال تک محدود نہیں۔ یہ ہندوستان بھر کے ہندوؤں پر محیط ہے۔ زبان اور جغرافیے کا فرق قوم پرستی کی راہ میں دیوار نہیں بنتا۔ ہندوؤں کو بالآخر ایک مذہبی قوم میں تبدیل ہونا ہے''۔

یہ سب کچھ بہت واضح ہے۔ کہیں بھی کوئی ابہام نہیں پایا جاتا۔ ایک ہزار سال قبل ابوریحان محمد البیرونی نے بھی برصغیر پر اپنی عالمی شہرت یافتہ تصنیف میں واضح طور پر بیان کیا تھا کہ ہندو اور مسلمان ثقافت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ کوئی بھی دانشور اب تک یہ ثابت نہیں کر سکا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافت کی سطح پر پایا جانے والا فرق غیر حقیقی ہے۔ ہندوؤں اور ہندو دھرم پر مسلمانوں اور اسلام کے اثرات کا جائزہ لینے والے تارہ چند نے بھی اس خیال کو آگے بڑھانے میں کامیابی حاصل نہیں کی کہ صدیوں کے میل جول سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ چکے ہیں کہ اب ان میں ثقافت کا فرق مٹ کر رہ گیا ہے۔ ہندو سیاست دانوں اور بالخصوص نیشنل کانگریس سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں نے اس تصور کو تمسخر کا نشانہ بنانے کی کوشش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافت کے حوالے سے ایسی خلیج حائل ہے جسے پاٹنا ممکن نہیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے ۱۹۳۵ء میں اپنی خودنوشت میں یہ لکھ کر قارئین کو حیران کر دیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انہیں واحد فرق دونوں کے برتنوں میں دکھائی دیا ہے۔ اور پھر ۱۹۴۰ء کے عشرے کے وسط میں نہرو نے اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں موجودہ بھارت کی

ثقافت کو برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی قدیم ثقافت سے مماثل قرار دیا۔

"ہسٹری آف بنگلہ دیش" کے مدیر نے جس بے عقلی سے اپنی بات کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہر صفحے پر ان کا تعاقب کرتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر رینس تھامسن کی ایک نظم "دی ہاؤنڈ آف ہیون" یاد آجاتی ہے جس میں اس نے بیان کیا تھا کہ کس طور ایک ہاؤنڈ نے اُس کا تعاقب کر کے عقیدے کے معاملے میں اسے بالآخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر ہسٹری آف بنگلہ دیش کے مدیر نے ہتھیار نہیں ڈالے کیونکہ انہوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ بنگالی مسلمانوں کی تاریخ مرتب کرتے وقت ان کے درمیان اسلام کو ایک مرکزی عامل کی حیثیت سے قبول کرنا ہی نہیں ہے۔ مگر خیر، بہت کوشش کے بعد بھی وہ اپنے بے عقلی کے سائے سے دور جانے میں کامیاب نہیں ہو پائے۔ ان کے پاس بچ نکلنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ وہ حقائق کو سرے سے ہی جھٹلا دیں یا پھر مسخ کر دیں تا کہ انہیں پہچاننا دشوار ہو جائے۔ میں اپنے آپ کو صرف دو مثالوں تک محدود رکھوں گا۔

بنگال میں معاشی معاملات درست کرنے کی پہلی بڑی کوشش انگریزوں نے ۱۷۹۳ء میں کی: پرماننٹ سیٹلمنٹ کی اسکیم متعارف کرائی گئی۔ کسی بھی دوسری چیز کے مقابلے میں مسلمانوں کے اقتدار کو راتوں رات ختم کرنے کی یہ ایک بھرپور کوشش تھی۔ قبل اس کے کہ مسلمان زمیندار کچھ سمجھتے، ان کی زمینیں ہندوؤں کے قبضے میں دے دی گئیں۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ ایک خاص تاریخ تک اپنے تمام سرکاری واجبات ادا کر دیں۔ تاریخ گزرنے پر نیلامیاں ہوئیں اور زمینیں بڑی بولی لگانے والے ہندوؤں کو دے دی گئیں۔ ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں اس کی تفصیل بیان کی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہیں سے بنگالی مسلمانوں کی معاشی اور ثقافتی پسماندگی کا دور شروع ہوا۔ اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ پرماننٹ سیٹلمنٹ سے مسلمانوں کی معاشی قوت ہندوؤں کو منتقل ہو گئی تھی تو ہمیں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہندوؤں کو اپنی الگ شناخت کا احساس ہو چکا تھا، اور وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ ہر اعتبار سے مسلمانوں سے الگ ہیں۔ مگر سراج الاسلام نے اس حقیقت کو قبول کرنے سے گریز کیا ہے۔ انہوں نے پرماننٹ سیٹلمنٹ کو صرف معاشی عامل کے طور پر دیکھا اور برتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ پرمانٹ سیٹلمنٹ کی زد میں جو زمیندار گھرانے آئے ان کے پاس وہ ساری زمین تھی جس کی آمدنی کا بڑا حصہ حکومت کو واجب الادا تھا۔ سراج الاسلام اگر یہ مان لیں کہ یہ مسلمانوں کے گھرانے تھے تو پھر ان کے مارکسسٹ نظریات کا محل زمین پر آ رہے گا۔

پرمانٹ سیٹلمنٹ سے اس نکتے کی بھی تشریح ہو جاتی ہے کہ بنگال کے مسلمان، آبادی کے اعتبار سے اچھے خاصے بلکہ برابر ہونے کے باوجود کیوں ایک سیاسی اقلیت کے طور پر برتے جاتے رہے۔ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات سے قبل تک بنگال کے بارے میں یہ بات درست تھی۔ سی آر داس کے تجویز کردہ بنگال پیکٹ کے تحت وہ صرف پارلیمنٹ اور سرکاری ملازمتوں میں برابری کا درجہ مانگ سکے۔ مگر سی آر داس کے پیروکاروں کو یہ بھی اتنا زیادہ لگا کہ جیسے ہی اس کی آنکھیں بند ہوئیں، وہ بنگال پیکٹ سے ہی مکر گئے۔

بنگال میں مشترکہ ثقافت کے فروغ کو ثابت کرنے کی سراج الاسلام اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں کے حوالے سے ایک اور مثال پیش خدمت ہے۔ چیتنیا کی چلائی ہوئی ویشنو تحریک (۱۴۸۶-۱۵۳۰ء) کے بارے میں چٹاگانگ یونیورسٹی کے [illegible] احمد نے لکھا ہے کہ اس تحریک نے پورے بنگال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ معاشرے میں غیر معمولی اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ یہ تحریک دراصل رسوم اور مذہبی تقلیدات پر برہمنوں کی اجارہ داری، ذات پات کے نظام اور مسلمانوں کے سیاسی تسلط کے خلاف تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس تحریک نے اضافی طور پر یہ سادہ سی تبلیغ بھی کی کہ محبت ہی خدا ہے۔ اگر خدا تک پہنچنا ہے تو بس محبت کو اپنائیے۔ ویشنو تحریک نے عوام اور خواص کی غیر معمولی حمایت حاصل کر لی تھی۔ اس حوالے سے "ہسٹری آف بنگلہ دیش" کی تیسری جلد کے صفحہ ۱۰۲ پر تفصیلی مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

تاریخ سے ناواقف شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ [illegible] سلاطین پندرھویں صدی میں بھی غیر ملکی تصور کیے جاتے تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین صدیوں سے حکومت کر رہے تھے اور انہوں نے خود کو مقامی رنگ میں بہت حد تک رنگ لیا تھا۔ بنگال کی تاریخ سے ناواقف شخص کو یہ تاثر بھی مل سکتا ہے کہ ویشنو تحریک نے اپنی سادگی اور اعلیٰ تصورات کی بدولت ہندوؤں اور

مسلمانوں میں یکساں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ مختصر یہ کہ ویشنو تحریک کے پھیلاؤ کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام مقامی آبادی کو زندگی کی ارفع آدرش دینے میں ناکام رہا تھا جس کی انہیں صدیوں سے تلاش تھی۔

جبکہ ڈھاکا یونیورسٹی کے تحت شائع ہونے والی ''ہسٹری آف بنگال'' میں جادو ناتھ سرکار نے اس کے بالکل برعکس لکھا ہے۔ اسی طرح مہر علی نے بھی تسلیم کیا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے پیدا کیے ہوئے ماحول ہی سے ویشنو تحریک کو قوت ملی۔ وہ لکھتے ہیں ''ہندو معاشرے پر اسلامی تعلیمات کی چھاپ خاصی گہری تھی۔ ان اثرات ہی کے تحت ہندو دھرم میں چند ایک اصلاحات کی راہ ہموار ہوئی۔ ان میں ویشنو تحریک سب سے نمایاں تھی۔ یہ تحریک چیتنیا نے سولھویں صدی عیسوی کے ابتدائی برسوں میں شروع کی۔ اس تحریک پر صوفی ازم کا اثر نمایاں تھا۔''

اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ''ہسٹری آف بنگلہ دیش'' میں کس طرح حقیقت کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ ''بنگلہ دیش'' کی اصطلاح سے کیا مراد ہے۔ کبھی تو یہ اصطلاح قیام پاکستان سے پہلے کے بنگال کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور کبھی یہ موجودہ بنگلہ دیش کی جغرافیائی حدود کو بیان کرنے تک محدود رہتی ہے۔ مگر خیر، وہ بات نظر انداز بھی کر گزریں، کتاب کے آخری ابواب میں بنگال کی نام نہاد خوش حالی کا پول کھل ہی جاتا ہے۔ لندن یونیورسٹی کے پی جے مارشل کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت معاشی حالات کے بارے میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بنگال میں دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی تھیں۔ اکبر علی خان کا ''سنہرے بنگال'' کا نظریہ محض واہمے سے بڑھ کر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ رحمٰن سبحان نے بنگال (یعنی موجودہ بنگلہ دیش) کے متواتر استحصال کا رونا رویا ہے۔

بنگالی قوم پرستی کے اظہار کے طور پر بنگلہ دیش کے قیام کو درست ثابت کرنے کے لیے لکھی جانے والی یہ کتاب اپنے مقصد کی تکمیل میں ناکام رہی ہے۔

جس بنگالی قوم پرستی کی بات کی جا رہی ہے، وہ دراصل مسلم اور ہندو قوم پرستی سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں۔ اور قوم پرستی کے یہ دونوں پہلو بنگال کی جغرافیائی حدود میں ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ یہ ہندو قوم پرستی ہی تھی جس کے باعث بنگال کے مسلمانوں نے ۱۹۰۵ء میں

مشرقی بنگال اور آسام کو الگ صوبے کا درجہ دیے جانے کا خیر مقدم کیا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ایسا کرنے سے ہندو زمینداروں کی زیادتی سے بچنا ممکن ہو جائے گا۔ اور ۱۹۴۰ء کے عشرے میں یہی عموی جذبات پاکستان کے قیام کی تحریک میں تبدیل ہوئے۔ مصنفین اور ایڈیٹر نے ۱۹۷۰ء کے عشرے میں علیحدگی پسند جذبات کو بنگالی قوم پرستی سے تعبیر کیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض علاقائیت تھی (جو برصغیر کے دیگر علاقوں میں بھی پائی جاتی ہے)۔ غیر منقسم ہندوستان میں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے اور مختلف زبانیں بولنے والے مسلمان ہمیشہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ہندوؤں سے الگ، ایک جدا قوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ مسلم گروپوں میں زبان کا ویسا ہی اختلاف تھا جیسا عرب اور شام کے مسلمانوں میں یا مراکش اور مصر کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب ایک ہی زبان یعنی عربی بولتے ہیں مگر پھر بھی ان کے درمیان نسل اور ثقافت کا فرق پایا جاتا ہے۔ علاقائیت کے فرق کو ہندو یا بنگالی قوم پرستی ختم نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان پائے جانے والے جغرافیائی فاصلے کا بھی پاکستان کے دشمنوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ملک کو دولخت کر کے ہی دم لیا۔

آج بھارت میں بھی اسی نوعیت کی علاقائیت موجود ہے۔ ناگالینڈ اور جنوبی بھارت میں بھی علاقائی سوچ متحرک ہے۔ لیکن علاقائیت پر مبنی سوچ کے باوجود بھارت کا پاکستان جیسا حشر نہیں ہوا۔ اس کا ایک سبب تو مضبوط مرکز ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ تمام علاقے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ تاہم یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بھارتی یونین کی آبادی کے لحاظ سے ترتیب، اس کی نسلوں اور زبانوں کا تنوع پاکستان سے بہت مختلف نہیں ہے اور ایسا بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے بھی تھا۔ آج بھی جنوبی بھارت کے ہندو خود کو شمالی بھارت کے ہندوؤں سے وابستہ محسوس کرتے ہیں اور اس کی وجہ دونوں کی ہندوازم سے یکساں وفاداری ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کبھی مشرقی پاکستان کے مسلمان خود کو پنجاب اور سندھ کے مسلمانوں سے نظریاتی اور مذہبی طور پر جڑا ہوا محسوس کرتے تھے۔

بنگلہ دیش کے قیام کے فوراً بعد اقتدار میں آنے والوں نے مشترکہ بنگالی قوم پرستی کو فروغ دینے کی کوشش کی مگر مسلمانوں نے اس کے حق میں کسی جوش و جذبہ کا اظہار نہیں کیا۔ اسی وجہ

سے بھارتی صحافی بسنت چیٹر جی نے ۱۹۷۲ء میں بنگلہ دیش کا دورہ کیا اور اس حقیقت کو محسوس کرنے کے بعد اپنی کتاب ''انسائڈ بنگلہ دیش'' میں لکھا کہ بنگلہ دیش میں بسنے والے مسلمانوں کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ خود کو بنگالی قرار دیں! انہوں نے یہ بھی لکھا کہ بنگالی قوم پرستی اور بنگالی زبان کو پاکستان سے علیحدگی کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا اور بنگالی زبان اور بنگالی قوم پرستی کی افادیت بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھی۔

بسنت چیٹر جی نے یہاں تک لکھا کہ مسلمانوں نے بنگالی ثقافت کے فروغ میں کوئی کردار ادا نہیں کیا اور یہ ثقافت ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے کی میراث ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ محض بنگالی قوم پرستی کے نام پر بنگلہ دیش کا وجود ناممکن ہو جائے گا اور اس نئے ملک کو ثقافتی اور سیاسی میدان میں بھارت کے واضح اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے اردو کو قومی زبان کی حیثیت میں اپنانا پڑ جائے گا۔

۱۹۷۵ء میں جب جنرل ضیاء الرحمٰن اقتدار میں آئے تو انہوں نے بنگلہ دیش کی نظریاتی بنیادوں میں پائے جانے والے تضاد کو محسوس کیا اور بنگالی قوم پرستی کے مقابلے میں بنگلہ دیشی قوم پرستی تجویز کی۔

جنرل ضیاء نے جس بنگلہ دیشی قوم پرستی کو فروغ دیا اس کا تعلق ملک میں آباد ۸۵ فیصد سے زائد مسلمانوں کی جداگانہ شناخت سے تھا۔ یہ انتظام ملک کے سیکولر عناصر کے لیے بھی قابل قبول تھا کیونکہ اس میں قوم پرستی کی بنیاد پر ملک کی اکثریت سے جوڑا گیا تھا۔ یہ ایسا ہی معاملہ ہے جیسا کہ فرانسیسی قوم پرستی دراصل فرانس کی اکثریتی آبادی کا معاملہ ہے، فرانس میں آباد الجزائری مسلمان فرانسیسی قوم کا حصہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ آج بھی فرانس میں قوم پرستی کے جذبات ان ہی لوگوں کی یاد دلاتے ہیں جن کا تعلق کیتھولک چرچ سے تھا۔ اس اعتبار سے فرانس کی قوم پرستی بھی مذہبی نوعیت ہی کی ہے۔

جنرل ضیاء نے جو ماڈل اپنایا اس نے بنگلہ دیش میں کسی حد تک نظریاتی استحکام پیدا کیا اور بنگلہ دیشی مسلمانوں نے ثقافت اور فنون لطیفہ کے حوالے سے اپنا رشتہ امت مسلمہ سے جوڑ لیا۔ مگر ''دی آف بنگلہ دیش'' کے مصنفین سے یہ بات ہضم نہیں ہوسکی۔ قارئین کے لیے یہ

بات خاصی حیرت انگیز ہے کہ کتاب میں کہیں بھی بنگلہ دیشی قوم پرستی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس سے ان کی بدنیتی کا خوب اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''دی ہسٹری آف بنگلہ دیش'' اس لیے بھی اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکی کہ اس میں بار بار موقف تبدیل کیا گیا ہے اور خود مصنفین اور ایڈیٹر یہ تعین نہیں کر پائے ہیں کہ بنگال کی تاریخ کو کب سے اور کس خطے سے بیان کریں۔ پوری کتاب میں فکر کی یکسوئی کا شدید فقدان پایا جاتا ہے۔ تیرہویں صدی سے اب تک مشرقی بنگال میں اسلام ہی سیاست، ثقافت اور معاشرت کی سب سے بڑی بنیاد رہا ہے۔

سراج الاسلام اور اے آر ملک نے جو کچھ بیان کرنا چاہا ہے، اس کی بہتر منصوبہ بندی بھی نہیں کی گئی۔ معاشی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ بیان کرنے میں مصنفین نے خاصے متضاد خیالات اور نظریات کا اظہار کیا ہے۔ ایک طرف تو وہ مشترکہ بنگالی قوم پرستی کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف ہندو اور مسلم ثقافت کے فرق کو بھی بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کتاب کا انتساب فضل الرحمٰن کے نام ہے جو بنگال میں مسلم لیگ کی تحریک کے مرکزی کرداروں میں سے تھے۔ اس ایک حقیقت ہی سے پورے تضاد کا بھرپور اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فضل الرحمٰن پاکستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے اور قائداعظم سے وفاداری یا دو قومی نظریے کی حمایت کے معاملے میں ان کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ سراج الاسلام نے اپنے نظریات کو فضل الرحمٰن سے منسوب کر کے ان کی روح کو تڑپا دیا ہوگا۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ کتاب کی مکمل لاگت سہیل رحمٰن اور سلمان رحمٰن نے ادا کی، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید وہ اپنے والد کے نظریات کو ترک کر چکے ہیں۔ نظریات کی یہ تبدیلی بنگلہ دیش میں نفسیاتی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلی کا بھی پتا دیتی ہے۔

Ref: The Muslim World Book Review, vol 14, no. 2, Winter, 1994 (The Islamic Foundation and the International Institute of Islamic Thought, Leicester, U.K.)

بنگلہ دیش اور پاکستان....حال اور مستقبل

دسمبر ۱۹۹۴ء میں ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے بنگلہ دیش کے قیام کو ۲۳ سال مکمل ہو جائیں گے مگر اب تک ذہنوں میں ۱۹۷۱ء کی خانہ جنگی کی یادیں تازہ ہیں جو اس کی پاکستان سے علیحدگی کا سبب بنی اور جو بنگلہ دیش اور پاکستان کے تعلقات میں بہتری کے امکانات پر اپنا منحوس سایا ڈالے ہوئے ہے۔ اس وقت (۱۹۹۴ء) بنگلہ دیش کی عمر جتنی ہے، اُتنی ہی مدت تک وہ پاکستان کا حصہ رہا ہے۔

باوجود اس کے کہ بیس سال گزر چکے ہیں؛ دونوں ممالک کے درمیان کچھ نہ کچھ تجارتی روابط بھی بحال ہو چکے ہیں اور سرکاری اہلکاروں کی رسمی اور غیر رسمی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری ہے، تاہم کوئی بھی صدقِ دل سے یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان شک و شبے سے بالاتر مستحکم تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔

پاکستان نے بنگلہ دیش کو ۱۹۷۴ء میں ...اس کی علیحدگی کے تین سال بعد ...تسلیم کیا۔ اس کے بعد دونوں ممالک کو سنگین سیاسی حقائق اور اُن سے وابستہ مشکلات کے پیشِ نظر اپنے ماضی کو بھول کر مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔

اگر ایک طرف بنگلہ دیش میں غرض کے مارے ایسے مذموم عناصر موجود ہیں جو، بھارت کی مدد سے کسی بھی قیمت پر دونوں اسلامی ممالک کو ایک دوسرے کے قریب آنے نہیں دینا چاہتے تو دوسری طرف پاکستان میں بھی ایسے عناصر کی کمی نہیں جو بنگلہ دیش کے لیے سیاسی اور سفارتی سطح پر کسی بھی قسم کی معاونت کی کوششوں کو ایک کارِ لاحاصل سمجھتے ہیں۔

مصالحت کی راہ میں حائل بڑی رکاوٹیں:

پاکستان کی بحالی

آبادی میں تیز رفتار اضافے کے باوجود پاکستان نے دو عشروں کے دوران معاشی میدان میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ یہ معاشی استحکام پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات کو بہتر بنانے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کی فی کس آمدنی (۴۲۰ ڈالر سالانہ) بھارت (۳۵۰ ڈالر) اور بنگلہ دیش (۲۰۰ ڈالر) سے زائد ہے۔ پاکستان کے بارے میں یہ افواہ بھی گرم ہے کہ اس کے پاس ایٹم بم ہے۔ وسط ایشیا کی سابق سوویت ریاستوں سے بہتر تعلقات استوار کر کے پاکستان معاشی استحکام کی راہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ پاکستان مستحکم معیشت اور تابناک سیاسی مستقبل کے لیے مغربی سرحدوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پاکستان کی نوکر شاہی اور عسکری قیادت کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ بنگلہ دیش کو اتحادی ملک کے روپ میں دیکھنے کی سوچ کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

عوامی لیگ کے مذموم مقاصد

عوامی لیگ کے رہنما اب اس بات کا اعتراف کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتے کہ انہوں نے پاکستان کے خلاف اس کے قیام کی ابتدا ت ہی سازشیں شروع کر دی تھیں اور ہر مسئلے کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ عوامی لیگ کے یہ رہنما اب بنگلہ دیش میں حکمراں طبقے کا بنیادی حصہ ہیں اور کسی صورت نہیں چاہیں گے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات بہتر ہوں اور جو کچھ انہوں نے ۱۶ ردسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد لوٹا یا ناجائز طور پر ہڑپا تھا، اُس سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

پاکستان کے خلاف کام کرنے والے طالب علم رہنماؤں سمیت شیخ مجیب الرحمٰن کا ہر ساتھی اب ارب پتی بن چکا ہے۔ جن لوگوں کی کوئی ملازمت نہیں تھی، آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا اور گزارے کے لیے پارٹی فنڈز پر انحصار کرتے تھے، وہ پاکستان سے علیحدگی کے بعد کارخانوں اور بینکوں کے مالک بن کر اُبھرے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے قلاش نوجوانوں نے بیرون ملک بینکوں میں اکاؤنٹس کھلوائے ہیں، برطانیہ اور امریکا میں املاک خریدی ہیں اور ڈھاکا و دیگر بنگلہ دیشی شہروں کے بہترین رہائشی علاقوں میں پُرتعیش مکانات خریدے ہیں۔ ۱۹۷۰ء

میں عوامی لیگ کا ساتھ دینے والے سابق پاکستانی فوجی افسران بھی اب مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو سابق فوجی افسران اس وقت بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کی کابینہ کا حصہ ہیں، وہ سب سے نمایاں پوزیشن میں ہیں اور دولت کے معاملے میں بھی ان کا ثانی کوئی نہیں۔

پاکستان سے علیحدگی کی تحریک میں اہم کردار ادا کرنے والے یونیورسٹی اساتذہ اور وکلا نے بھی خوب جیبیں بھری ہیں۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد انہوں نے وسائل کی لوٹ مار میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے بھی بہت کچھ پس انداز کر لیا ہے۔

پاکستان کے خلاف لڑنے والوں کو نوازنے کے لیے شیخ مجیب الرحمٰن نے اہل اور نااہل ہر طرح کے لوگوں کے لیے سول سروس کے دروازے کھول دیے۔ اس نکتے کو یکسر فراموش کر دیا گیا کہ اُن میں سول سروس کا حصہ بننے کی اہلیت ہے بھی یا نہیں۔ جامعات کا بھی یہی حشر ہوا۔ معمولی تعلیمی قابلیت رکھنے والوں کو ڈھاکا، راجشاہی، چاٹگام اور جہانگیر نگر کی جامعات میں اساتذہ کی حیثیت سے بھرتی کیا گیا۔ عام حالات میں یہ نااہل لوگ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہونے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آئین میں ترمیم کر کے مدت ملازمت (سینیارٹی) کی بنیاد پر ترقی کا اُصول اپنایا گیا، خواہ تعلیمی قابلیت یا کارکردگی کچھ ہو۔ آج ڈھاکا، راجشاہی، چاٹگام اور جہانگیر نگر کی جامعات میں وہ لوگ پروفیسر اور اسسٹنٹ پروفیسر کے منصب پر فائز ہیں جو نصاب سے اسلامی تعلیمات کو نکالنے پر خاص توجہ دیتے ہیں اور عوامی لیگ کی جانب سے شروع کی جانے والی ہر مہم کا، ممکنہ مضمرات کی پروا کیے بغیر، بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔

عوامی لیگ کا ساتھ دینے والے طبقے ہی کے لوگوں نے میڈیا پر بھی قبضہ کر رکھا ہے۔ بنگلہ دیشی اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن سے اب بھی، کسی نہ کسی شکل میں، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے عشرے کا پاکستان مخالف پروپیگنڈا جاری رہتا ہے۔ پاکستان کے خلاف پھیلائی جانے والی بے بنیاد باتوں پر لوگ آنکھ بند کر کے یقین کرتے اور حلق سے اتار لیتے ہیں۔ کوئی ان ''حقائق'' کو چیلنج کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ یہ طبقہ سیاسی، معاشی اور علمی سطح پر کتنا ہی طاقتور ہو، عوام خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پاکستان سے الگ ہونے کا کیسا بھیانک نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ لوگوں کو اندازہ ہو چکا ہے کہ بھارت جتنی خودمختاری دینا چاہے، اُس سے بڑھ کر آزادی کا

وہ تصور نہیں کر سکتے۔ تمام بڑی فیکٹریاں اور پلانٹس بند ہو چکے ہیں۔ بازار بھارتی اشیا سے بھرے پڑے ہیں اور معیشت بھارت پر منحصر ہے۔ میڈیا اور علمی سطح پر یہ پیغام کسی نہ کسی شکل میں روزانہ ذہنوں میں انڈیلا جاتا ہے کہ بنگلہ دیش اور بھارت کی ثقافت میں کوئی فرق نہیں اور اس حقیقت کو جس قدر جلد سمجھ لیا جائے اُتنا ہی اچھا ہے۔

بنگلہ دیش کی جو نئی نسل اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں پڑھ رہی ہے، اُس کے ذہن میں یہ بات اُنڈیلی جا چکی ہے کہ پاکستان ایک بھیانک خواب تھا۔ جن لوگوں نے آخری دم تک پاکستان کا ساتھ دیا اور ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء کے دوران شیخ مجیب کے بے رحمانہ کریک ڈاؤن سے کسی نہ کسی طور بچ گئے، انہیں معاشرے میں اچھوت کا سا درجہ دے دیا گیا ہے جن پر وطن کے معاملات میں بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ میجر جلیل نے ۱۹۷۱ء میں عوامی لیگ کا ساتھ دیا مگر جب اُس نے خود دیکھا کہ پاکستان کا تقریباً تمام فوجی ساز و سامان ٹرکوں میں لاد کر بھارت بھیجا گیا تو اُس نے صدائے احتجاج بلند کی مگر ایسا کرنا اُس کا جرم ہو گیا۔ بھارتی سازش بے نقاب کرنے کی پاداش میں اُسے غدار قرار دیا گیا۔ آزادی کے حقیقی سپاہیوں کی فہرست سے میجر جلیل کا نام خارج کر دیا گیا ہے۔

سابق مسلم لیگیوں کی بدلتی وفاداری

انتہائی دُکھ کی بات یہ ہے کہ مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ جان بچانے کی خاطر یا پھر لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر عوامی لیگ کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے ۱۹۷۱ء کے واقعات کو پاکستان کے مظالم کے جواب میں جائز ردِ عمل قرار دیتے ہوئے قبولیت کی سند عطا کر دی اور حکمراں جماعت سے قریب ہو کر فوائد بٹورے۔ ان میں قائد اعظم کے تحت بننے والی پہلی کابینہ کے رکن فضل الرحمٰن کے بیٹے اور قومی اسمبلی کے اسپیکر فضل القادر چوہدری اور عبدالجبار بھی شامل ہیں۔

دو قومی نظریے پر غیر متزلزل یقین رکھنے اور ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے موقف کو بیان کرنے کے لیے امریکا اور برطانیہ جانے پر رضامندی ظاہر کرنے والے ڈھاکا یونیورسٹی کے دو پروفیسر کو ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء تک جیل میں رہنا پڑا۔ ان میں سے ایک نے بعد میں اسلامک فاؤنڈیشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا قیام اعلیٰ طبقے کی سازش کا نتیجہ تھا اور اس

سازش کا بنیادی مقصد بنگالی بولنے والے مسلمانوں اور اُن کی زبان کو ختم کرنا تھا۔ اُنہوں نے بنگلہ دیش کے قیام کو جابر قوتوں سے آزادی اور نجات سے تعبیر کیا۔ یہ پروفیسر بھی ان اہل علم میں سے ہیں جنہوں نے ابن الوقت ہونے کا مظاہرہ کیا اور نئی اسٹیبلشمنٹ کی آنکھ کا تارا بننے کے لیے تمام اُصول، تمام آدرش مٹی میں ملا دیے۔

ان تمام باتوں کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نصف صدی کی تاریخ دوبارہ ترتیب دینے کے لیے پہلے ہمیں سفید جھوٹ، نصف سچ، قیاس آرائیوں اور شکوک و شبہات سے بھرے ہوئے واقعات اور حقائق کا جائزہ لینا ہوگا۔ بنگلہ دیش میں ۱۹۷۱ء کے المیے کا از سرِ نو جائزہ لینے کی تجویز پیش کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ کیا کوئی شخص، جو ہوش و حواس میں ہو، اُس ''دشمن'' سے مفاہمت اور مصالحت کی تجویز پیش کر سکتا ہے جس نے ہماری قوم پر انتہائی شرمناک مظالم ڈھائے ہوں اور ناانصافیاں روا رکھی ہوں؟

پاکستان کے خلاف الزامات

بنگلہ دیش اور پاکستان کے تعلقات کا بہتر مستقبل تلاش کرنے کی بحث کو آگے بڑھانے سے قبل پاکستان پر عائد کیے جانے والے چند سنگین الزامات کا جائزہ لینا ضروری ہے:

۱ پاکستان پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ اس کی فوج نے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء سے ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء تک سابق مشرقی پاکستان میں ۳۰ لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا اور ۳ لاکھ خواتین کی آبروریزی کی۔ یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ فوج نے بہت سے بنگالیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل تشدد کا نشانہ بنایا۔ پاکستانی فوجیوں پر پورے کے پورے گاؤں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔

۲ پاکستان پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کے لیے مارچ ۱۹۷۱ء میں شروع کیا جانے والا ملٹری ایکشن شدید حیرت کا باعث تھا کیوں کہ وہ اول تو پاکستان کو بچانے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے!

۳ پاکستان پر یہ الزام بھی ہے کہ ۲۴ برسوں کے دوران سابق مشرقی پاکستان کو سیاسی، انتظامی اور عسکری اعتبار سے اس کا حصہ نہیں دیا گیا اور یہ کہ اس عرصے میں مشرقی پاکستان، مغربی

پاکستان کے لیے ایک نو آبادی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جس کا جی بھر کے استحصال کیا گیا۔

۴۔ پاکستان پر یہ الزام بھی ہے کہ مشرقی پاکستان کی ترقی کو، جب دارالحکومت کراچی میں تھا تب بھی اور جب اسلام آباد کو دارالحکومت بنایا گیا تب بھی، جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا تا کہ وہ معاشی طور پر مستحکم نہ ہو سکے۔

۵۔ یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کو آبادی کے تناسب سے سول سروس اور فوج میں مناسب حصہ نہیں دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں وفاق کے تمام یونٹوں کے درمیان مساوات کے اصول کو بھی مشرقی پاکستان کے لوگوں نے محض ایک فریب سے تعبیر کیا۔

الزامات کا کوئی جواب نہ دینے کا سبب

گو کہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ یہ الزامات بے بنیاد ہیں اور حقائق کو خطرناک حد تک مسخ کیا گیا ہے تاہم یہ بات بھی کم افسوسناک نہیں کہ گزشتہ بیس برسوں میں پاکستان نے ان تمام الزامات کا منہ توڑ جواب دینے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ شاید پاکستان کے حکمراں طبقے کی نظر میں ایک المناک سانحے کی راکھ کریدنا کوئی پسندیدہ فعل نہ ہو اور اس کے نتیجے میں فائدے کے بجائے نقصان کا خدشہ ہو۔ جو لوگ نئی ابتدا کرنا چاہتے تھے، وہ بھی اب اس بات میں خوش ہیں کہ ماضی کو دفن ہی رہنے دیا جائے، گڑے مُردے نہ اُکھاڑے جائیں۔ جو پاکستانی اس وقت عمر کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ہیں وہ سقوطِ ڈھاکا کے وقت اس قدر کم عمر تھے کہ حالات و واقعات کی نوعیت کا انھیں درست اندازہ نہیں اور بنگلہ دیشی و بھارتی میڈیا سے جو بھی پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، اُسے تسلیم کر کے اپنے دلوں میں احساس جرم کو پالتے رہتے ہیں۔ اُن کے ذہنوں میں یہ بات اُنڈیلی گئی ہے کہ اگر پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات کو بہتر بنانا ہے تو ناگزیر ہے کہ پاکستان ۱۹۷۱ء میں ڈھائے جانے والے مظالم کا ہرجانہ ادا کرے، یا پھر کم از کم رسمی طور پر ویسی ہی معافی مانگے جیسی جاپان نے کوریا، چین اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں اپنی فوج کے مظالم پر مانگی تھی۔ مگر یہ دونوں معاملات تو بہت مختلف ہیں اور ان کی آپس میں کوئی مماثلت نہیں۔ جاپان پر جو الزامات عائد کیے گئے تھے، انھیں ثابت کر کے جاپان کا مواخذہ کیا گیا تھا اور اس کے حکمرانوں نے جو معافی

مانگی وہ ایک نئی ابتدا اور آئندہ ناخوش گوار واقعات کی روک تھام کے لیے ضروری تھی۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک جو کچھ ہوا، اگر اس کی تمام ذمہ داری یک طرفہ طور پر پاکستان پر ڈالی جائے تو یہ حقیقت کو جھٹلانے اور بدگمانیوں کو طول دینے کے مترادف ہوگا۔ شاید یہی سبب ہے کہ پاکستان قدیم تنازعات کو دوبارہ زیر بحث لانے سے گریزاں ہے۔

فی الحقیقت داؤ پر کیا لگا ہے؟

جس بات پر ہم زور دینا چاہتے ہیں، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ بنگلہ دیش اور پاکستان اپنے معاملات اور تعلقات میں گرم جوشی کیسے پیدا کریں۔ ہمارا بنیادی مقصد بھارت سمیت پورے برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل پر بحث کرنا ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ اس خطے کے مسلمان ایسی حالت میں ترقی کی راہ پر کیسے گامزن ہو سکتے ہیں جہاں بھارت کی شکل میں ایک واضح اور برتر ہندو ملک استعماری ارادوں کے ساتھ انتقام لینا چاہتا ہو اور دوسری طرف پاکستان پر عائد کیے جانے والے الزامات ابھی تک ثابت بھی نہ ہو پائے ہوں؟

بھارت مسلمانوں سے انتقام لینا چاہتا ہے مگر اُس کی یہ بھوک ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو دولخت کرنے سے ختم نہیں ہوئی۔ ۱۹۹۲ء میں ایودھیا میں بابری مسجد کی شہادت ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھارت نے سنگین مظالم ڈھائے ہیں اور پاکستان و بنگلہ دیش کے ساتھ ساتھ غیر مسلم پڑوسیوں نیپال اور سری لنکا پر بھی بالادستی قائم کرنے کی جو کوششیں کی ہیں، اُن سے پاکستان کے اُن لوگوں کو سبق سیکھنا چاہیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ۱۹۷۱ء کے سانحے کو بھول جانے ہی میں تعلقات کی بہتری کا راز مضمر ہے۔

معذرت خواہانہ رویے کے حامل پاکستانی

ہم نے پاکستان پر عائد کیے جانے والے جن پانچ بڑے الزامات کا جائزہ لیا ہے وہ بنگلہ دیش اور بھارت کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے وقتاً فوقتاً دہرائے جاتے ہیں اور پاکستان میں بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے والے بعض اصحاب بھی ان سے شدید متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں شائع ہونے والی عمر نعمان کی کتاب ''پاکستان: پولیٹکل اینڈ اکنامک ہسٹری سن ۱۹۴۷ء'' اس کی ایک واضح مثال ہے۔ اس کتاب میں اُنہوں نے ۱۹۷۱ء کے سانحے کا

تجزیہ کیا ہے جس میں عوامی لیگ کے کرتوتوں کو جائز قرار دیتے ہوئے بظاہر کلین چٹ دے دی گئی ہے۔ انہیں یہ لکھنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی کہ جن لاکھوں بنگالیوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی مخالفت کی، وہ یحییٰ خان کے تو پچی تھے اور ایسے خود غرض عناصر تھے جنہوں نے ذاتی مفادات کے لیے بنگالی مسلمانوں کے سیاسی عزائم کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی!

پاکستان کی سفارتی ساکھ کو پہنچنے والا نقصان

یہ صحیح ہے کہ پاکستان نے ایک بازو گنوانے کے بعد خود کو بہت تیزی سے بحال کیا اور معاشی میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر لیں مگر اسے یہ بات محسوس کرنی چاہیے کہ سفارت کاری کے حوالے سے اب بھی اس کے چہرے پر ۱۹۷۱ء کے سانحے کے داغ موجود ہیں۔ پاکستان کی طرف سے مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر بھارتی مظالم کے خلاف ۱۹۹۴ء میں جنیوا میں قرارداد پر ایران سمیت کئی مسلم ممالک کی حمایت حاصل کرنے میں ناکامی اور پھر قرارداد کی واپسی دُور رس سفارتی اثرات کی حامل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں جو کچھ ہوا وہ ایک سائے کی طرح پاکستان پر چھایا رہے گا اور اس کا فائدہ اُس کے کٹر دشمن بھارت کو پہنچتا رہے گا۔ چین نے ہر مشکل گھڑی میں پاکستان کا ساتھ دیا ہے مگر اب کشمیر کے ایشو پر اُس نے بھی اپنے موقف میں تبدیلی کر لی ہے۔ پاکستان نے ہمیشہ عربوں کا ساتھ دیا ہے اور بھارت نے اسرائیل کے وجود کو برحق قرار دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا مگر اس کے باوجود کشمیر کے معاملے پر فلسطینی لیڈر یاسر عرفات نے ہمیشہ بھارت کا کھل کر ساتھ دیا ہے۔ یہ موقف ۱۹۹۳ء کے اسرائیل پی ایل او معاہدے سے بہت پہلے کا ہے، بلکہ نہرو دور کا ترکہ ہے۔

یہ کہنا مکمل سچ نہیں ہوگا کہ پاکستان کا یہ سفارتی رویہ بھارت کے مقابلے میں کمزوری کا مظہر ہے اور یہ کہ کسی بھی طاقتور ملک کے مقابلے میں ایسا ہی ریاستی موقف اختیار کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں سمیت بہت سے لوگوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ پاکستانیوں نے بنگالی مسلمانوں پر اس قدر مظالم ڈھائے ہیں کہ اب بھارت کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی ان میں اخلاقی جرأت ہی نہیں ہے۔ پاکستانیوں کا اپنے بارے میں یہ احساسِ جرم بیرونی دنیا سے ان کے تعلقات پر بُری طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔

الزامات کا جائزہ

اب سوال یہ ہے کہ پاکستان اپنے دامن پر لگے ہوئے داغ کو کس طرح دھوئے؟ جواب آسان ہے۔ سب سے پہلے تو الزامات کا غیر جانبداری سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

پہلا الزام یہ ہے کہ پاکستانی فوج نے ۹ ماہ جاری رہنے والے کریک ڈاؤن میں ۳۰ لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ یہ کوئی جنگ نہیں تھی۔ اس میں ٹینک استعمال ہوئے نہ بمباری کی گئی۔ میزائل بھی نہیں برسائے گئے۔ مختلف مقامات پر جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ۳۰ لاکھ ہلاکتوں کا پروپیگنڈا مضحکہ خیز ہے مگر کسی نے اب تک اس الزام کا سامنا کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہیں کی۔

ڈھاکا سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار ''دی مارننگ سن'' کے ایڈیٹر انوار الاسلام بوبی پاکستان کے حمایتی نہیں تھے مگر انہیں بھی کہنا پڑا کہ ۹ ماہ میں ۳۰ لاکھ افراد کی ہلاکت یقینی بنانے کے لیے روزانہ گیارہ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑے گا۔ عوامی لیگ سوچ رہی تھی کہ وہ ایک دعویٰ کرے گی اور اُسے درست تسلیم کرلیا جائے گا۔ پارٹی نے ۳۰ لاکھ کے عدد کو پروپیگنڈے کا حصہ بنالیا ہے اور یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کہ اس بات کو وہ ثابت کس طرح کرے گی۔ ایران اور عراق نے جدید ترین ہتھیاروں سے دس سال جنگ لڑی مگر اُس میں بھی تیس لاکھ ہلاکتیں واقع نہیں ہوئیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ کا مجموعی جانی نقصان بھی تیس لاکھ ہلاکتوں کے ہدف تک نہ پہنچ سکا۔

عوامی لیگ کے چند رہنماؤں، کارکنوں اور فریڈم فائٹرز بھی یہ تعداد ہضم نہیں کرسکے اور اُنہوں نے ہلاکتوں کی تعداد کو دس لاکھ تک محدود کرنے کی کوشش کی۔ حمید الحق چوہدری نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ دس ہزار سے زیادہ لوگ ہلاک نہیں ہوسکتے تھے، اور یہ تعداد بھی مبالغہ آمیز ہے!

سقوطِ ڈھاکا کو آج (۱۹۹۴ء میں) ۲۳ سال گزر چکے ہیں مگر اب بھی اگر بنگلہ دیش میں گاؤں گاؤں سروے کیا جائے تو حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے دور میں اس نوعیت کا ایک سروے کیا گیا تھا مگر ابتدائی نتائج ''حوصلہ افزا'' نہ آنے کی وجہ سے یہ سروے ترک کردیا گیا۔

اگر پورے بنگلہ دیش میں نہ سہی تو محض چند اضلاع کا سروے کرنے سے بھی دودھ کا

دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا اور اس پروپیگنڈے کی قلعی کھل جائے گی کہ پاکستانی فوج نے ۳۰ لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

پاکستان اس جھوٹ کا پول کھول سکتا تھا اور اب بھی ایسا کر سکتا ہے۔ اگر پاکستان اقوام متحدہ میں زور دیتا تو ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بعد وسطی یا جنوبی امریکا کی ریاستوں پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن حقائق سامنے لے آتا۔ اگر عالمی برادری ایسا کوئی اقدام کرتی تو شیخ مجیب الرحمٰن کے لیے اس کا سامنا کرنا ممکن نہ ہوتا۔ وہ موقع ہاتھ سے جانے دیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے بعد آنے والی حکومتیں بھی ہلاکتوں سے متعلق پروپیگنڈا اسی لیے کرتی رہیں کہ پاکستان نے جواب دینے کے بارے میں سنجیدگی اختیار نہیں کی۔ یہی معاملہ تین لاکھ خواتین کی آبروریزی کے الزام کا بھی ہے۔ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ پاکستان اس سلسلے میں حقیقی اعداد و شمار اور دیگر حقائق کیوں پیش نہیں کر رہا؟

۱۹۷۱ء کی جنگ کس نے شروع کی؟

ایک منطقی اور جائز سوال یہ ہے کہ نو ماہ جاری رہنے والی یہ جنگ کس نے شروع کی؟ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو شروع کیے جانے والے کریک ڈاؤن کے دوران اہلکاروں سے زیادتیاں بھی ہوئیں اور ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی شب ایسے بہت سے عام شہری مارے گئے جن کا عوامی لیگ سے دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ پاکستانی فوج کا خیال تھا کہ اچانک سخت اقدام سے عوام میں شدید خوف پیدا ہوگا اور پاکستان کے خلاف تحریک کا ساتھ دینے والوں کی تعداد معقول حد تک گھٹ جائے گی۔ یہ سوچ بے بنیاد نکلی اور اس کریک ڈاؤن کا فائدہ عوامی لیگ کو پہنچ گیا۔ جن لوگوں نے ۱۹۷۰ء انتخابات سے مارچ ۱۹۷۱ء کے کریک ڈاؤن تک کے مختلف واقعات پر نظر رکھی ہوا نہیں اندازہ ہوگا کہ پاکستانی جرنیل کس طور دشمنوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ اصل میں تو عوامی لیگ نے جنوری ۱۹۷۱ء میں پُرتشدد تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں دسمبر میں ملک کے ٹوٹنے تک نوبت پہنچی۔

چند مشکل سوالات جن کا جواب تلاش کرنا ہے!

شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستان کا اگلا وزیر اعظم بنانے سے متعلق جنرل یحییٰ خان کے اعلان پر عمل کیوں نہیں کیا گیا؟ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں فیصلہ کن کامیابی حاصل کرنے کے بعد شیخ

مجیب الرحمٰن نے یہ اعلان کیوں کیا کہ وہ مذاکرات کے لیے پاکستان کے دارالحکومت نہیں جائیں گے؟ شیخ مجیب نے آئین کی تشکیل نو سے قبل ہی فوری طور پر اقتدار کی منتقلی پر کیوں زور دیا؟ کیا چند ماہ کے انتظار کو خانہ جنگی کا جواز بنایا جا سکتا تھا؟

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو پاکستانی فوج نے علیحدگی پسند تحریک کا زور توڑنے کے لیے متعلقین کو خوفزدہ کرنے کی غرض سے رات کے اندھیرے میں جو کارروائی کی اس میں سیکڑوں عام شہری کسی جواز کے بغیر مارے گئے اور اس پر کسی نے افسوس کا اظہار بھی نہیں کیا۔ مگر دوسری طرف پاکستان کی طرف سے کسی نے اب تک یہ بھی نہیں لکھا کہ خانہ جنگی فوجی ایکشن سے شروع نہیں ہوئی بلکہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے ساتھ ہی عوامی لیگ نے اُس خانہ جنگی کی ابتدا کر دی تھی جس کا واضح مقصد ملک سے علیحدگی اختیار کرنا تھا۔ پاکستان کی طرف سے خاموشی اختیار کیے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بھی دنیا کو باور کرایا جا رہا ہے کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کے دولخت ہونے پر منتج ہونے والے واقعات کا سلسلہ فوج کے بلااشتعال کریک ڈاؤن سے شروع ہوا تھا۔

بھارت کی کامیابی

۱۹۷۱ء کے سانحے کے حوالے سے جو کچھ بھی بیان کیا جا رہا ہے اُس پر پاکستان میں آنکھ بند کر کے یقین کر لینے کا رجحان بھارت کی بڑی سفارتی کامیابی ہے۔

کوئی بھی خانہ جنگی باضابطہ اعلان سے شروع نہیں ہوتی۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں نے (جن میں جنرل ضیاء الرحمٰن نمایاں تھے) آرمی کریک ڈاؤن کے جواب میں آزادی کے اعلان کا دعویٰ کیا تھا۔ اِس نوعیت کے اعلان سے صرف یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ فوج نے ریاست کی خودمختاری کے تحفظ کی خاطر اپنا فرض نبھایا۔ کوئی پارٹی لیڈر یا فوجی افسر قومی آزادی کا اعلان کرنے کا استحقاق نہیں رکھتا۔

کامیاب انقلاب کو باغیانہ حیثیت نہیں دی جاتی ہے مگر کوئی بھی انقلاب ماضی میں کی گئی معاہدات کو بھی علامات میں درست قرار نہیں دے پاتا۔

۱۹۷۱ء میں بھارتی فوج کے ہاتھوں پاکستانی فوج کی شکست، ملک کے ٹوٹنے اور ایک نئے ملک کے قائم ہونے پر منتج ہوئی اور اس اعتبار سے شیخ مجیب الرحمٰن اور اُن کے ساتھیوں

نے جو کچھ بھی کیا اُسے ''انقلاب'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود آزادی کے یکطرفہ اعلان کو بجائے خود جائز اور درست اقدام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

عوامی لیگ کی جنگ

شیخ مجیب الرحمٰن کی شاندار انتخابی فتح کے ساتھ ہی پاکستان کے خلاف پُرتشدد تحریک شروع کردی گئی تھی۔ اردو بولنے والوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اور پاکستان کی حمایت کرنے والے بنگالی مسلمانوں کو بھی، جہاں موقع ملا وہاں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ان کی املاک لوٹ لی گئیں، مکانوں اور دکانوں پر قبضہ کرلیا گیا۔ اس جانی اور مالی نقصان کا تخمینہ لگانے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی۔ مشرقی پاکستان میں شمالی بنگال اور ڈھاکا کے نواح سمیت جہاں بھی بہاری نمایاں تعداد میں تھے، اُنہیں منظم طریقے سے قتل کر دیا گیا۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے آرمی کریک ڈاؤن سے بہت پہلے عوامی لیگ کی جانب سے علیحدگی کی غیر علانیہ جنگ کا نقطۂ عروج ڈھاکا کے نواح میں کرمی ٹولہ کے مقام پر کنٹونمنٹ ایریا کا محاصرہ تھا۔ کریک ڈاؤن روکنے کی خاطر جنرل یحییٰ خان کی مذاکرات کی غرض سے ڈھاکا آمد سے ایک ہفتہ قبل تک کنٹونمنٹ میں رہنے والے فوجیوں اور ان کے اہل خانہ کو اشیائے خور و نوش کی فراہمی روک دی گئی۔ عوامی لیگ کے کارکنوں کی زبان پر ایک نعرہ تھا کہ ہم اُنہیں بھوکا رکھ کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں گے۔

اگر یہ سب جنگی اقدامات نہیں تھے تو جنگی اقدامات کی نئی تعریف و توضیح کرنا پڑے گی۔ یہ ویسا ہی محاصرہ تھا جیسا دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی فوجیوں نے جرمنوں کا یا جرمن فوجیوں نے برطانوی باشندوں اور فوجیوں کا کیا تھا۔

غیر حقیقت پسندانہ مذاکرات

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے آرمی کریک ڈاؤن سے قبل جنرل یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان غیر حقیقت پسندانہ مذاکرات کچھ اس انداز سے شروع ہوئے جیسے دو خود مختار ریاستیں معاملات طے کر رہی ہوں۔ عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے طلبہ مزید مذاکرات کے حق میں نہیں تھے۔ وہ تو ۳ مارچ ہی کو آزاد ریاست کا پرچم لہرا چکے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اُنہیں

جنرل یحییٰ خان کا ایک غیر ملکی مہمان کی حیثیت سے استقبال کرنے کے لیے آمادہ کر لیا تب ہی مذاکرات کے لیے گرین سگنل دیا جا سکا۔ ان حالات میں بھی جنرل یحییٰ خان کا مذاکرات پر آمادہ ہونا واقعی افسوسناک ہے۔ مشیروں نے اُنہیں واضح طور پر گمراہ کیا۔ جنرل یحییٰ خان نے شیخ مجیب کے تمام چھ کے چھ نکات تسلیم کر لیے۔ جس کا مطلب مشرقی پاکستان کو ایک آزاد ریاست میں تبدیل ہو جانا تھا۔ کیا سبب ہے کہ اس قدر رعایتیں دیے جانے پر بھی خون خرابہ روکنا ممکن نہ ہو سکا۔ طفیل احمد اور عوامی لیگ کے دیگر رہنماؤں نے بعد میں تسلیم کیا کہ قتل و غارت کو اس لیے روکا نہ جا سکا کہ عوامی لیگ اس قضیے کا کوئی پُرامن اور مذاکرات کی میز پر طے کیا جانے والا حل چاہتی ہی نہیں تھی۔ مذاکرات جتنے دن بھی جاری رہے، شیخ مجیب ہر روز ایک نئے مطالبے کے ساتھ جنرل یحییٰ خان سے ملے۔ ایسا کرنے کا بنیادی مقصد فوج کو زیادہ سے زیادہ پریشان اور بدحواس کرنا تھا۔ جنرل یحییٰ خان نے کس بات پر آمادگی ظاہر نہیں کی؟ بس فوج کی جانب سے ہتھیار ڈالنے اور روانگی کی تاریخ کے اعلان ہی کی کسر رہ گئی تھی! شیخ مجیب اور ان کے بھارتی آقا چاہتے تھے کہ قتل و غارت ہر حال میں ہو تا کہ نفرت کے بیج بو دیے جائیں اور مستقبل میں دونوں مسلم خطوں کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی راہ ہموار نہ ہو سکے۔ بھارت نواز بنگلہ دیشیوں اور بھارت کی کامیابی یہ ہے کہ جب بھی پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے کوئی تجویز سامنے آتی ہے، فوجیوں کے مظالم کی داستانیں ذہنوں کے پردوں پر گردش کرنے لگتی ہیں!

عدم مساوات کی حقیقت

عوامی لیگ کے سیاسی ترکش میں دوسرا سب سے اہم تیر یہ دعویٰ ہے کہ مغربی پاکستان کے حکمران مشرقی پاکستان سے برابری کا سلوک نہیں کرتے تھے اور بالخصوص معاشی معاملات میں مشرقی پاکستان کو ہمیشہ محرومی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ۱۹۹۴ء میں شائع ہونے والی کتاب ''ٹریجڈی آف ایررز: ایسٹ پاکستان کرائسز ۱۹۷۱ـ۱۹۶۸ء'' کے ذریعے لیفٹیننٹ جنرل (ر) کمال متین الدین ان چند ابتدائی پاکستانی مصنفین میں شامل ہو گئے جنہوں نے یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مغربی اور مشرقی پاکستان نے معاشی میدان میں برابری

کی بنیاد پر سفر شروع نہیں کیا تھا۔ اگر کمال متین الدین چاہتے تو لکھ سکتے تھے کہ قیامِ پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان ایک اُجڑی بستی سے مشابہ تھا۔ بہت سے انگریز افسران نے بھی اس کی گواہی دی تھی اور قیامِ پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان ۱۹۴۳ء کے قحط کے اثرات سے نمٹ رہا تھا۔ بنگال کے اس قحط نے ایک تہائی آبادی کو ختم کر دیا۔ ممکنہ طور پر یہ عدد شیخ مجیب کے ذہن میں رہ گیا ہوگا اب جب بھی بنگلہ دیش کی خانہ جنگی کے دوران مارے جانے والے اہلِ وطن کا ذکر کرنا ہوتو شیخ مجیب فوراً تیس لاکھ کا حوالہ دینے لگتے تھے۔

جس علاقے کو متحدہ بنگال کہا جاتا تھا، اس میں تمام بڑے کارخانے مغربی بنگال میں اور بالخصوص کلکتہ کے نواح میں تھے۔ مشرقی بنگال میں پیدا ہونے والی پٹ سن ۴۰ کارخانوں کا پیٹ بھرتی تھی مگر ان میں سے ایک بھی کارخانہ مشرقی بنگال میں نہیں تھا۔ انڈین سول سروس اور فوج میں بنگالی مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ صنعتی اور پس ماندہ اور علمی اعتبار سے بنگالی ہندوؤں سے ایک صدی پیچھے رہ جانے والے بنگالی مسلمان اپنے ذرائع سے ایک ہفتہ کے لیے بھی اپنی بقا یقینی بنانے کے اہل نہ تھے۔

پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کی کوتاہ نظری

پاکستان کے سیاست دان کوتاہ نظر بھی تھے اور حقائق بیان کرنے کے معاملے میں وہ زیادہ سنجیدہ بھی نہ تھے۔ اس لیے مشرقی پاکستان کی معاشی پس ماندگی میں مغربی پاکستان کا ہاتھ ہونے کے حوالے سے عائد کیے جانے والے الزامات کا ثبوتوں اور شواہد کے ساتھ توڑ نہیں کیا گیا۔ معاملہ یہیں تک نہیں رکھا گیا بلکہ انہوں نے مشرقی پاکستان کے گورنر کو یہ تک کہنے کی اجازت بھی دے دی کہ مشرقی پاکستان کی معاشی پسماندگی دراصل چوہدری محمد علی کی وزارتِ عظمیٰ کے دور کا حاصل ہے۔ صدر ایوب خان یہ سمجھتے رہے کہ اِس طرح اُن کے کاندھوں سے مشرقی پاکستان کی پس ماندگی کے الزام کا بوجھ اُتر جائے گا۔

حد یہ ہے کہ جب عوامی لیگ نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں اشیائے خورونوش اور دیگر ضروری سامان کی قیمتوں کا موازنہ کالم بنا کر شائع کیے جانے والے ایک اشتہار میں پیش کیا اور بے بنیاد اعداد و شمار پیش کیے تب بھی مرکزی حکومت نے کوئی اقدام نہ کیا۔ صورتِ حال کا سب سے

افسوسناک پہلو یہ ہے کہ پاکستانی حکومت نے ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بعد معاملات کی وضاحت کے لیے وائٹ پیپر شائع کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) کمال متین الدین جیسے مصنفین کا لہجہ معذرت خواہانہ ہے۔ ایسے مصنفین جو کچھ لکھ رہے ہیں، اُس سے سابق مشرقی پاکستان میں وہ لوگ شرمندگی محسوس کرتے ہیں جو حقائق سے باخبر ہیں۔

لسانی تحریک کی اصلیت

لیفٹیننٹ جنرل (ر) کمال متین الدین نے سابق مشرقی پاکستان میں چلائی جانے والی لسانی تحریک کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے وہ عوامی لیگ کے پروپیگنڈے کے زیرِاثر نصف سچائی پر مبنی ہے اور بدلے ہوئے حالات میں اُن لوگوں کے لیے یہ زیادہ سودمند ہے جو سیاسی مصلحت کو مقدم رکھتے ہوئے سیاسی پیش رفت اور تاریخ کو عوامی لیگ کے وژن کے مطابق بیان کرنا چاہتے ہوں۔

۱۹۷۱ء سے پہلے یا بعد میں مرکزی حکومت نے کسی بھی مرحلے پر اس حقیقت سے آشنا ہونے کا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جانب سے ہندوستان کی تقسیم کے اعلان کے بعد مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے لیے بنگالی کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کروانے کی بات محض ایک تجویز تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے دنوں میں یہ بات طے تھی کہ ہندی اگر ہندوؤں کی زبان ہے تو اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ بنگالی کا معاملہ شاید اس لیے اُٹھایا گیا کہ پاکستان کو جغرافیائی بُعد کے باعث دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور دوسرے حصے میں بنگالی مسلمان آباد تھے اور اس حصے کو آبادی کی بنیاد پر مغربی حصے پر معمولی سی برتری حاصل تھی۔

بنگالی زبان کو سیاسی ایشو میں تبدیل کرنے والے بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ معاملے کو خواہ مخواہ ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ پاکستان کی مرکزی حکومت کے لیے یہ کبھی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی بنگال کے تمام بنگالی بولنے والوں نے ہندی کے خلاف مل کر تحریک کیوں نہیں چلائی؟

عوامی لیگ مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) کو دوبارہ بھارت کا حصہ بنانے کی سوچ پر عمل کے لیے

کوشاں ہے۔ مگر وہ خود بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں بنگلہ دیش بھارت کا محض ایک صوبہ یا پھر گریٹر بنگال کا حصہ ہوگا اور اس میں سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندی ہی نافذ ہوگی۔ یہ تمام حقائق اُس پروپیگنڈے کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہیں جن کا مقصد بنگالیوں اور بنگالی زبان کو کچلنے سے متعلق نام نہاد اقدامات کے حوالے پاکستان کو بدنام کرنا ہے۔

کوئی اس حقیقت پر غور کرنے کی زحمت کیوں گوارا نہیں کرتا کہ بنگالی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی تحریک ستمبر ۱۹۴۷ء میں تمدن مجلس نے شروع کی تھی، یعنی ایک ایسے وقت کہ جب کسی کو پاکستان کی بقا سے ہٹ کر کسی بھی نکتے پر غور کرنے کی فرصت نہ تھی۔

۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک بنگال کی تاریخ میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہیں ملتی ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں نے بنگالی کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے پاکستان کے قیام کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ متحدہ بنگال میں بنگالی کو زبان کی حیثیت سے کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ اگر ۱۹۴۷ء سے قبل بنگالی مسلمانوں کے سیاسی ارتقا میں بنگالی زبان نے ثانوی نوعیت کا کردار بھی ادا کیا ہوتا تو پاکستان کے قیام کی تحریک کبھی شروع ہی نہ ہو پاتی۔

بنگال میں علیحدگی کی تحریک کو اس حقیقت سے ہوا ملی کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے طاقت کے ہر مآخذ پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو ہر سرکاری محکمے سے نکال باہر کیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں اے کے فضل الحق کی سربراہی میں قائم ہونے والی وزارت اس کا بیّن ثبوت ہے۔

ملک کے قیام کے فوراً بعد بنگالی کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے تحریک کا شروع کیا جانا خطرے کی گھنٹی سے کم نہ تھا اور پاکستان کے رہنماؤں کو اس کا پوری شِدّت سے احساس ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ نکتہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بنگالی کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے کومیلا سے پارلیمنٹ کے (کانگریسی) رکن دھیریندر ناتھ دتہ نے کیا تھا۔

بنگالی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ قرار دلانے کے مطالبے سے پیدا ہونے والی صورتحال کا سامنا درست طریقے سے نہیں کیا گیا۔ جن لوگوں نے لسانی تحریک کو کنٹرول کرنے یا دبانے کی کوشش کی وہ اس قدر دور اندیش نہیں تھے کہ اِس مسئلے کی تہہ میں چھپے بارود کے ڈھیر کو دیکھ یا محسوس کر سکتے۔

قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کے دوران زبان

کے مسئلے پر جو کچھ کہا وہ پالیسی میٹر تھا جس پر بعد میں آنے والوں کو سختی سے کاربند رہنا چاہیے تھا۔ جن لوگوں کی نظر میں پاکستان کی بقا اور استحکام ہر حال میں مقدم تھا، اُن کے لیے قائد اعظم کے الفاظ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو دل آزاری کا باعث بنتی۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) کمال متین الدین نے بھی بنگالی کو دوسری سرکاری زبان نہ بنانے پر قائد اعظم کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

اعتراف جُرم غلط تھا!

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان عدم مساوات، لسانی تحریک یا سول سروس میں برابری کی بنیاد پر نمائندگی کے نہ ہونے سے متعلق پروپیگنڈے کو تسلیم کرنے کا مفہوم اِس کے سوا کچھ نہیں کہ عوامی لیگ نے ۱۹۷۱ء میں جو کچھ کیا وہ درست تھا۔ بنگلہ دیش کے قیام کو ۲۳ سال ہو چکے ہیں مگر اب بھی بنگلہ دیشی، بھارتی، برطانوی اور امریکی میڈیا میں پاکستان ہی کو ہر معاملے میں ذمہ دار قرار دینے کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ الزامات پاکستان کے گلے کا طوق ہو کر رہ گئے ہیں۔ جس طرح کوئی کینسر جسم کو اندر ہی اندر، چپکے چپکے گلاتا سڑاتا رہتا ہے، بالکل اِسی طرح ان الزامات نے بھی پاکستان کو اندر ہی اندر بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بنگلہ دیش اور پاکستان کی نئی نسل حقائق جانتی نہیں۔ اُس کی نظر میں یہ الزامات مقدس عقائد کا درجہ اختیار کر گئے ہیں جنہیں کسی بھی حالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

جب بھی مصالحت اور مفاہمت کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے تو اِس نکتے کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ معاملات کو آگے بڑھانے کے لیے ناگزیر ہے کہ پاکستان الزامات کا جواب دے اور اپنے دامن پر لگے تمام داغ دھو ڈالے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۷۴ء میں صدر کی حیثیت سے ڈھاکا کا دورہ کیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے ملاقات کے دوران مطالبہ کیا کہ بنگلہ دیش کے قیام کی تحریک کے دوران جو مظالم ڈھائے گئے، ان کا معاوضہ ادا کیا جائے۔ بھٹو نے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ شیخ مجیب نے مطالبے پر زور نہیں دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کمیٹی بنگلہ دیش میں بنے یا پاکستان میں، اثاثوں اور واجبات کا تقابل کرنے کی صورت میں سابق مشرقی پاکستان پر واجب الادا رقم زیادہ نکلے گی اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

گزشتہ ۲۳ سال کی تاریخ

پاکستان سے الگ ہونے کے بعد بنگلہ دیش میں گزشتہ ۲۳ سال کے دوران (۱۹۹۴ء تک) بیرون ملک سے کم وبیش ۲۵ ارب ڈالر لائے گئے ہیں۔ بنگلہ دیش کے قدرتی وسائل پر اب مغربی پاکستان کے لوگوں سمیت کسی کی بھی اجارہ داری نہیں مگر اس کے باوجود اب تک نہ صرف یہ کہ عوام کا معیارِ زندگی بلند نہیں کیا جا سکا ہے بلکہ معاشی حالت دن بہ دن بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اور بھارت کا عمل دخل ہر معاملے میں بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ دریائے گنگا کے پانی پر بھارت اپنا حق جتانے کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کرتا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش کے شمالی اضلاع پانی کی شدید قلت سے دوچار ہیں اور بہت حد تک صحرا کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ اس ایک حقیقت سے پاکستان کے حکمراں طبقے کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ اس پر عائد کیے جانے والے الزامات کس قدر بے حقیقت ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناانصافیاں بھی ہوئیں، حق تلفی بھی کی گئی، مگر یہ بات سمجھنے کی ہے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے میں معاشی استحصال نے مرکزی کردار ادا نہیں کیا بلکہ اس کی پشت پر دراصل وہ سازشیں کارفرما تھیں جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد منظرِ عام پر آنے لگی تھیں اور اس معاملے میں مشرقی پاکستان کے وطن دشمن عناصر نے مرکزی کردار ادا کیا۔

بھارت کے حقیقی عزائم

مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کرنے کی سازش کا بنیادی مقصد برصغیر کے مشرقی حصے سے اسلام کو ختم کرنا تھا۔ ۱۹۷۲ء کے بعد سے بنگلہ دیش میں قائم ہونے والی حکومتوں نے ایسی پالیسیاں تواتر سے اپنائی ہیں جن کے نتیجے میں سیکولر نظریات پر یقین رکھنے والی ایک ایسی نئی نسل تیار ہوئی ہے جو اسلام کا نام سنتے ہی بدکنے لگتی ہے۔ سیکولر ذہن رکھنے والے یہ لوگ دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ ملک کا اسلامی ماضی دراصل ایک تاریک اور سفاک دور تھا۔

گزشتہ پانچ برسوں کے دوران بنگلہ دیش میں اسلامی اور سیکولر عناصر کے درمیان جنگ چھڑ چکی ہے۔ تسلیمہ نسرین کے کیس سے بہت کچھ واضح ہو چکا ہے۔ حکومتی سرپرستی ہی کے نتیجے میں تسلیمہ نسرین میں اتنی ہمت پیدا ہوئی کہ قرآن کی توہین کر سکے۔ حکومت نے اسے نہ صرف

تحفظ فراہم کیا بلکہ بحفاظت سویڈن پہنچانے کا اہتمام بھی کیا۔ یہ سب کچھ اس قدر واضح ہے کہ اب کسی کے ذہن میں کچھ شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارا کیا کچھ داؤ پر لگ گیا ہے۔

پاکستان نے اب تک اپنے اوپر عائد کیے جانے والے الزامات کو خاموشی سے تسلیم کیا ہے۔ اس نے بنگلہ دیش کے معاملات میں دلچسپی نہیں لی اور ان لوگوں کی بھی کچھ خبر نہیں لی جنھوں نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بننے سے روکنے کی اپنی سی کوشش کی۔ یہ سب کچھ خود پاکستان کے خلاف جارہا ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام سے متعلق سخت اور تلخ سوالات کا سامنا کرنے اور ان کا جواب دینے تک پاکستان عالمی برادری میں، پوری عزتِ نفس کے ساتھ، سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں ہوسکتا۔

پاکستان کی ذمہ داری

اگر پاکستان سفارتی سطح پر اپنے لیے بہتر مقام اور اسلامی و مغربی دنیا کی نظروں میں بلند ہوکر جینے کا خواہش مند ہے تو اسے سقوطِ مشرقی پاکستان کے حقیقی اسباب، لسانی تحریک کی اصل، معاشی استحصال اور ۱۹۷۱ء میں رونما ہونے والی ہلاکتوں کا جائزہ لینے کے لیے غیر جانبدار تحقیقات کرانا ہوں گی۔

اگر ۷۱-۱۹۷۰ء کی صورت حال کا سامنا کرنے والی نسل کے آخری لوگ بھی مر گئے تو پاکستان کی طرف سے اٹھایا جانے والا کوئی بھی اقدام بے وقت ہوگا۔ اس معاملے میں لیت و لعل سے کام لینا خود پاکستان کے وجود، بھارت میں آباد مسلمانوں اور بنگلہ دیش کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوگا۔ اگر دیگر مسائل کو حل کیے بغیر زندہ رہنے کی روش اپنائی جاتی رہی تو کشمیر کا مسئلہ صدیوں میں بھی حل نہ ہوگا۔

مرکزی اور بنیادی مسئلہ

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کیا پاکستان، بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم اور خطے کو ایک بار ''اکھنڈ بھارت'' میں تبدیل کرنے کی خواہش کے عملی مظہر کے طور پر اپنائی جانے والی جارحیت کو ناکام بنانے کے لیے موجودہ مسائل کو احسن طریقے سے حل کرنے کا خواہش مند ہے؟ اس سوال کا جواب اب تک نفی میں ہے۔

کیا پاکستان اس حقیقت سے باخبر نہیں کہ بھارت خود کو علاقائی سپر پاور سمجھتا ہے اور مغربی

طاقتیں اپنے اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے اس تصور کو ہوا دے رہی ہیں؟ کیا پاکستان اس بات سے باخبر نہیں کہ بھارت میں اب بہت سے دانشور اور سیاسی تجزیہ کار اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اگر گاندھی جی اور پنڈت جواہر لعل نہرو نے ۱۹۴۶ء کے کیبنٹ مشن کی تجاویز مسترد نہ کی ہوتیں تو پاکستان کے قیام کی نوبت نہ آتی اور احسن طریقے سے ملک آزاد ہو جاتا اور برطانوی راج کے ختم ہونے پر جو خون خرابہ ہوا اس کی پوری ذمہ داری صرف محمد علی جناح کے کاندھوں پر نہ ڈال دی جاتی؟ ۱۹۸۸ء میں بھارت کے سینئر صحافی اور دانشور وی پی کلکرنی نے اپنی کتاب ''پاکستان: اِنز اوریجن اینڈ ریلیشن وِد انڈیا'' میں بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ جس قدر جلد اپنی آزادی کو بھول جائیں، اتنا ہی ان کے لیے اچھا ہے اور ان کی مکمل بھلائی اسی میں ہے کہ بھارت کا حصہ بن جائیں۔ لیفٹیننٹ جنرل متین الدین نے ملک کے دولخت ہونے کے حوالے سے لکھتے وقت جو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا ہے اس سے وی پی کلکرنی جیسے لوگوں کی پوزیشن مزید مستحکم ہو جاتی ہے۔

ماضی کا بوجھ، دورِ حاضر کے حالات و واقعات کا دباؤ، عالمی سیاست کے داؤ پیچ اور مختلف ثقافتوں کے باہمی تعامل سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں پاکستان پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہیں گی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جہاں سے ابتدا ہوتی ہے وہیں سے انتہا بھی طے ہو جاتی ہے۔

دوسری جانب بنگلہ دیش بھی خود کو قدرے لاچار محسوس کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک عفریت ہے جو رفتہ رفتہ اس پر حاوی اور متصرف ہوتا جا رہا ہے۔ بنگلہ دیش مشرق اور مغرب میں مسلم دنیا سے کٹا ہوا ہے۔ اسے بھارت نے حصار میں لے رکھا ہے۔ معاشی اور عسکری اعتبار سے وہ بھارت سے نظر ملانے کے قابل نہیں۔ ایسے میں اسے پاکستان سے تعلقات ختم کرنے کی صورت میں سرزد ہونے والی اپنی بھیانک سیاسی غلطی کا بھی شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ جن معاملات کو بڑی آسانی سے طے کیا جا سکتا تھا، انہیں اپنے ہی مسلم بھائیوں کے خلاف جنگ کے لیے جواز کے طور پر پیش کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ جن لوگوں نے بھارت کی سرزمین کو چھوڑ کر مشرقی پاکستان کو اپنا مسکن بنایا تھا، انہیں بھارت کی ایما پر نفرت کی نظر سے دیکھنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ پاکستان میں مشرقی پاکستان آبادی کے اعتبار سے مستحکم تھا، اس لیے

ملک کے تمام معاملات میں اپنا کردار عمدگی سے ادا کرنے کی پوزیشن میں تھا مگر اس کے بجائے مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں نے مجبور اقلیت کی سی حیثیت اختیار کر کے حقوق مانگنے کا سلسلہ شروع کیا اور جب توقعات کے مطابق کچھ نہیں ملتا تھا تو استحصال کا راگ الاپا جاتا تھا۔ بسنت چیٹر جی نے ۱۹۷۲ء میں اپنی کتاب ''انسائڈ بنگلہ دیش ٹوڈے'' میں لکھا ہے کہ اگر بنگلہ دیش کے لوگ ثقافتی طور پر مضبوط ہونا اور کلکتہ کے حصار سے نکلنا چاہتے ہیں تو انہیں اردو کو اپنے مرکزی علمی و ثقافتی مآخذ کے طور پر اپنانا ہوگا اور اس کا سبب انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ بنگالی مسلمانوں نے بنگالی زبان میں ایسا سرمایہ تخلیق نہیں کیا ہے جو انہیں ثقافتی طور پر آزاد اور مستحکم کر سکے۔

معاملہ صرف ثقافت تک محدود نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ بنگلہ دیش خود کو سیاسی طور پر کس طور آزاد رکھ سکے گا؟ محلِ وقوع کی بنیاد پر بنگلہ دیش اتنا اہم نہیں کہ چین یا امریکا اس کی حفاظت کا ذمہ لے۔ بھارت اپنی آبادی اور تنوع کے اعتبار سے ہر بڑے ملک کے لیے بڑی مارکیٹ کا درجہ رکھتا ہے۔ کل کو اگر معاملہ معاشی مفادات کا آیا تو اپنے مفادات کی خاطر بڑی طاقتیں بھارت کی جانب سے بنگلہ دیش کو ہتھیانے کے عمل سے بھی چشم پوشی اختیار کریں گی۔ زبانی کلامی تو چند باتیں ہوں گی اور تھوڑا بہت رسمی سا احتجاج بھی ہوگا مگر اس بات کی توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ چین یا امریکا کسی بھی طور بھارت جیسے معاشی طور پر مستحکم ملک کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لیں گے۔ اگر آزاد بنگلہ دیش تقریباً ربع صدی تک قائم رہا ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُسے اپنے میں شامل کرنے کی بھارت کو کوئی جلدی نہیں۔ بنگلہ دیش کو بھارت اسی وقت اپنا حصہ بنائے گا جب اسے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ یہ معاملہ کوئی خاص ردعمل پیدا نہیں کرے گا اور سیاسی و سفارتی سطح پر کوئی خطرناک نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دولخت ہونے اور بنگلہ دیش کے قیام کے سانحے کے فوراً بعد بھارت نے ایسے حالات پیدا کرنا شروع کر دیے جن سے گھبرا کر بنگلہ دیش کے لوگ انتشاری قوتوں سے بچنے اور ۱۹۷۱ء میں لوٹ مار شروع کرنے والے عناصر سے تحفظ کے لیے، مکمل معاشی تباہی سے بچنے کی خاطر بھارتی حکومت سے مدد طلب کرنے پر مجبور ہوں۔

اگر بنگلہ دیش کے لوگوں کو مکمل لاقانونیت، عدم تحفظ اور معاشی تباہی سے بچنے کے لیے

بھارت سے الحاق کا آپشن دیا جائے تو وہ اس آپشن کو قبول کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ بنگلہ دیش کے وطن دشمن عناصر نے، جن کی طاقت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے، بھارت سے الحاق کے حق میں پروپیگنڈا تیز کر دیا ہے۔

بعض تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیش کا بھارت سے شاید الحاق ہو جائے۔ جو سوال پاکستان کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ کیا ایسی صورت میں برصغیر میں کوئی بڑی سیاسی اور سفارتی تبدیلی رونما ہوگی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سیاسی اور سفارتی سطح پر غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ طاقت کا توازن بھارت کے حق میں اس حد تک ہو جائے گا کہ وہ پوری جرأت کے ساتھ زندہ رہنے کے پاکستان کے استحقاق کو بھی چیلنج کرنے لگے گا۔ یہ بات کسی بھی مرحلے پر فراموش نہیں کی جانی چاہیے کہ بھارت نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کو کسی بھی سطح پر قبول نہیں کیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کر کے بنگلہ دیش میں تبدیل کرنا دراصل ۱۹۴۷ء کی تقسیم کو غیر موثر بنانے کے عمل کا پہلا مرحلہ تھا۔

کمزور حیثیت کا حامل آزاد بنگلہ دیش بھی بھارت کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہے گا اور کسی طور قابلِ برداشت نہیں۔ بنگلہ دیش کو راہ سے ہٹانے کے بعد بھارت نسبتاً طاقتور حریف پاکستان سے نمٹنے کے قابل ہو سکے گا۔

پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان بہتر دوستانہ روابط اور ان سے بھی بڑھ کر مصالحت ہی دونوں ممالک کی آزادی اور بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، وہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں یا پھر وطن سے محبت نہیں کرتے۔ ہر اعتبار سے انتہا بھی وہیں متعین ہوتی ہے جہاں سے آپ ابتدا کرتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۹۴ء (ایک ذاتی بیان)

کچھ مصنف کے بارے میں

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین کا تعلق معروف صوفی شاہ علی بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے خانوادے سے ہے۔ حضرت شاہ علی بغدادی کا مزار ڈھاکا کے نواحی علاقے میرپور میں مرجع خلائق ہے۔ سید سجاد حسین ۱۴ر جنوری ۱۹۲۰ء کو ضلع ماگورہ کے علاقے الوک دیا میں پیدا ہوئے۔

سید سجاد حسین چار سال کے تھے کہ ان کے والدین ضلع ڈھاکا میں آ بسے۔ انہوں نے ثانوی تعلیم ڈھاکا ہائی مدرسہ میں حاصل کی اور ۱۹۴۱ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے انگلش میں آنرز کیا۔ اگلے ہی سال انہوں نے فرسٹ کلاس کے ساتھ انگلش میں ایم اے کیا۔

قائداعظم نے ۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں ڈھاکا کا دورہ کیا تو سید سجاد حسین کو پہلی بار انہیں سننے کا موقع ملا اور انہوں نے قائد کے دلائل سے متاثر ہو کر مسلم قوم پرستی کے کاز سے وابستہ ہونے کا ذہن بنالیا۔ سید سجاد حسین نے ۱۹۴۱ء میں کلکتہ کے اخبار ''دی اسٹیٹس مین'' میں ایک خط لکھ کر قیامِ پاکستان کی حمایت کرنے والے اولین لوگوں میں اپنا نام لکھوالیا۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ نے ۱۹۴۲ء میں سید سجاد حسین کی قیادت میں ''دی ایسٹ پاکستان لٹریری سوسائٹی'' قائم کی جس کا بنیادی مقصد نظریۂ پاکستان کی اشاعت تھا۔ سوسائٹی نے ۱۹۴۳ء میں ایک کانفرنس منعقد کی جو خاصی کامیاب رہی۔ تب تک بنگلہ زبان میں ایک پندرہ روزہ جاری کیا جاچکا تھا جس کا نام ''پاکستان'' تھا۔ سید سجاد حسین اس پندرہ روزہ جریدے کے مستقل لکھاری تھے۔ جریدہ ''پاکستان'' کے بانی اور ایڈیٹر نذیر احمد تھے جنہیں ۳۱ جنوری ۱۹۴۳ء کو ہندو غنڈوں نے ڈھاکا یونیورسٹی کی حدود میں شہید کر دیا تھا۔ وہ پاکستان کے اولین شہید تھے۔

سید سجاد حسین اور ان کے ساتھیوں نے ۱۹۴۳ء میں نذیر احمد کی یاد میں ایک ضخیم مجلہ شائع کیا جو ناپختگی کے باوجود ۱۹۴۰ء کے عشرے کے مسلم طلبہ کے آئیڈیل ازم کی اچھی جھلک پیش کرتا ہے۔

۱۹۴۴ء میں صرف ۲۴ سال کی عمر میں سید سجاد حسین کو کلکتہ میں منعقد ہونے والی ایسٹ پاکستان رینا ساں کانفرنس کی صدارت کی دعوت ملی۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں سید سجاد حسین کلکتہ کے اسلامیہ کالج میں انگلش کے لیکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انھی دنوں روزنامہ ''آزاد'' کے ایڈیٹر ابوالکلام شمس الدین نے سید سجاد حسین کو مستقل بنیاد پر اداریے لکھنے کی دعوت دی۔ روزنامہ ''آزاد'' کے لیے فری لانسر کی حیثیت سے کام کرنے کے ساتھ ساتھ سید سجاد حسین نے ''اسٹار آف انڈیا'' اور ''مارننگ نیوز'' میں مسلم قوم پرستی کے حوالے سے مضامین تحریر کیے اور ''کامریڈ'' میں بھی اداریہ لکھتے رہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد سید سجاد حسین کو کلکتہ کے اسلامیہ کالج سے سلہٹ ایم سی کالج بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے ایک سال (ستمبر ۱۹۴۷ء تا ستمبر ۱۹۴۸ء) گزارا۔

۱۹۴۸ء کے آخری دنوں میں سید سجاد حسین نے ڈھاکا یونیورسٹی میں انگلش کے لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت حاصل کی اور ۱۹۶۲ء میں پروفیسر بنا دیے گئے۔

ڈاکٹر سید سجاد حسین نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک انگلینڈ کی ناٹنگھم یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے دو سال گزارے۔ انہوں نے رڈیارڈ کپلنگ اور بھارت کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔ رچرڈ چرچل کی ادارت میں شائع ہونے والی کنسائز کیمبرج ہسٹری آف انگلش لٹریچر میں سید سجاد حسین کی تحقیق کو کپلنگ کے حوالے سے مستند کاوش تسلیم کیا گیا ہے۔

۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر سید سجاد حسین کو راج شاہی یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا اور ۱۹۷۱ء میں، بحران کے نقطۂ عروج کے زمانے میں، ان سے کہا گیا کہ مادرِ علمی کا چارج سنبھالیں۔ لاتعداد دھمکیاں ملنے پر بھی ڈاکٹر سید سجاد حسین نے یہ موقف ترک نہیں کیا کہ پاکستان کی شکست دریخت مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے لیے صرف تباہی کا پیغام لائے گی۔

سقوطِ ڈھاکا کے تین دن بعد، ۱۹ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو، عوامی لیگ کے غنڈوں نے سید سجاد حسین کو اغوا کر کے سفا کی کے ساتھ تشدد کا نشانہ بنایا اور مردہ سمجھ کر ایک سڑک پر پھینک گئے۔ ظالموں نے ریڑھ کی ہڈی پر وار کر کے انہیں ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی مگر ایک انچ کے فرق سے وہ بچ گئے۔ ان کی ''موت'' کو زیادہ اذیت ناک بنانے کے لیے انہیں خنجر سے چند زخم بھی لگائے گئے۔

ہوش میں آنے پر سید سجاد حسین نے کمر سے نیچے کے دھڑ کو مفلوج پایا۔ ایک راہ گیر انہیں اٹھا کر گھر لایا اور بھارتی فوج کے احکام کے تحت انہیں علاج کے لیے ڈھاکا میڈیکل کالج اسپتال میں داخل کیا گیا۔ جنوری ۱۹۷۲ء کے وسط میں وہ اس قابل ہو سکے کہ چھڑی کی مدد سے کسی نہ کسی طور چل سکیں۔

۳۰ جنوری کو انہیں پاک فوج سے اشتراک کے الزام میں جیل میں ڈال دیا گیا اور ۵ دسمبر ۱۹۷۳ء کو عام معافی کے تحت رہائی ملی۔ اسیری کے دوران انہیں یونیورسٹی سے باضابطہ طور پر فارغ کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں انہیں کلیئر ہال، کیمبرج یونیورسٹی کا فیلو مقرر کیا گیا جبکہ وہ ام القریٰ یونیورسٹی مکہ معظمہ میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے تعیناتی کی راہ تک رہے تھے۔

سید سجاد حسین کی ٹانگوں کو جو زخم لگے تھے، وہ مکمل طور پر کبھی مندمل نہ ہو سکے۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں ۱۹۸۵ء کے بعد سے تکلیف بڑھ گئی۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے علالت کے باعث ام القریٰ یونیورسٹی سے استعفیٰ دے دیا اور مستقل طور پر وطن واپس آ گئے۔

سید سجاد حسین نے یورپ اور ایشیا کے کئی ممالک کے علاوہ امریکا کے بھی دورے کیے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ لیڈر شپ گرانٹ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا گئے۔ ۱۹۷۰ء میں وہ انقلاب کی سالگرہ سے متعلق تقریبات میں شرکت کے لیے پاکستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے چین گئے۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے جاپان میں ایک مذہبی کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ وہ دو مرتبہ ایران گئے، ۱۹۷۰ء میں آر سی ڈی ٹیم کے لیڈر کی حیثیت سے اور ۱۹۷۱ء میں بادشاہ کی تاج پوشی کی سالگرہ کے موقع پر۔ ۱۹۵۴ء میں طلبہ کے ایک گروپ کے قائد کی حیثیت سے برما

(میانمار) گئے۔۱۹۶۲ء میں دولتِ مشترکہ کی تعلیمی کانفرنس میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے بھارت گئے۔PEN کی کانفرنس میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے انہوں نے فلپائن کا دورہ کیا۔۱۹۷۷ء میں پولینڈ کے شہر پوزنیاک میں انگریزی کے پروفیسروں کی کانفرنس میں شرکت کی۔۱۹۷۷ء میں مکہ معظمہ میں منعقدہ تعلیمی کانفرنس میں شرکت کی۔

سید سجاد حسین ڈھاکا میں ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان کے بانیوں میں سے تھے اور سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔۱۹۵۴ء میں ہالینڈ میں منعقدہ PEN کانفرنس میں شرکت کے بعد سید سجاد حسین نے ۱۹۵۵ء میں ڈھاکا میں PEN کانفرنس کے انعقاد میں مرکزی کردار ادا کیا۔سید سجاد حسین نے فرانس، بلجیم، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے بھی دورے کیے۔

سید سجاد حسین کی تصانیف درج ذیل ہیں:

- Kipling and India
- Mixed Grill (Collection of Essays)
- Dacca University Seminars on Contemporary Bengali Literature, ed
- Homage to Shakespeare, ed
- Crisis in Muslim Education (Joint Author)
- A Young Muslim's Guide to Religions in the World
- Islam in Bengali Verse
- Civilization and Society
- Descriptive Catalogue of Bengali Manuscripts
- Annotated Anthology of English Poetry for Arab Students
- A Guide to Literary Criticism

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین کی دیگر علمی کاوشیں:

- انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بنگلہ دیش پر مضامین بھی تحریر کیے۔
- امریکا میں منعقد ہونے والی دولتِ مشترکہ ''پین'' کانفرنس میں پاکستانی ادب پر انگریزی میں ایک باب قلم بند کیا۔
- ''ایسٹ پاکستان'' کے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر سید سجاد حسین نے ڈھاکا کے انگریزی اور بنگالی اخبارات میں

باقاعدگی سے مضامین تحریر کیے اور لیسٹر (برطانیہ) سے شائع ہونے والے جریدے مسلم ورلڈ بک ریویو میں کتابوں پر تبصرے بھی قلم بند کرتے رہے۔

۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء کے دوران ڈاکٹر سید سجاد حسین نے سقوطِ ڈھاکا کے سانحے کے اسباب وعلل کے حوالے سے کتابیں اور کتابچے لکھنے میں ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کی غیر علانیہ معاونت کی۔ اس حوالے سے پانچ کاوشیں اہم ہیں:

- Bangladesh Today: A Lament and an Indictment
- Second Thoughts on Bangladesh
- Iron Bars of Freedom
- Two Dialogues ala Plato on the Hindu-Muslim Problem
- The Role of India and Big Powers in the East Pakistan Crisis of 1971

- اسیری کے دوران مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور حالات وواقعات کے حوالے سے یادداشتیں "The Wastes of Time" کے عنوان سے لکھیں۔ اسی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ''شکستِ آرزو'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
- بنگالی زبان میں یادداشتیں ۱۹۹۳ء میں ڈھاکا سے شائع ہوئیں۔

۱۲/جنوری ۱۹۹۵ء کو انتقال کے وقت ڈاکٹر سید سجاد حسین حضور نبی کریمؐ کی سیرت پر کتاب لکھ رہے تھے۔

شیخ مجیب الرحمٰن (عوامی لیگ) کے مشہورِ عالم چھ نکات

فروری ۱۹۶۶ء میں عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمٰن نے لاہور میں پریس کے سامنے اپنے مشہور ۶ نکات پیش کیے تھے۔ بعد میں عوامی لیگ نے اِن نکات میں متعدد تبدیلیاں کر کے اُنھیں اپنا بنیادی مطالبہ اور ۱۹۷۰ء کے انتخابی منشور کا مرکزی حصہ بنا لیا۔ ذیل میں اُنھی ترمیم شدہ ۶ نکات کا اردو ترجمہ درج کیا جارہا ہے:

۱۔ حکومت کی نوعیت وفاقی اور پارلیمانی ہوگی جس میں وفاقی مقننہ اور وفاق کو تشکیل دینے والے یونٹوں کی مقننہ ہمہ گیر بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کی جائے گی۔ وفاقی مقننہ میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہوگی۔

۲۔ وفاقی حکومت صرف دفاع اور خارجہ امور کی ذمہ دار ہوگی اور کرنسی کے بارے میں ان امور کی ذمہ دار ہوگی جن کی تشریح ذیل میں نکتہ نمبر ۳ میں کی گئی ہے۔

۳۔ دو علیحدہ کرنسیاں ہوں گی، جو ملک کے دونوں حصوں کے درمیان ہر حصے کے لیے آسانی سے قابلِ تبدیل ہوں گی یا اس کے متبادل کے طور پر ایک کرنسی ہوسکتی ہے، جس کے لیے وفاقی محفوظ نظام قائم کیا جائے گا، جس میں علاقائی وفاقی محفوظ بینک ہوں گے جو ایسے اقدامات تجویز کریں گے جو ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں وسائل کی منتقلی اور سرمائے کے بہاؤ کو روکیں۔

۴۔ مالیاتی پالیسی تشکیل دینا وفاقی وحدتوں کی ذمہ داری ہوگی۔ وفاقی حکومت کو دفاع اور خارجہ معاملات پر ضروری اخراجات کے لیے مطلوبہ ذرائع آمدنی مہیا کیے جائیں گے۔

۵۔ آئین میں ایسی دفعات شامل کی جائیں گی جن کے تحت وفاقی وحدتوں میں سے ہر ایک وحدت اپنا علیحدہ زرمبادلہ کا اکاؤنٹ قائم کر سکے گی اور یہ متعلقہ وحدت کی حکومت کے کنٹرول میں ہو گا۔ وفاقی حکومت کے اخراجات وفاقی وحدتوں کی حکومتیں مہیا کریں گی جس کی شرح آئین میں دیے گئے طریقۂ کار کے تحت متعین کی جائے گی۔ علاقائی حکومتوں کو آئین کے تحت اختیار حاصل ہوگا کہ ملک کی خارجہ پالیسی کے مطابق جو کہ وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہوگی، وہ دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت اور امداد کے معاہدات طے کرسکیں۔

۶۔ وفاقی وحدتوں کی حکومتوں کو ملیشیا یا پیراملٹری فوج قائم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا تاکہ وہ قومی سلامتی کی موثر طور پر حفاظت کرسکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین (۱۹۲۰ء-۱۹۹۵ء)

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین، سقوطِ مشرقی پاکستان (۱۶، دسمبر ۱۹۷۱ء) سے پہلے، مرحوم مشرقی پاکستان کی معروف ترین ڈھاکا یونیورسٹی کے آخری وائس چانسلر تھے۔ انگریزی ادب کے ممتاز استاد اور فلسفۂ تاریخ کے ماہر، پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین ضلع ماگورہ (موجودہ بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئے۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے انگریزی میں ماسٹرز کیا اور ناٹنگھم یونیورسٹی (برطانیہ) سے انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کی۔

قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت سے متاثر ہو کر تحریکِ آزادی کے قافلے کا حصہ بنے۔ قیامِ پاکستان کی حمایت کرنے والے اوّلین بنگالی نوجوانوں میں شامل ہوئے۔ بنگلہ زبان میں ''پاکستان'' کے نام سے پندرہ روزہ جریدہ جاری کیا۔ روزنامہ ''آزاد'' کے اداریہ نویس رہے۔ ''اسٹار آف انڈیا'' اور ''مارننگ نیوز'' میں نظریۂ پاکستان کے حق میں مضامین تحریر کیے۔ ''کامریڈ'' کے اداریے بھی لکھتے رہے۔

۱۹۴۴ء میں اسلامیہ کالج، کلکتہ میں انگلش کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ ساری زندگی درس و تدریس میں صَرف کردی۔ راجشاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان سے چند ماہ قبل ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور سقوطِ ڈھاکا تک اسی منصب پر فائز رہے۔ بعد میں اِس ''جرم'' کی پاداش میں وہ سزائیں بھگتیں جن کا تذکرہ اِس کتاب میں بھی موجود ہے۔ دو سال جیل کاٹ کر رہا ہوئے۔ سعودی عرب کی اُم القریٰ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور کلیر ہال، کیمبرج کے فیلو رہے۔ مرحوم نے پانچ کتابیں تحریر کیں۔ ایک کا ترجمہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

"THE WASTES OF TIME" (اردو ترجمہ: شکستِ آرزو) ملتِ اسلامیہ جنوبی ایشیا کے خوابوں اور اُمیدوں کے مرکز۔۔۔ پاکستان۔۔۔ کی محبت میں گرفتار، ایک عاشقِ زار کی سوچ، طرزِ فکر، تجربات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کا بڑا حسین، لیکن دل گداز مرقع ہے۔ جنوبی ایشیا کی ملتِ اسلامیہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔

ڈی-۳۵، بلاک-۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱-۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱-۹۲)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk